مقالاتِ شامِ ہمدرد

جلدِ اوّل

۶۳—۱۹۶۴ شمسی

مُرتّبہ

حکیم مُحمّد سعید

مکتبہ جدید ○ لاہور

طباعت اوّل ----- ۱۹۶۹ شمسی

طابع وناشر ----- رشید احمد چودھری
مکتبہ جدید پریس
۴ شارع فاطمہ جناح لاہور

کلماتِ ابتدائیہ

نامُساعدتِ حالات کی وجہ سے بہت سی اقدار میں پژمُردگی محسوس کی جارہی ہے اور بہت سی اقدار بدل کروہ ہوتی جارہی ہیں کہ جن کا تعلق اسلام اور اسلامی طرزِ زندگی سے بڑی حد تک باقی نہیں رہا ہے۔ معاشرہ اُن حالات سے متاثر ہے جو آج مغرب کا طرۂ امتیاز ہیں، مگر خود مغرب کی بے بس متانت ان پر انگشت بدنداں ہے۔ یہ بات بڑی تفصیل کی محتاج ہے کہ اسلامی اقدار کیوں اور کیسے گہن میں آگئیں، مگر اس کے خطرات بہت ہیں۔ اگر پاکستان میں اِسلام کا پوری طرح تحفّظ نہ ہوسکا تو پھر اسے قیامت سمجھنا چاہیے۔

اِس سخت دَور میں جو لوگ برسرِ پیکار ہیں اور روایاتِ اسلامی کے تحفّظ کو مقصدِ زندگی بنائے ہوئے ہیں اور تعمیرِ ملک و ملّت کے عظیم و مقدّس فرض کی بجا آوری میں مصروف و مشغول ہیں، اُن کی راہ بڑی کٹھن ہے، پُرخار ہے، مگر وہ سزاوارِ تحسین و آفرین ہیں۔

"شامِ ہمدرد" کے مقررین کا شمار اِن ہی بلند شخصیتوں میں ہے۔ یہ وہ اہلِ فکر و نظر ہیں جنھوں نے "شامِ ہمدرد" کے پلیٹ فارم سے قوم کو دعوتِ فکر و عمل دی ہے۔ ہمارا رُواں رُواں اِن کا شکر گزار ہے۔ "شامِ ہمدرد" کی مجالس جاری ہیں اور تعمیرِ ملک و مِلّت کے لیے انشاءَ اللہ تعالےٰ جاری رہیں گی۔ مصلحین اِس پلیٹ فارم سے قوم کو فکر و عمل کی دعوت دیتے رہیں گے اور ان مقالات کی اشاعت کا یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ خدا تعالےٰ ہماری مدد فرمائیں۔

محمّد سعید
ہمدرد منزل

مقالاتِ شامِ ہمدرد



اے ۔ کے ۔ بروہی

[شام ہمدرد کراچی ، دسمبر ۱۹٦۳ شمسی]

تقریظ

جناب اے۔ کے۔ بروہی

"شامِ ہمدرد" ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن کی طبّی، سائنسی، تعلیمی اور ثقافتی خدمت ہے۔ اس کے اجلاس کراچی، لاہور، راول پنڈی اور ڈھاکہ میں ہر مہینے منعقد ہُوا کرتے ہیں۔ ہماری قومی زندگی کے اخلاقی، ذہنی اور رُوحانی نشو و نما کے وسائل پر غور و فکر کرنے کے لیے ایک عوامی مرکز کی حیثیت سے اس کا وجود ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔ ہمدرد فاؤنڈیشن کے مؤسس صدر حکیم محمّد سعید صاحب کی یہ دلی تمنّا ہے کہ ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن کا مرتّب کردہ پروگرام پاکستانی قوم کو ذہنی اتّحاد، استحکام اور اخلاقی عظمت کے حصُول میں ایک مہیّج کا کام انجام دے۔ اس بات پر زور دینے کی ضرورت نہیں کہ ترقی اور خوش حالی کے حصُول کے لیے ہماری موجودہ جدّوجہد میں ایسے اجتماعات کتنا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ان اجتماعات سے قومی مسائل کے مختلف شعبوں پر تبادلِ خیال کرنے کے قیمتی مواقع ملتے ہیں۔ گویا یہ ایک ایسا اجتماعی مرکز ہے جہاں ہماری قومی زندگی کی رہبری کرنے والے مقاصد کا "لین دین" ہو سکتا ہے۔

تقریبًا بارہ سال ہوتے ہیں کہ میرے محترم دوست سیّد میراں محمّد شاہ مرحوم (جو کسی زمانے میں سندھ پروونشیل اسمبلی کے اسپیکر تھے اور بعد میں سندھ کی صوبائی حکومت کے وزیر بنے)، حکیم محمّد سعید صاحب کو ان کے اپنے الفاظ میں، مجھ سے "متعارف" کرانے کے لیے لائے تھے۔ اُس وقت مجھے اس کا بالکل اندازہ نہیں ہوا کہ مَیں جس شخص سے مل رہا ہوں، وہ آئندہ چند ہی سال کے اندر ہماری قوم کی اخلاقی اور ذہنی حیاتِ نَو کے حصول میں ایک اہم کردار ادا کرے گا۔ ہماری قوم میں بیداری پیدا کرنے کے مقصد کے لیے حکیم محمد سعید صاحب نے جو خدمات انجام دی ہیں، ان کا ریکارڈ موجود ہے، جس کو ہر شخص دیکھ سکتا ہے۔

حکیم سعید صاحب صرف ایک ممتاز اور اعلا پائے کے طبیب ہی نہیں بلکہ وہ ایک اَن تھک قومی کارکن ہیں ——— بلکہ اس سے بھی بڑھ کر وہ پاکستان کی ترقی کی مہم کے ایک پُرجوش مجاہد ہیں۔ اس بات کا خیال کرکے وہ ہر وقت رواں دواں رہتے ہیں، کبھی لاہور میں ہیں تو کبھی ڈھاکہ میں، کبھی راول پنڈی میں، کبھی پشاور میں اور کبھی چاٹ گام میں ———
یہ حیرت ہوتی ہے کہ باوجود اس دوا دوش کے وہ نہ صرف ایک مصروف مُعالج کے فرائض بھی انجام دیتے ہیں، بلکہ ہمارے ملک کے تقریباً تمام معاشرتی اور ثقافتی کاموں میں موثر طریقے سے حصہ لینے کا وقت بھی نکال لیتے ہیں "شامِ ہمدرد" ان کی تخلیقی صلاحیت کی پیداوار ہے۔ اب اِس ادارے کی بنیادیں پاکستانیوں کی دلوں میں اتنی مضبوط ہوچکی ہیں کہ ملک کے تقریباً ہر شخص کو اس سے جذباتی وابستگی پیدا ہوچکی ہے۔
"شامِ ہمدرد" جو کچھ بھی ہے وہ صرف حکیم محمد سعید صاحب کی تخلیقی اُپج اور سرگرمی کا نتیجہ ہے۔ شامِ ہمدرد میں تقریر کرنے کے لیے وہ جن مقرّروں کا انتخاب کرتے ہیں اس پر ایک نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ انتخاب کی محرک صرف یہ چیز ہوتی ہے کہ پیشِ نظر مقرّر پاکستان کے دانشور طبقے کے سامنے کوئی نہ کوئی خاص خیال پیش کرے۔ اِس مجموعے میں جو تقریریں شامل کی گئی ہیں، ان میں وہ تقریریں بھی ہیں جن میں مختلف مقرّروں نے حکیم سعید صاحب کے مہیّا کیے ہوئے پلیٹ فارم سے دَورِ حاضر کے اہم موضوعات پر اپنے خاص خیالات سے حاضرین کو مستفید کیا ہے۔ ان ہی تقریروں سے حکیم محمد سعید صاحب کے مدعو کیے ہوئے مقرّرین میں ملک کی اہم اور بااثر شخصیتوں کی ایک خاصی طویل فہرست نظر آتی ہے۔ اس میں مجھے تو کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ تقریروں کا یہ مجموعہ جس کو "ادبِ شامِ ہمدرد" کہا جاسکتا ہے، ہماری قوم کی فکری زندگی میں ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔ اِس لیے ہماری قوم اس شخصیت کی شکر گزار ہونے میں بالکل حق بجانب ہے جس نے عِلم اور روشنی پھیلانے میں اس خاص وضع کا پہلا قدم اٹھایا ہے۔
قومی ترقی کی رفتار کو قائم رکھنے کے لیے تخلیقی اور تعمیری قسم کی ثقافتی جدّوجہد ایک لازمی چیز ہے۔ اگر ہم دنیوی معاملات کی کش مکش میں اخلاقی قدروں کو بالکل ہی بُھلادیں یا جمالیاتی حس کو بیدار نہ رکھیں تو اپنی ثقافت کے مرکز سے دور ہوتے جائیں گے۔ اِس لیے قومی تعمیرِ نَو میں صحت مند ثقافتی جدّوجہد کی اہمیت پر جتنا بھی زور دیا جائے کم ہے۔ اجنبی ثقافتوں یا ناپسندیدہ عناصر کا یہ قاعدہ ہے کہ وہ ایسے معاشروں میں گھُس کر اپنی جگہ بنالیتے ہیں جہاں

ثقافتی خلا پیدا ہو گیا ہو۔ اس لیے کسی ملک کی ترقی کے لیے یہ ضروری ہے کہ ملک اپنی زندگی کے پروگرام میں ثقافتی جدّوجہد کی اہمیت کو نظر انداز نہ کرے، اُس کو اپنا صحیح مقام دے۔ قومی پستی کے اس عالم میں کہ ہر شخص مادی عیش و آرام کے پیچھے دیوانہ ہو رہا ہے، زندگی کے اعلا محاسن اور اس کی پائندار قدروں کو طاقِ نسیاں میں رکھ دیے جانے کا قومی اندیشہ پیدا ہوتا ہے، اس لیے اس کی شدید ضرورت ہے کہ اعلا قدروں اور محاسنِ زندگی کو زندہ رکھنے کے لیے باشعور کوششیں جاری رکھی جائیں تاکہ اجنبی تصوّرات ہماری ثقافتی خصوصیات پر حملہ آور ہونے نہ پائیں۔

جہاں تک راقم الحروف کو علم ہے، ہمارے ملک میں "شامِ ہمدرد" ہی وہ واحد پلیٹ فارم ہے جہاں پاکستان کے سربرآوردہ مفکر اور آزمودہ کار حضرات تاریخی اہمیت رکھنے والے مسائل پر اپنے خیالات میں دوسرے دانشوروں کو حصّہ دار بناتے ہیں۔ "شامِ ہمدرد" کے اجلاسوں میں مختلف ذہنوں کے اجتماع نے ہمارے اہلِ ملک کو قومی مقاصد اور قومی تمناؤں سے اس طرح آشنا کر دیا ہے کہ ان میں اپنی ثقافت کی قیمتی میراث، اس کی اخلاقی اور روحانی اقدار اور اپنے اعلا نصب العین کا شعور بیدار ہو گیا ہے۔ اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ قومی اہمیت کے مسائل پر تبادلِ خیال کرنے کے لیے اس ملک کے دانشوروں کو "شامِ ہمدرد" کا ایک معیاری پلیٹ فارم مل گیا ہے۔

ہم سب جانتے ہیں کہ ہمارے زمانے کے صنعتی اور تکنیکی انقلاب سے اہلِ ملک کی زندگیوں میں ایک نازک مرحلہ مادی طاقتوں اور روحانی اقدار کے ٹکراؤ سے رُونما ہوا ہے۔ توازن کا یہ اختلال ہماری ترقی کے تسلسل میں رخنہ ڈال رہا ہے اور ہمارے اسلامی معاشرے کے استحکام کے لیے سخت خطرہ بن گیا ہے۔ ہمیں اس نازک مرحلے سے صحیح سلامت گزرنا ہے تاکہ ہم اس فرض کو انجام دے سکیں جس کا تاریخ نے ہمیں ذمّے دار بنایا ہے۔ ایک طرف تو اخلاقی اور روحانی زندگی کے ان تقاضوں کو پورا کرنا ہے جن کا قرآنِ مجید عَلَم بردار ہے اور جن کی مثال ہمیں اپنے نبیِ کریمؐ کی سیرت میں ملتی ہے۔

اس نازک مرحلے کے ساتھ ساتھ ہم بہت سے قومی مسائل سے بھی دوچار ہیں۔ یہ مسائل ہماری معاشرتی اور معاشی جدّوجہد سے، اور ہمارے قومی اتحاد و استحکام سے اور ہمارے ملک کے دفاع سے متعلق ہیں۔ ہمارا ملک ان مسائل کو حل کرنے کی مردانہ وار کوشش کر رہا ہے یہ واقعہ ہے کہ ایک منظم سیاسی معاشرے کی حیثیت سے اپنی بیس سالہ زندگی میں قومی

ترقی کے میدان میں ہمارے ملک نے نمایاں کامیابیاں حاصل کی ہیں"۔ شامِ ہمدرد" نے بھی معاشرتی اور معاشی خطروں سے آگاہ کرکے قومی اِستحکام کا احساس پیدا کرکے اور اپنے ہم وطنوں کی خدمت کا جذبہ پیدا کرکے اپنا حق ادا کیا ہے۔ اس نے مختلف شعبوں میں ملک کی غیر معمولی ترقی کو بھی نمایاں کیا ہے۔ اِس قسم کی واقفیت اور معلومات کو پھیلانے کا کام کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ یہ وہ کام ہے جو ہماری شان دار علمی روایات سے جو ہمیں زمانہ ماضی سے ورثے میں ملی ہیں، عین مطابقت رکھتا ہے۔ اِس نے ہمیں اپنے قومی کردار کو ترقی دینے اور قوم کے بنیادی مطمحِ نظر کو محفوظ رکھنے کی بھی بڑی خدمت انجام دی ہے۔ یہ تمام باتیں صاف طور پر یہ ظاہر کرتی ہیں کہ "ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن" نے اپنی جدّوجہد کو قوم کی صرف جسمانی صحت ہی کو ترقی دینے کی حد تک ہی محدود نہیں رکھا ہے، بلکہ اس کو قوم کی فلاح و بہبود کا بھی برابر خیال رہا ہے۔

"شامِ ہمدرد" نے ہماری ثقافتی زندگی کے ایک بڑے خلا کو پُر کرنے کا کارنامہ بھی انجام دیا ہے۔ ہمارے اکثر بڑے شہروں کے ثقافتی افق کی ویرانی اور خستہ حالی کو پیشِ نظر رکھ کر "شامِ ہمدرد" کو ریگستان میں ایک سرسبز نخلستان سے تشبیہہ دی جاسکتی ہے۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے چار بڑے بڑے شہروں میں ہر ماہ جو یہ ثقافتی تقریب منعقد ہوتی ہے، اس نے مشہور شاعروں، ادیبوں، قانون دانوں، ججوں، سائنس دانوں، مفکّروں، حکیموں، ڈاکٹروں، مذہبی عالموں، تعلیمی ماہروں، فوجی افسروں اور عوامی لیڈروں کو ان کے اپنے پسندیدہ موضوعات پر اپنے اپنے خیالات کو پیش کرنے کے لیے ایک اسٹیج فراہم کر دیا ہے۔ آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ملک کے تعلیم یافتہ لوگوں کو ایک ہی پلیٹ فارم سے مصنفوں اور مفکّروں کے اتنے مختلف النوع افراد نے مخاطب کیا ہو۔ "شامِ ہمدرد" نے ہمارے ہم وطنوں کی ثقافتی زندگی میں ایک نئی مشعل روشن کی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ "ہمدرد" نے اپنے آپ کو ایک کاروباری دواساز ادارے سے کہیں زیادہ ایک قومی ادارہ ثابت کیا ہے۔ اس نے ایک ایسی تحریک چلائی ہے، جس کا مقصد ہمارے اہلِ ملک کی صرف جسمانی فلاح و بہبود ہی نہیں ہے، بلکہ ان کی رُوح و ذہن کو روشنی پہنچانا بھی ہے۔ اس کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ وہ ہماری قوم کے جذبات اور احساسات میں نظم و ضبط پیدا کرنے والی طاقتوں کا جن سے قوم کے اجتماعی مفادات ترقی پاتے ہیں، ایک بڑا سہارا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وسیع تر معنوں میں صحت کا مطلب صرف بیماری کا نہ ہونا ہی نہیں

ہے، بلکہ اس کا مطلب کسی عضو کو اصلی وظائف کے ادا کرنے کے قابل بنا دینا ہے، تاکہ اس عضو کی انفرادی تنظیم کو اپنے ماحول سے ہم آہنگ ہونے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ اس معنیٰ میں صحت کا تقاضا یہ ہے کہ ایسی صورتِ حال پیدا کر دی جائے جو ایک صحت مند مکمل زندگی کی ضامن ہو اور جو ہماری قوم کی خفیہ طاقتوں اور لامحدود صلاحیتوں کو اُبھارنے والی ہو۔ اِس طرح اس مکمل قومی جدّ و جہد میں جو کروڑوں افراد کی زندگیوں میں روشنی پہنچانے اور ان کو مضبوط اور قوی بنانے کے لیے کی جا رہی ہے، ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن کی کوششیں بھی اس کا ایک جزوِ لاینفک ہے۔

ہمدرد نے ایک عظیم کام کو پورا کرنے کا ذمّہ لیا ہے، اس لیے بے عمل بیٹھے رہنا اس کے اعلا مقاصد سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اس کو آگے بڑھنا اور وقت کا ساتھ دینا ہے۔ اپنی اعلا درجے کی مطبوعات کے ذریعے ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن عوام کے وسیع تر طبقوں میں صحت اور صفائی کا ایک عام احساس پیدا کرنے کا حق ادا کر رہا ہے۔ اِس طرح وہ ہماری روایات کی شریف ترین اور اعلا ترین خوبیوں کے نشو و نما کو تقویت پہنچا رہا ہے۔

(انگریزی سے ترجمہ)



مولانا حافظ محمد ایوب دہلوی

[شام ہمدرد کراچی ، جون ۱۹۶۳ شمسی]

مولانا حافظ محمّد ایوّب دہلوی

حضرت مولانا محمد ایوبؒ دہلوی ہمارے زمانے کے ان چند متبحر علما میں سے ہیں، جن پر بجا طور پر فخر کیا جا سکتا ہے۔ مولانا اگرچہ عوام میں زیادہ مشہور نہیں ہیں اور بہت سے خواص بھی انھیں نہیں جانتے، لیکن جن لوگوں نے مولانائے محترم کو قریب سے دیکھا ہے اور جنھیں ان کی فاضلانہ تقاریر سے استفادہ کا موقع ملا ہے، وہ یقیناً میری تائید کریں گے کہ ایسے علما کم ہی پیدا ہوتے ہیں، خصوصاً علم کی ناقدری کے اِس دور میں تو ایسے عالم پیدا ہونا اور بھی مشکل نظر آتا ہے۔

حضرت مولانا ایوب صاحب اپنے وسیع و عمیق علم کے باوجود نہایت سادہ مزاج، سادہ لباس اور دنیاوی رکھ رکھاؤ سے بے نیاز ہیں۔ انھوں نے اپنے عِلمِ دین کو کبھی حصولِ رزق کا ذریعہ نہیں بنایا، بلکہ تجارت کے ذریعے اکلِ حلال کمایا اور تجارت میں محنت اور دیانت کی کمی کے علاوہ کسی چیز کو باعثِ شرم نہ سمجھا۔ مولانا دہلی میں بھی تجارت کرتے تھے اور یہاں بھی تجارت کرتے ہیں۔ دین اور علم کی اشاعت کو شغل اور خدمت کے طور پر کرتے ہیں اور اس سے کوئی مالی اور مادّی فائدہ نہیں اٹھاتے۔

مولانائے محترم قدیم منطق، فلسفہ اور علم الکلام کے جیّد علما میں سے ہیں، ان کو نہ صرف ان علوم پر بے پناہ عبور حاصل ہے، بلکہ وہ بہت سے مسائل میں مجتہدانہ رائے رکھتے ہیں۔ جدید تعلیم یافتہ افراد کے دلوں میں اکثر شکوک و شبہات کے کانٹے چُبھ جاتے ہیں، مولانا اپنی تقاریر کے ذریعے بے یقینی کے سارے جھاڑ جھنکاڑ صاف کر کے دلوں میں اسلام اور ایمان کے پھول کھلا دیتے ہیں۔ وہ فقہ کے مسائل بیان نہیں کرتے بلکہ دین کی حکمت اور احکام کی مصلحت کو اتنے مدلّل اور مشرّح انداز میں سمجھاتے ہیں کہ کم زور سے کم زور عقیدے کا آدمی بھی قائل ہو جائے۔ حضرت ملّا واحدی کے الفاظ میں " مولانا محمد ایوبؒ بحرِ علم کے غوّاص ہیں، علم کے سمندر میں غوطے لگاتے

ہیں اور وہ موتی نکال کرلاتے ہیں کہ سبحان اللہ سبحان اللہ بولنے ہیں ادق سے ادق مضمون کو پانی کر دیتے ہیں۔ جاہل سے جاہل کے بھی کچھ پلے پڑ جاتا ہے۔ لکھنے کی مشق نہیں ہے، لکھنے کی مشق کر لیتے تو موجودہ دور کے امام غزالی یا امام رازی ہوتے۔"

محمد سعید

وَالْعَصْرِ
کی
ایمان افروز کلامی تفسیر

اِمام المتکلمین حضرت مولانا محمد ایوب صاحب دہلوی

قَوْلُہٗ جَلَّ جَلَالُہٗ ـــــ وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ

سارا زمانہ گواہ ہے کہ انسان خسارے اور ٹوٹے میں ہے، کیوں کہ وہ جی رہا ہے مرنے کے لیے، اسے تو مرنا چاہیے تھا جینے کے لیے۔ ہاں بے شک ٹوٹے اور خسارے سے وہ لوگ نکل گئے، جو مان گئے اس بات کو کہ بے شک مرنا ہی چاہیے جینے کے لیے، نہ کہ جینا چاہیے مرنے کے لیے اور خسارے اور ٹوٹے سے بچنے کے لیے صرف اس بات کو ماننا ہی کافی نہ تھا، بلکہ انھوں نے اِس بات پر صحیح عمل بھی کر دکھایا یعنی وہ مر گئے جینے کے لیے اور انھوں نے صرف خود ہی یہ کام نہیں کیا، بلکہ دوسروں کو بھی تاکید سے کہہ دیا کہ جیو مت مرنے کے لیے، بلکہ مرجاؤ جینے کے لیے اور انھوں نے اس بات کی بھی تاکید کر دی کہ دیکھو جینے کے لیے مرنے میں بڑے بڑے مصائب اور دشواریاں پیش آئیں گی۔ اس وقت ڈٹ کر ان مصائب کا مقابلہ کرنا۔ اگر ایسا کیا تو لازمی طور پر ٹوٹے اور خسارے سے نکل گئے! غور کرنا چاہیے کہ مہلک سے مہلک امراض میں بھی بعض اوقات انسان بچ جاتا ہے۔ خطرناک صدمات میں بھی بعض اوقات انسان بچ جاتا ہے، سانپ کے کاٹنے سے اور سمندر اور دریا اور کنویں میں گرنے سے اور اونچے پہاڑ پر سے گرنے میں بھی بعض اوقات انسان بچ جاتا ہے اور پھانسی کا حکم لگنے کے بعد بھی بعض اوقات بچ جاتا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ اسبابِ ہلاکت کو یقینی طور پر ہلاکت لازم نہیں ہے، لیکن حیات کا انجام قطعی طور پر ممات ہی، یعنی جینے کو مرنا قطعاً لازم ہے۔ جو جیے گا یقینی طور پر وہ مرے گا، زمانے کی گواہی کے یہی معنی ہیں۔ پس جس طرح اسبابِ ہلاکت سے بچنے کی ہر کوئی کوشش کرتا ہے، حالاں کہ اسبابِ ہلاکت ہلاکت کے لیے ظنّی ہیں، جس کا یقینی طور پر انجام ہلاکت ہے، اس سے بچنا یعنی زندگی اور حیات سے بچنا اور بھاگنا یقینی طور پر مفید ہے اور خسارے سے نکلنا ہے، لہٰذا مرنے کے لیے جینا خسارہ ہے اور جینے کے لیے مرنا اس خسارے سے نکلنا ہے۔

جینے کے لیے مرنا، اس کے کیا معنی ہیں؟ خودکشی عقلاً اور شرعاً ممنوع ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ وہ اپنے آپ، اپنی خوشی سے اور اپنے ارادے سے پیدا ہوا اور نہ کوئی اپنی خوشی اور اپنے ارادے سے مرتا ہے، یعنی دوسرے کی خوشی سے آتا ہے اور دوسرے ہی کی خوشی سے جاتا ہے اور یہ کلیہ بالکل محسوس ہے اور مشاہدے میں آچکا ہی تو لابُد جس کی خوشی سے آیا اور جس کی خوشی سے گیا اسی کی خوشی سے یہاں دُنیا میں اُسے رہنا ہی۔ اس حال میں انسان اگر اپنی خوشی سے رہا تو یقیناً ہلاک ہو گیا یعنی جیا مرنے کے لیے، اور اپنے رب کی خوشی سے رہا تو قطعاً ہلاکت سے نکل گیا یعنی مرا جینے کے لیے۔ پس جینے کے لیے مرنے کے معنٰی یہ ہیں کہ اس حیات کے پل پر سے اپنی خوشی، اپنی مرضی اور اپنی رائے سے نہ گزرے، کیوں کہ تمام حیوانات اپنی شہوت کے ماتحت اس حیات کے پل پر سے گزر رہے ہیں۔ اب اگر انسان بھی اِس حیات کے پل پر سے اپنی مرضی سے گزر گیا تو مثل حیوانات کے ہو گیا، بلکہ اس سے بھی بدتر! کیوں کہ حیوانات اس پل پر سے نہایت ہلکے پھلکے سُبک طور پر گزر رہے ہیں اور یہ انسان پہاڑ جیسا عقل کا بوجھ سر پر لاد کر گزر رہا ہے، لہٰذا انسان حیوانات سے بھی بدتر ہو گیا۔ کتابِ الٰہی میں اس کی تصریح موجود ہے:

اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ "یہ چوپایوں جیسے ہیں، بلکہ ان سے بھی بدتر"۔ حاصل یہ ہے کہ صرف اس زندگی کا گزارنا ہی مقصود ہے تو تمام حیوانات بغیر عقل کے یہ زندگی گزار رہے ہیں لیکن انسان میں عقل موجود ہے، لہٰذا عقل سے زندگی گزاری جارہی ہے اور اس طرح گزاری جائے گی، جو خلاف ہو گی، اس زندگی کے جو بغیر عقل کے گزاری جارہی ہے اور جو زندگی بغیر عقل کے گزاری جارہی ہے۔ وہ زندگی ہے جو اپنی خواہش سے گزاری جارہی ہے، لہٰذا عقل سے وہ زندگی گزاری جائے گی، جو اپنی خواہش سے نہ ہو، بلکہ دوسرے کی خواہش کی ہو اور دوسرا وہ (خدا) ہے جو لایا تھا اور لے جائے گا۔ پس جینے کے لیے مرنے

کے معنی یہ ہیں کہ جو زندگی میں لایا ہے، اس کی مرضی کے مطابق زندگی بسر ہو اور اگر اس طرح زندگی بسر ہو گئی تو پھر حیاۃ طیبہ مل گئی۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۔

یعنی جس مرد نے صحیح اور صالح عمل کیا اور وہ مومن ہے، ہم اس کو حیٰوۃ پاکیزہ عطا کردیں گے۔ حیاتِ پاکیزہ وہ حیات ہے، جو موجبِ ہلاکت و ممات نہ ہو۔ دکھ کا چھُٹ جانا بہت اچھا ہے، سکھ کا چھُٹ جانا بہت برا ہے۔ جو لوگ سکھ میں ہیں ان سے قطعاً سکھ چھٹ جائیگا اور جو لوگ دکھ میں ہیں ان سے قطعاً دکھ چھٹ جائے گا، لہٰذا جیو مت مرنے کے لیے، بلکہ مرجاؤ جینے کے لیے۔ کیا تو نہیں دیکھتا کہ مُردہ تیرتا ہے زندہ ڈوبتا ہے۔ تیرنا ہے تو مرو، ڈوبنا ہے تو جیو! اللہ پاک کے اس قول میں غور کرنے کے بعد میری فہم یہیں تک پہنچی ہے۔ واللہ اعلم بمراد کلامہ۔

قولہ "والعصر" زمانے کی قسم انسان ٹوٹے میں ہے ——— قسم کے معنی تشبیہ بالتحقیق کے ہیں یعنی جس طرح تمہارے شعور میں زمانہ متحقق ہے اسی طرح انسان کا ٹوٹے میں ہونا متحقق ہے۔ جیسے کوئی کہے کہ اللہ کی قسم یہ بات یوں ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح اے سامع! تیرے خیال میں اللہ حق ہے، اسی طرح یہ بات بھی حق ہے۔ یہ بات غور کرنی چاہیے کہ قسم کس جگہ کھائی جاتی ہے۔

ہدایت اور تعلیم کے تین طریقے ہیں، جن کو اللہ پاک نے اس آیت میں فرمایا ہے: اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ، یعنی "اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت سے اور موعظتِ حسنہ سے لوگوں کو بلا اور ان سے بہترین طریقے سے مجادلہ کر"۔ حکمت کے معنی براہینِ یقینیہ کے ہیں یعنی جو لوگ حکما اور علما ہیں، ان کو براہین اور دلائلِ یقینیہ کے ذریعے ہدایت کر اور جو لوگ طریقۂ استدلال سے واقف نہیں ہیں، مگر سمجھ بوجھ رکھتے ہیں ان کو موعظتِ حسنہ سے ہدایت کر۔ موعظۂ حسنہ مسلمات عامّہ ہیں، کیوں کہ مسلمات عامّہ وہ اصول ہیں، جو فطرتِ انسانی نے مفادِ انسانی کے پیش نظر بغیر دلیل کے تسلیم کرلیے ہیں اور نظامِ عالم کی بقا ان پر موقوف ہے اور اسی کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے: فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ یعنی "سچے دین کی طرف اپنا منھ کرلے اور وہ سچا دین فطرت اللہ اور خلقت اللہ ہے، جس فطرت پر لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ اور فطرۃ اللہ ناقابل تبدیل ہے اور یہ فطرۃ اللہ دین برحق ہے، لیکن اکثر لوگ سمجھتے نہیں ہیں۔"

اور مسلمات عامّہ کی مثالیں یہ ہیں کہ صدق اچھی چیز ہے، کذب بُری چیز ہے، احسان کرنا اچھا ہے اور محسن کشی بُری چیز ہے۔ صدق کا حسن دلیل سے ثابت نہیں ہے کیونکہ حسن طبیعت کی مناسبت کا نام ہے اور کبھی کذب طبیعت کے مناسب ہوتا ہے، جیسے نبی کے بچانے کے لیے کذب واجب ہو جاتا ہے اور بے گناہ کی جان بچانے کے لیے کذب واجب ہو جاتا ہے لیکن عام طور سے مفادِ عامّہ صدق پر موقوف ہے، اس لیے عام مفاد کے پیشِ نظر حسن صدق تسلیم کر لیا گیا ہے اور جیسے دو لفظوں کے درمیان خط ملا سکتے ہیں یہ مفادِ عامّہ ہندسیہ کے پیشِ نظر تسلیم کر لیا ہے۔ یہ اگر نظری چیز ہوتی تو دلیل سے جس طرح اور اشکالِ ہندسیہ ثابت کی گئی ہیں، اسے بھی ثابت کیا جاتا اور اگر بدیہی اور ضروری ہوتی تو اس کو علوم متعارفہ میں شامل کیا جاتا، حالاں کہ ایسا نہیں کیا گیا محض مفادِ عامہ ہندسیہ کے پیشِ نظر ان اصول موضوعہ کو تسلیم کر لیا گیا۔ لہٰذا اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا کہ اپنے رب کے راستے کی طرف اوّلاً دلائل سے بُلا اور پھر مسلمات عامّہ موعظۃ حسنہ کے ذریعے بُلا اور پھر ان سے مجادلہ کر یعنی مسلمات خاصّہ سے مجادلہ کر یعنی خصم کے مسلمات سے ہی خصم کارد کر، جیسے فرمایا: قُلْ فَأْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَا اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ یعنی اگر سچے ہو تو اپنی مسلمہ کتاب تورات لے آؤ اور اس کو پڑھو۔ یہ مسلمات خاصّہ ہوئے۔ بس تعلیم وہدایت کے تین ہی طریقے تھے۔ اب بعض لوگ زیادہ عقل نہیں رکھتے تھے، ان کے سمجھانے کے لیے طریقہ قسم کا اختیار کیا گیا کہ تم دلائل نہیں سمجھ سکتے تو میری قسم پر اعتماد کرو۔ بس قسم کھانے کا موقع وہ ہے جہاں دلائل اور مواعظ کارگر نہ ہوں، وہاں قسم سے لوگوں کو مطمئن کیا جاتا ہے۔ عصر کے معنی دہر اور زمانے کے ہیں یعنی جس طرح زمانہ برحق ہے اور یقینی چیز ہے اسی طرح انسان کا گھاٹے اور ٹوٹے میں ہونا برحق اور یقینی ہے، جو تقدّم اور تاخر اور قبلیت اور بعدیت جمع نہ ہو سکے اسی کا نام زمانہ ہے متکلمین نے زمانے کی وہمیت ثابت کی ہے یعنی زمانہ حقیقی چیز نہیں ہے بلکہ وہمی چیز ہے اور یہ ان کی غلطی ہے۔ اگر زمانہ وہمی چیز ہوتا تو اللہ پاک اس کی قسم نہ کھاتا نیز فرمایا: ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ وہ دن حق ہے اور ظاہر ہے کہ یوم اور دن زمانہ ہے اور یوم کو حق فرمایا۔ بعض مفسرین نے عصر کی تفسیر عصر کے وقت سے کی ہے اور بعض نے نماز عصر سے کی ہے اور بعض نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے کی ہے۔ قولہ جل جلالہ۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ "بے شک انسان ٹوٹے میں ہے"۔ خسر کے معنی نقصان اور گھاٹے اور ٹوٹے کے ہیں اور گھاٹا اور نقصان نفع کی ضد ہے یعنی انسان نفع سے محروم اور دور ہے اور چوں کہ نفع مطلوب ہے، اس لیے آیت کے معنی یہ ہوئے کہ انسان اپنے مطلوب

سے بعید ہے۔ اب اس بات کا ثبوت کہ انسان مکلف بالاختیار ہے، قابلِ بیان ہے :
مکلف کے معنی یہ ہیں کہ اس کا وجود کسی دوسری شے کے لیے ہے اور بالاختیار کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ جس شے کے لیے پیدا ہوا ہے، اس شے تک اپنے اختیار سے پہنچے بغیر اختیار کے یعنی اضطراراً نہ پہنچے۔ جیسے آگ کہ اس کا وجود حرارت کے لیے ہے لیکن وہ اپنے اختیار سے حرارت تک نہیں پہنچی ہے، اِس طرح انسان کا وجود جس شے کے لیے ہے، اس شے تک اس کو اپنے اختیار سے پہنچنا ہے۔ یہ معنیٰ مکلف بالاختیار ہونے کے ہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ انسان کا وجود اگر دوسری شے کے لیے نہیں ہوگا تو یا اپنے لیے ہوگا یا اپنے لیے بھی نہیں ہوگا اور یہ دونوں شقیں باطل ہیں تو لابُد اس کا وجود دوسری شے کے لیے ہے۔ یہ شق کہ انسان کا وجود اپنے لیے ہے۔ یہ اس لیے باطل ہے کہ اگر انسان کا وجود اپنے لیے ہوگا تو اپنے میں ہوگا اور اگر اپنے میں ہوگا تو لازمی اپنے سے ہوگا، یعنی اگر اس کا وجود لِذاتہٖ ہوگا تو فی ذاتہٖ ہوگا اور فی ذاتہٖ ہوگا تو قطعی بذاتہٖ ہوگا اور اس کا وجود بذاتہ نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ انسان کو زید، عمر، بکر اور تمام افرادِ انسانیہ کی طرف نسبت برابر ہے۔ اب اگر انسانیت مقتضیٔ وجود ہوگی، یعنی انسان کی ذات بذاتہٖ وجود کی متقاضی ہوگی تو وہ واحدالوجود لازم آئے گا اور انسان صرف فردِ واحد میں منحصر ہو کر رہ جائے گا یعنی انسانیت واحد چیز ہے اور وجود کا تقاضا کر کے صرف موجود واحد بن جائے گا۔ حالانکہ موجوداتِ انسانیہ بکثرت ہے، اس سے پتا چل گیا کہ انسان کا وجود انسان کی ذات کا تقاضا نہیں ہے۔

حاصِل یہ ہے کہ زید ہونا، بکر ہونا، عمر ہونا انسانی وجود ہیں۔ اب اگر انسانیت زید ہونے اور عمر ہونے اور بکر ہونے کو چاہے گی اور یہ زید ہونا اور بکر ہونا اور عمر ہونا ہی وجود ہے تو اس صورت میں انسانیت کو صرف ایک وجود اور ایک ایک خصوصیت اور تعین لازم ہوگا، حالاں کہ تعینات خصوصیات، وجودات کثیر ہیں، اِس سے معلوم ہو گیا کہ انسان کا وجود انسان کی ذات سے نہیں ہے یعنی خود بخود نہیں ہے۔ جاننا چاہیے کہ دہریت کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان کا وجود خود بخود ہے۔ یہ عقیدہ باطِل ہے، کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ پہلے وہ نہیں تھا، پھر ہوا تو پہلا نہ ہونا اور پہلا عدم یا خالص عدم ہے، جس میں وجود کی قابلیت ہی نہیں ہے یا ایسا عدم ہے کہ جس میں وجود کی قابلیت ہے تو خالص عدم تو وجود ہو نہیں ہو سکتا ورنہ اجتماع النقیضین لازم آئے گا اور اجتماع وجود مع عدم لازم آئے گا۔ اب رہا قابلِ عدم، جیسا کہ نطفہ یا انڈا تو قابل مقبول کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا یعنی حیوان کے وقت نطفہ محال ہے، مرغ کے وقت انڈا محال ہے، گھی کے وقت دودھ محال ہے پھر خود بخود ہونے کے کیا معنیٰ ہیں؟

یا تو عدمِ حقیقی سے وجود میں آیا یا عدمِ قابلی سے وجود میں آیا اور یہ دونوں صورتیں محال ہیں۔ لہٰذا خود بخود ہو، بے معنی لفظ ہے، اِس لیے وجود غیر سے آیا بذاتہٖ نہیں ہے، بغیرہ ہے اور جب بذاتہٖ نہیں ہے تو ذات میں نہیں ہے، بلکہ غیر میں ہوگا اور جب غیر میں ہوگا تو غیر کے لیے ہوگا اپنے لیے نہیں ہوگا، لہٰذا انسان کا وجود اِنسان کے لیے نہیں ہے۔ اب اگر یہ کہا جائے کہ نہ اپنے لیے ہے نہ غیر کے لیے تو یہ شق بھی غلط ہے، اِس لیے کہ وجود مبدأ آثار کا نام ہے۔ اب اگر اس پر اثر مرتب نہ ہوگا تو اس کا ہونا نہ ہونا ہوگا اور یہ محال ہے، لہٰذا یہ کہنا کہ وجود دوسرے کے لیے بھی نہیں ہے نہ اپنے لیے تو اس صورت میں وجود اور عدم برابر ہو جائیں گے جس کی تصریح کتابِ الٰہی میں ہے اَفَحَسِبۡتُمۡ اَنَّمَا خَلَقۡنٰکُمۡ عَبَثًا یعنی کیا تم اس خیال میں ہو کہ تمھارا وجود کسی کے لیے نہیں ہے اور تمھارا وجود مثلِ عدم ہے"؟ اگر ایسا ہے تو ایجاد لغو اور بے کار ہو جائے گی۔ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الۡمَلِكُ الۡحَقُّ۔ اللہ جو سچّا اور حق مالک ہے وہ لغویت سے برتر اور بلند ہے اور فرمایا وَمَا خَلَقۡنَا السَّمَآءَ وَالۡاَرۡضَ وَمَا بَيۡنَهُمَا بَاطِلًا "ہم نے زمین و آسمان اور اس کے مابین کو بے کار نہیں بنایا"۔ اب جب کہ یہ باطل ہو گیا کہ انسان کا وجود نہ اپنے لیے ہے نہ عبث ہے تو لابُد انسان کا وجود کسی دوسری شے کے لیے ہے اور یہی معنی مکلّف ہونے کے ہیں، لہٰذا انسان مکلّف ہے، یہاں ایک ضروری ہدایت ہے: جب ثابت ہو گیا کہ انسان کا وجود غیر سے ہی ہے۔ اِسی دلیل سے جو اوپر گزری یعنی تمام کائنات ہو سکتی تھی اور پھر ہو گئی تو اس کا ہونا اس کے ہو سکنے کے خلاف ہے یعنی ممکن کی طبیعت یہ ہے کہ وہ ہونے اور نہ ہونے کے درمیان ہو اور ہونا درمیان پن کے خلاف ہے اور درمیان پن کو توڑنے والا ہے تو تمام موجوداتِ ممکنات کے خوارق عادات ہو گئے، کیونکہ ہونا ہو سکنے کا خارق ہے یعنی ہونے نے ہونے اور نہ ہونے کے درمیان پن کو توڑ دیا، لہٰذا انبیا علیہ السّلام کے خارق پر خوارقِ کائنات دلائل ہیں۔ بس انبیا علیہ السّلام کے خوارق پر خارقِ کائنات شاہد ہیں، اس میں شک کرنا کائنات میں شک کرنا ہے —— جاننا چاہیے کہ خرقِ عادت ہر صورت میں لازم ہے۔ اگر تمام کائنات اور حوادث بلا سبب اور بلا علّت ہیں، جیسے کہ دہریہ کہتا ہے تو بعض اشیا یعنی خوارقِ انبیا علیہ السّلام اگر بے سبب ہوں تو کیا حرج ہے؟ نیز مشاہدہ بتا رہا ہے کہ مسبب کی عادت ہے کہ سبب ہو اور جب تمام اشیا بے سبب ہو گئیں تو بعض کا بے سبب ہونا کیسے غیر معقول ہے اور اگر کائنات کے لیے علّت ہے تو یہ علّت حادث تو نہیں ہو سکتی، کیوں کہ حادث ہونے کی صورت میں یہ علّت اور یہ سبب حوادث اور کائنات میں شامل ہو جائے گا، لہٰذا علّت قدیم ہوگی اور قدیم کی عادت بھی قدیم ہے، لہٰذا جملہ حوادث قدیم کی عادت کے خلاف ہو گئے اور اگر علّت

قدیمہ قادر مختار ہے تو ازل سے اس کی عادت ترکِ حادث یعنی ترکِ فعل کی ہے اور پھر خاص معین وقت میں فعل کو حادث کرنا عادت کے خلاف ہو گیا۔ غرضیکہ ہر صورت میں خلافِ عادت لازم ہے، لہٰذا انبیا کے خلافِ عادت میں تعجب کرنا مشاہدات اور محسوسات میں شک کرنا ہے یعنی تمام محسوسات خلافِ عادت ہیں۔ یہ نکتہ قابلِ غور ہے! اب جب کہ یہ ثابت ہو گیا کہ انسان مکلّف ہے تو اب یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ تکلیف اختیاری ہے اور انسان مختار ہے مجبور نہیں ہے اور جبر کا عقیدہ غلط ہے، کیونکہ جبر کی تقدیر پر تکلیف باطل ہو جائیگی۔ یعنی مجبور کو تکلیف دینا غیر معقول ہے اور اس وقت مدح و ذم، ثواب و عذاب سب باطل ہو جائے گا، نیز اختیار بالمشاہدہ ہے اور بدیہی ہے، حتیٰ کہ جانور بھی جانتا ہے کہ انسان مختار ہے۔ کتا پتھر کے ٹکڑوں پر پڑا رہتا ہے اور ہرگز پتھر سے نہیں ڈرتا لیکن جب انسان اِس پتھر کو اٹھالیتا ہے تو اسی پتھر سے جس پر وہ نڈر بیٹھا رہتا ہے، ڈرنے لگتا ہے۔ اس کا یہ ڈرنا بتا رہا ہے کہ پتھر جبر کے ہاتھ سے نکل کر اختیار کے ہاتھ میں آگیا ہے اور یہ کہنا کہ اللہ ہر شے کا خالق ہے اور بندہ محض مجبور ہے۔ یہ استدلال ایسا بڑا مُغالطہ ہے کہ جس میں مختار اور مجبور کہنے والے دونوں فریق مجبور ہو گئے ہیں۔ میں نے بحمدِ اللہ اس پیچیدگی کو حل کر دیا۔ جبر و اختیار کی بحث میں یہاں صرف اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ بندے کے فعل کا مخلوقِ خدا ہونا بندے کے شعور میں نہیں ہے۔ جو فعل بندہ کر رہا ہے بندے کو کامل شعور ہے کہ وہ فعل بندہ ہی کر رہا ہے، خدا نہیں کر رہا ہے اور عقلی دلیل سے اور نصوصِ قرآنی سے جو چیز ثابت ہے، اس جبر کا بندے کو شعور نہیں ہے۔ عام شعور سے باہر آکر مجبور ہے بھی تو وہاں مکلّف نہیں ہے اور جہاں مکلّف ہے وہاں مختار ہونے کا شعور ہے۔ مسئلہ جبر و قدر ایک الگ بحث ہے جو میری دوسری تقریر میں موجود ہے۔ یہاں یہ ثابت ہو گیا کہ انسان مکلّف و مختار ہے۔ اب اس بات کا ثبوت کہ ہر مکلّف بالاختیار اپنے مطلوب سے بعید ہے اور محروم ہے، یہ ہے کہ اختیار کو فعل اور ترکِ فعل دونوں کی طرف نسبت برابر ہے، یعنی قوتِ اختیاری کو نہ فعل لازم ہے نہ ترکِ فعل لازم ہے کیوں اگر فعل یا ترک لازم ہو گا تو قوتِ اختیاری قوتِ اضطراری ہو جائے گی اور اس وقت مطلوب ہر صاحبِ اختیار کو یعنی تمام انسانوں کو حاصل ہو جائے گا اور انسان مثل حیوانات، جمادات و نباتات ہو جائے گا۔ لہٰذا انسان کو اس کا مطلوب لازم نہیں ہے اور جب کہ مطلوب لازم نہیں ہے تو لابُد جُدا ہے، دُور ہے۔ پس مکلّف بالاختیار کے اپنے مطلوب سے محروم اور بعید ہونے کے یہی معنیٰ ہیں۔

خلاصہ تقریر یہ ہے کہ:

اِنسان مکلّف بالاختیار ہے اور ہر مکلّف بالاختیار اپنے مطلوب سے بعید ہے، لہٰذا

انسان اپنے مطلوب سے بعید اور محروم ہے۔ یہی معنی انسان کے خاسر ہونے کے ہیں۔ قولہ جل جلالہٗ
اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۔ مگر جو لوگ ایمان
لے آئے اور صالح اعمال کیے اور انھوں نے حق کی نصیحت کی اور ضبط و صبر کی وصیت کی
(وہ بے شک مستثنیٰ ہیں خسارے سے یا خسارے کا حکم ان پر لاگو نہیں ہے۔)

جاننا چاہیے کہ قوتِ اختیار کے اِعتبار سے ہر انسان ٹوٹے میں ہے، جیساکہ اوپر ثابت ہو چکا ہے۔ اب اس استثنا کے یہ معنی ہیں کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

قوتِ اختیاریہ کو چونکہ مطلوب اور غیر مطلوب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دونوں کی طرف نسبت برابر ہے جیسے بچہ ماں کا دودھ بھی منھ میں رکھ لیتا ہے اور کنکر بھی منھ میں رکھ لیتا ہے، ماں کا دودھ مطلوب ہے اور کنکر پتھر غیر مطلوب ہے، لہٰذا فعل اختیار سے صادر ہی نہیں ہو سکتا جب تک کہ اختیار کو فعل کی طرف لانے کے لیے کوئی داعی سبب مرجح نہ ہو تو صرف نفس یعنی شہوت و غضب کا مجموعہ مرجح فعل ہوتا ہے۔ اب اگر انسان میں بھی مرجح فعل نفس یعنی شہوت و غضب کا مجموعہ مرجح اور داعیٔ فعل ہو گا تو انسان مثل حیوانات ہو جائے گا۔ چوں کہ شہوت و غضب کی ترجیح اضطراری ہے یعنی بھوک کے وقت کھانے اور پیاس کے وقت پینے پر مضطر ہے تو انسان بھی جانور کی طرح مضطر اور مجبور ہو کر مثل جانور بلکہ اس سے بھی بدتر ہو جائے گا اور اختیار اضطرار سے دب جائے گا، لہٰذا مرجح فعل نفس نہیں ہو سکتا اور عقل تنہا کافی نہیں ہے، کیوں کہ فعل حرکت ہے اور حرکت غیر مجتمع الاجزا ہے، اِس لیے حرکت کا انجام عقل سے معلوم نہیں ہو سکتا، لہٰذا انسانی اِختیار کو ترجیح دینے والا یا خالق کا اختیار ہے یا خالق کا امر ہے تو خالق کا اختیار تو مرجح ہو نہیں سکتا، کیوں کہ خالق کے اِختیار اور ارادے سے مراد جدا نہیں ہو سکتی اور اس وقت اگر خالق کا ارادہ مرجح ہو گا تو انسانی افعال اضطراری ہو جائیں گے، لہٰذا انسانی اختیار کو ترجیح دینے کے لیے صرف امرِ الٰہی کافی ہے یعنی مرجح اختیارِ انسانی صرف امرِ الٰہی ہے، کیوں کہ امرِ الٰہی صرف ایسی چیز ہے جس میں انسانی اختیار باقی رہتا ہے اور یہ امرِ الٰہی غیر انسانی واسطے سے نہیں پہنچ سکتا، کیوں کہ اس صورت میں اِختیار اضطرار سے بدل جائے گا یعنی فرشتہ اگر بتائے گا تو سن کر مجبور ہو جائے گا۔ حیوانات، نباتات، جمادات، عناصر افلاک وغیرہ اگر بتائیں گے تو سن کر انسان مجبور ہو جائے گا لیکن اگر انسان بتائے گا تو مجبور نہیں ہو گا، بلکہ وہ مختار رہے گا اور وہی انسان جو امرِ الٰہی بتا دے، وہی نبی ہے، اللہ تعالیٰ کے قول اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا کے معنی یہ ہیں کہ جن کو یہ علم ہو گیا کہ مرجح اختیار انسانی صرف امرِ الٰہی ہے اور انھوں نے اِس بات کی تصدیق کر لی اور امرِ الٰہی نبی کے بتلائے بغیر محال ہے تو انھوں نے

نبی کی بھی تصدیق کرلی تو بے شک وہ اس خسارے سے نکل گئے اور عملِ صالح بھی کیا اور عملِ صالح وہ عمل ہے کہ جس کو امرِ الٰہی نے بالواسطہ نبی ترجیح دی۔

یعنی انسانی اختیار کو جس فعل کی طرف لانے کی ترجیح امرِ الٰہی نے دی وہ فعل عملِ صالح ہے اور صرف ایمان اور عملِ صالح اپنے لیے نقصان سے بچنے میں تنہا کافی نہیں ہے، بلکہ دوسروں کو بھی اسی حق بات کی تصدیق کرائی اور عمل صالح کی ترغیب دی اور حق کی تصدیق اور عملِ صالح کی ترغیب میں جو دشواریاں پیدا ہوتی ہیں انھیں خود بھی ناگوار نہ جانا اور دوسروں کو بھی گوارا کرانے کی تاکید کی تو بے شک یہ لوگ نقصان سے، خسران سے، حرمان سے محفوظ ہوگئے۔

میرا یہ خیال اللہ عزّوجل کے قول کے سمجھنے میں یہیں تک پہنچا۔

(وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ)

شامِ ہمدرد - کراچی

جون ۱۹۶۳ شمسی

ڈاکٹر آئی۔ ایچ۔ عثمانی

جناب ڈاکٹر آئی۔ ایچ۔ عثمانی صاحب ہمارے ملک کے چند ممتاز سائنس دانوں میں سے ہیں اور بڑے خلوص، سرگرمی اور دل جمعی کے ساتھ سائنسی میدان میں ملک و ملت کی خدمت کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر عثمانی صاحب نے ابتدائی تعلیم علی گڑھ میں پائی۔ بی۔ ایس۔ سی (آنرز) کی سند ۱۹۳۶ء میں بمبئی یونی ورسٹی سے حاصل کی اور طبیعیات اور ریاضی کے گروپ میں اوّل آئے۔ علی گڑھ سے طبیعیات میں امتیازی نمبروں کے ساتھ ایم۔ ایس۔ سی کرنے کے بعد ۱۹۳۷ء میں پروفیسر جی پی تھامسن (نوبیل پرائز یافتہ) کے ساتھ کام کرنے کے لیے لندن کے امپیریل کالج آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی میں داخلہ لیا۔ آپ لندن سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی سند لینے والے گنتی کے چند کم عمر افراد میں سے ہیں۔ ۱۹۴۰ء میں آپ نے آئی۔ سی۔ ایس کے امتحان میں کامیابی حاصل کی اور ۱۹۴۲ء میں مدراس کے آئی۔ سی۔ ایس عملے میں داخل کر لیے گئے۔

پاکستان میں ڈاکٹر صاحب درآمد و برآمد کے چیف کنٹرولر، ڈائرکٹر صنعت مغربی پاکستان اور مغربی پاکستان ترقیاتی کارپوریشن کے چیرمین کے مناصب جلیلہ پر مامور رہے ہیں۔ آپ نے تکنیکی اور غیر تکنیکی دونوں میدانوں میں کئی بین الاقوامی کانفرنسوں میں پاکستان کی کامیاب نمائندگی کی ہے۔ آپ پاکستان اٹومک انرجی کمیشن کے چیرمین کی حیثیت سے سینٹو کی سائنٹی فک کونسل کے رکن ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ۱۹۶۰ء میں ویانا میں چوتھی بین الاقوامی جوہری توانائی ایجنسی کی کانفرنس میں پاکستانی وفد کی قیادت کی اور اس میں جنرل کانفرنس کی قانونی و انتظامی کمیٹی کی رپورٹ مرتب کرنے کا اہم کام آپ کے سپرد کیا گیا۔



ڈاکٹر آئی ۔ ایچ ۔ عثمانی

۵۹ ش میں صدر پاکستان نے جو سائنسی کمیشن مقرر فرمایا تھا، ڈاکٹر عثمانی صاحب اس کے رکن اور سیکرٹری تھے اور کمیشن کی سفارشات میں آپ کا بڑا اہم حصہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب پاور کمیشن کے صدر بھی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ۱۶ ش میں بین الاقوامی جوہر توانائی ایجنسی کے گورنروں کے بورڈ کے نائب صدر منتخب کیے گئے۔

جناب ڈاکٹر آئی - ایچ - عثمانی صاحب پاکستان کے ایک نامور سائنس داں ہونے کے علاوہ ایک اچھے منتظم، ایک منجھے ہوئے مقرر، ایک تجربہ کار افسر بھی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اُردو ذریعۂ تعلیم کے حامی نہ ہونے کے باوجود اردو ادب کا بڑا استھرا ذوق رکھتے ہیں اور خود بڑی اچھی زبان بولتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب جس لگن، جوش و خروش اور ذہانت کے ساتھ ملک و ملت کو سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں آگے بڑھانے کی کوشش کر رہے ہیں وہ ہم سب کے لیے باعثِ مسرت ہے۔

محمد سعید

سائنس
اور
بقائے انسانی

از ڈاکٹر آئی - ایچ - عثمانی - صدر پاکستان اٹومک انرجی کمیشن

" خدا نے انسان کو مظاہرِ فطرت مثلاً سمندروں، دریاؤں، برِاعظموں،
ہوا، چاند، سورج کے ماورا پھیلے ہوئے خلا اور دن رات کو مسخر کرنے
کی حیرت ناک صلاحیت بخشی ہے، تاکہ وہ اپنی محنت کا ثمر کھائے "
(قرآن مجید)

میں یہ مقالہ ایک سائنس داں کی حیثیت سے نہیں بلکہ سائنس کے ایک حامی اور خادم کی حیثیت سے لکھ رہا ہوں لیکن یہ حمایت اور یہ خدمت ایک ایسے ملک میں مشکل ہیں، جہاں سائنس کو مذہب کا مخالف سمجھا جاتا ہو اور جہاں کے سائنس داں بھی تعلیمی نظام میں ادبیات کو سائنس پر فوقیت کا مستحق گردانتے ہوں۔ ان حقائق کی بنا پر میں سائنس پر کچھ لکھنے سے قبل تین بنیادی سوالات کا جواب دینا مناسب سمجھتا ہوں:

(۱) سائنس کیا ہے؟
(۲) سائنس کا فائدہ کیا ہے؟
(۳) ہمارے معاملات میں سائنس کو کیوں اہمیت دی جانی چاہیے؟

سائنس اور مذہب

سائنس اصل میں انسان کی روح میں سموئی ہوئی وہ متحرک قوت ہے جس سے اس کا تجسس بیدار ہوتا ہے اور وہ اسباب و عوامل کی تہہ کو پہنچ کر نیز اسرارِ فطرت کو بے نقاب کر کے

صداقت کا تلاشی ہوتا ہے۔ سائنس انسان کو اپنے تئیں، اپنے ماحول اور اپنے خالق کو پہچاننے میں مدد دیتی ہے، وہ خالق جس نے اتنی بڑی کائنات پیدا کی، جس میں انسان کی بساط کچھ بھی نہیں۔ سائنس رُوحِ انسانی کی معراج ہے جو کبھی اسے دنیا کی بلند ترین چوٹی پر لے جاتی ہے کبھی عمیق ترین سمندر کی سیر کراتی ہے، کبھی ننھے جوہر کے مرکزہ سے متعارف کراتی ہے اور کبھی خلائے ناپیدا کنار میں آوارہ و سرگرداں کرتی ہے۔ انسان ہر جگہ صداقت کا متلاشی نظر آتا ہے۔ اس قسم کی مہمات میں انسان نے قوانینِ قدرت ہی دریافت نہیں کیے بلکہ پوری نوعِ انسانی کی فلاح کی غرض سے مظاہرِ قدرت کو مسخر کرنے کے لیے اپنا حق بھی قائم کیا ہے۔ الغرض سائنس نے انسان کو اس قابل بنایا کہ وہ تمام اختلافات و تفریقات سے بالا ہو کر حق و صداقت کا متلاشی ہو۔ مذہب کا منتہائے مقصود بھی یہی ہے کہ خدا کے بتائے ہوئے راستے پر چل کر حق و صداقت کی تحصیل کی جائے۔ جب یہ صورت ہو تو دو عظیم قوتیں جنھیں ہم مذہب اور سائنس کے نام سے جانتے ہیں، اور جو ذہن و رُوحِ انسانی کا جزوِ لاینفک ہیں، ایک دوسرے کی مخالف کیسے ہو سکتی ہیں؟ اِس معمّے کا حل ہمارے دَور کے سب سے بڑے سائنسداں آئن سٹائن نے اپنے الفاظ میں کیا خوب پیش کیا ہے:

> مذہب کی اساس اس عقیدے پر ہے کہ جہانِ ہست و بود کا دار و مدار معقول بنیادوں پر ہے۔ مذہب دلائل کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے۔ میرے خیال میں کوئی شخص بھی اِس عقیدے کے بغیر اصلی سائنس داں نہیں بن سکتا۔ ہم مختصر طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ سائنس مذہب کے بغیر لنگڑی ہوتی ہے اور مذہب سائنس کے بغیر اندھا۔"

پاکستان میں تقریباً ہر پلیٹ فارم سے مذہب کی آواز ہمارے کان تک پہنچائی جاتی ہے، لیکن کیسے افسوس کا مقام ہے کہ اِسی ملک میں سائنس کی آواز اِس قدر نحیف اور ہمارے ذہن میں اس کا عکس اس قدر دھندلا ہے کہ کسی کو نظر نہیں آتا۔ میں مذہب کے تمام واعظوں اور ان تمام سیاسی جماعتوں سے جو 'مسلمان' اور 'اسلام' کے نام پر اہلِ پاکستان سے رابطہ قائم کرتی ہیں، اپیل کرتا ہوں کہ وہ ساتھ ساتھ سائنس کی ترویج و ترقی پر بھی توجہ دیں اور قومی مسائل کا حل تلاش کرتے وقت جذباتی رجحانات کے بجائے سائنسی لائحۂ عمل اختیار کریں۔ مسائل باتوں کے بجائے سائنسی ترقی سے حل ہو سکتے ہیں۔ انھیں اپنے مواعظ اور پند و نصائح کے ذریعے عوام کو سمجھانا چاہیے کہ ہمارا اسلامی معاشرہ سائنس کو نظر انداز کر کے زندہ نہیں رہ سکتا۔ صرف مذہب ہماری نجات کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔

سائنس اور ادبیات

یہ تو تھا سائنس اور مذہب کا معاملہ۔ اب میں ایک اور اختلاف کا ذکر کرتا ہوں، جو ہماری زندگی میں سائنس اور ادبیات کے ظاہری تصادم کی وجہ سے در آیا ہے۔ یہ تعصب ان لوگوں کا پیدا کردہ ہے جنھیں میں "پڑھے لکھے جاہل" کہنے کی جرات کرتا ہوں۔ گئے گزرے زمانے کی بات اور تھی، جب ہمارے آباؤ اجداد کی زندگی پر سائنس کسی قسم کا کوئی اثر مرتب نہیں کر سکی تھی، اس لیے ان کی تمام تر توجہ فنونِ لطیفہ اور ادبیات پر مرکوز رہی لیکن بیسویں صدی کے نصف آخر میں زندگی گزارتے ہوئے کسی شخص کو یہ معلوم نہ ہو کہ ایک بٹن دبانے سے تاریکی پر روشنی کیوں غالب آجاتی ہے، ایک سوئچ گھماتے ہی ہمارے کان ہزاروں میل دور نشر ہونے والی موسیقی سے کیسے لطف اندوز ہونے لگتے ہیں۔ ہوائی جہاز کششِ ثقل کو مات دے کر کس طرح فضا کا سینہ چیرتا آگے بڑھتا ہے۔ بیج مٹی میں پھوٹ کر کس طرح پودا بن جاتا ہے یا خود ہماری زندگی منزل بمنزل آگے بڑھتی ہے۔ وہ شخص میرے نزدیک قابلِ معافی نہیں۔ میں یہاں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ سائنس صرف کل پرزوں اور مشینوں کا نام نہیں ہے بلکہ اس سے کہیں زیادہ بلند اور پاکیزہ شے ہے جو مادے اور حیات کے حسن اور ترتیب کو اجاگر کرتی ہے۔

بعض ادیب یہ سمجھتے ہیں کہ سائنس کوئی غیر دل چسپ اور روحانیت سے عاری نوعِ علم ہے۔ حقیقت میں ایسا نہیں۔ دیدۂ بینا کے لیے سائنس میں بھی فنّی حسن کا پہلو موجود ہوتا ہے۔ سائنس داں بھی کسی شاعر یا مصوّر کی طرح فطرت کے تمام پہلو اجاگر کرتا ہے۔ اس میں بھی وہی تجسس اور خیالات کی پرواز موجود ہوتی ہے، لیکن یک گونہ تنظیم کے ساتھ۔ وہ فنکار اور ادیب کا ہیولیٰ اپنے اندر سمو کر روح کے تار چھیڑتا ہے۔ ہمارے کانوں کو پیانو، بانسری یا وائلن کے سُر اس لیے بھلے معلوم ہوتے ہیں کہ ان کے پسِ پشت جو ترتیب کارفرما ہے وہ ماہرِ طبیعیات کی ودیعت کردہ ہے۔ جن رنگوں سے کسی تصویر کے حُسن میں اضافہ ہوتا ہے وہ ایک کیمیاداں کی برسوں کی محنتِ شاقّہ کا نتیجہ ہیں۔ نور اور آواز کے جس طلسم نے دنیا کے کروڑوں انسانوں کو ریڈیو اور ٹیلیے وژن کے ذریعے مسحور کر رکھا ہے۔ وہ سائنس کا عطا کردہ ہے۔ کولمبیا یونیورسٹی کے پروفیسر ناگل کے بقول "اگر ادیب یا ماہرِ انسانیات بننے کے لیے حیاتِ انسانی کے تمام پہلوؤں سے واقف ہونا ضروری ہے تو ارتقائے سائنس کی واقفیت بھی ضروری ہے، کیوں کہ اس کے بغیر کوئی تعلیم مکمل نہیں کہلائی جا سکتی۔"

سائنس اور ٹیکنالوجی: اب میں دوسرے سوال کا جواب دیتا ہوں "سائنس کا کیا

فائدہ ہے ؟ قوانینِ قدرت معلوم کرنے کے لیے یونانیوں سے لے کر اب تک تمام مفکروں اور فلسفیوں نے اپنے اپنے انداز میں پوری کوشش کی ہے لیکن جب نظریات کو تجربے کی کسوٹی پر کسا جانے لگا اور روزمرّہ زندگی میں ان کا اطلاق تلاش کیا گیا تو ہم "ٹیکنالوجی" سے متعارف ہوئے۔ یہ حقیقت ہے کہ چین، برِّعظیم پاک و ہند، رُوم اور مصر کی قدیم تہذیبوں میں زراعت، آب پاشی اور فنِ تعمیر جیسے بعض شعبوں میں فنی کمال حاصل کر لیا گیا تھا۔ دیوارِ چین، موہنجوڈارو کا شہر، روم کا کولوسیم اور اہرامِ مصر قدیم فنِ تعمیر کے جیتے جاگتے نمونے ہیں، لیکن یہ تہذیبیں ختم ہو گئیں کیونکہ ان کی بنیاد سائنسی نہیں تھی۔ پھر عربوں نے سائنس کی درس و تدریس کی طرف توجّہ دی اور نظریات کے ساتھ ساتھ تجرباتی سائنس نے ارتقائی منازل طے کرنی شروع کیں۔ اب سائنسی مسائل حل کرنے کے لیے تجربات کیے جانے لگے۔

آٹھویں اور گیارھویں صدیوں کے دوران مسلمانوں نے اپنے تئیں مطالعۂ فطرت میں جذب کر دیا۔ انھوں نے ارسطو کے نظریۂ سائنس کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا، جس کی اساس خالص استقرائی منطق پر تھی۔ ریاضیات میں الخوارزمی نے الجبرا دریافت کیا اور ٹرگنومیٹری کی جدولیں تیار کیں۔ صفر سے ۹ تک کے ہندسے جو نظامِ اعشاریہ کی بنیاد ہیں اور آج کے جدید کمپیوٹر بھی انھی کی مدد سے کام کرتے ہیں —— اگرچہ ہندوؤں کی دریافت ہیں لیکن الکندی اور اس کے پیروؤں نے انھیں اس کثرت سے استعمال کیا کہ وہ عربی ہندسے کہلانے لگے۔

عرب ماہرینِ طبیعیات وقت ناپنے کے لیے پنڈولم اور درجۂ حرارت معلوم کرنے کے لیے تھرمامیٹر کا استعمال جانتے تھے۔ فلکیات میں البطانی، ابولوفا اور محمد بن موسیٰ نے ایسی راہیں نکالیں کہ کوپرنیکس اور نیوٹن نے ان پر چل کر نئے جہاں پیدا کیے۔ اس میں کیا شک ہے کہ آج کی تمام ترطبّی ترقی اس عظیم اور اچھوتے طبیب کی مرہونِ منّت ہے، جسے دنیا الرازی کے نام سے پہچانتی ہے اور جس نے طب کی بنیاد استوار کی۔ ترقی کی یہ رفتار یونہی جاری رہ سکتی تھی لیکن مذہبی تعصب، عدمِ مفاہمت اور تقلید پسندی کے غلط رجحانات نے مسلمانوں کا یہ زرّیں عہد ختم کر دیا، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ سائنسی طریقوں نیز ٹیکنالوجی کا ارتقا سراسر ان کی کاوشوں کا مرہونِ منّت ہے۔

یورپ نے اِسی خرمن سے چند خوشے چُنے۔ احیائے علوم کی تحریک سے اب تک وہاں سائنس اور ٹیکنالوجی نے غیر معمولی ترقی کی ہے جس کا ظہور مشرقِ بعید میں جاپان سے لے کر مغرب میں شمالی امریکا تک نظر آتا ہے۔ رابرٹ بریفالٹ اپنی کتاب " دی میکنگ آف ہیومینٹی" میں

لکھتے ہیں:

"...اگرچہ یورپین زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس پر اسلامی ثقافت اثر انداز نہ ہوئی ہو لیکن یہ اثر جدید عالم کی اِس عظیم قوت میں سب سے زیادہ جلوہ گر نظر آتا ہے، جسے ہم نیچرل سائنس کہتے ہیں۔"

مسلمانوں کے زرّیں دور کی طرح یورپ میں بھی سائنس فرمانرواؤں کی سرپرستی میں پروان چڑھی۔ تین سو سال سے زیادہ عرصہ گزرا کہ شاہِ انگلستان نے سائنس کی اہمیت جانی پہچانی، اور رائل سوسائٹی قائم کی۔ اس مقصد کے لیے ایک چارٹر جاری کیا گیا، جس نے سائنسدانوں کو اپنے اپنے شعبے میں تحقیقات کرنے کی پوری آزادی بخش دی۔ جیسے جیسے انسان کی واقفیت اور قوانینِ قدرت کی دانست میں اضافہ ہوا، سائنس رفتہ رفتہ ٹیکنالوجی کی شکل اختیار کرتی گئی حتیٰ کہ اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں صنعتی انقلاب آگیا جس میں انگلستان نے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔

اس انقلاب نے مغرب کی صرف اقتصادیات ہی کی کایا پلٹ نہیں کی بلکہ تاریخ کا دھارا بدل ڈالا۔ لڑائیوں میں ہار جیت کا انحصار فوجوں اور سپاہیوں کی تعداد پر نہ رہا، بلکہ سائنس اور ٹیکنالوجی پر قرار پایا۔ صرف وہی ملک فاتح اور ظفریاب کہلائے جنھوں نے ٹیکنالوجی اور سائنس میں ترقی کی اور اسے اپنے مفاد کے لیے استعمال کیا۔ سائنس اور ٹیکنالوجی نے یوروپین قوتوں کو بہتر سے بہتر اسلحہ دیا، جس کے سامنے ایشیا اور افریقہ کی قدیم سلطنتیں بےبس ہوگئیں۔ ان سلطنتوں کے نشان رفتہ رفتہ مٹتے چلے گئے۔ اہلِ یورپ نے نئے برّاعظم اور زروسیم کے نئے وسائل و ذرائع دریافت کیے۔ سائنس کا استعمال عام ہوا تو غربت، بیماری اور بھوک کا قلع قمع ہونے لگا۔ تمام ممالک خواہ وہ بڑے تھے یا چھوٹے، خواہ ان کی آبادی کم تھی یا زیادہ، ان کے وسائل محدود تھے یا لامحدود ـــــ سب کا معیارِ زندگی بلند ہونے لگا اور ایسے معاشروں کی داغ بیل پڑی جو درجہ بندی کی لعنت سے پاک تھے۔ اکثریت پر اقلیت کا ظلم رفتہ رفتہ ختم ہونے لگا۔ تحریر و تقریر اور تخیّل کی آزادی نے جمہوریت کو فروغ دیا اور دنیا کے بہت سے ملکوں میں نمائندہ حکومتیں بننے لگیں۔

سائنس اور ترقی

صنعتی انقلاب کا سیلاب ایسی تندی و تیزی سے آگے بڑھا کہ جتنی سائنس اور ٹیکنالوجی سے ہم اس وقت واقف ہیں اس کا نوّے فی صد حصّہ موجودہ صدی کے ساٹھ سال پر محیط ہے۔ سائنس نے ہمیں وہ دانش اور وہ آلات عطا کیے ہیں کہ ہم ان سے دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی

کے لیے غذائیں تلاش کر سکتے ہیں۔ ہم دریاؤں کا رُخ موڑ سکتے ہیں اور ریگستانوں کو مسکراتے ہوئے نخلستانوں میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ وبائی بیماریوں اور تکلیف دہ جراثیم اور کیڑے مکوڑوں کا خاتمہ کرنے کے لیے ہمارے پاس نہایت موثر دوائیں اور کیمیائی اشیا موجود ہیں۔

نہ صرف یہ بلکہ صنعت و حرفت کے فروغ کے لیے قوت حاصل کرنے کی غرض سے ہم جوہری توانائی استعمال کر سکتے ہیں۔ یہ نئی توانائی ہمارے راکٹوں کو مائل بہ پرواز کر کے ہمیں خلائے ناپیدا کنار کی سیر بھی کرا سکتی ہے اور ہمیں دوسرے جہانوں پر اتار سکتی ہے۔ ہم ایک سکنڈ سے بھی کم وقفے میں سینکڑوں ہزاروں میل دور بیٹھے ہوئے کسی بھی شخص کے ساتھ بات چیت کر سکتے ہیں، جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کی بدولت ہم چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی چیز تیار کر سکتے ہیں، خواہ وہ ایک قلم ہو یا موٹر کار، چولھا ہو یا ریفری جریٹر، پلاسٹک کا پیالہ ہو یا نائیلون کے دل کش ملبوسات۔

چوں کہ سائنس کے قوانین پوری دنیا میں ایک ہی ہیں، اِس لیے سائنس اور ٹیکنالوجی پر کسی ایک ملک یا قوم کی اجارہ داری تسلیم نہیں کی جا سکتی۔ مغرب میں یورپ، کناڈا اور ریاست ہائے متحدہ امریکا نے اپنے عوام کا معیارِ زندگی بلند کرنے کے لیے سائنس اور ٹیکنالوجی سے خاطر خواہ مدد لی ہے۔ یہی صورت شمال میں روس اور جنوب میں آسٹریلیا میں ہے لیکن مشرق میں صرف جاپان کو یہ شرف حاصل ہوا۔ کوئی وجہ نہیں کہ چین، ہندستان، پاکستان اور ایشیا، افریقہ نیز لاطینی امریکا کے ترقی پذیر ممالک ایسا نہ کر سکیں۔ چین نے جس طرح ترقی کی ہے وہ محتاجِ تعارف نہیں۔ دوسرے ممالک بھی اس کی تقلید کر سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ان ملکوں کو اپنی بقا منظور ہے تو انھیں خوابِ غفلت سے بیدار ہونا پڑے گا اور عالمی تغیر کے چیلنج کا مقابلہ کرنا ہوگا۔

کچھ عرصہ ہوا اقوامِ متحدہ کے زیرِ اہتمام ایک بڑی کانفرنس منعقد ہوئی تھی، جس کا مقصد یہ معلوم کرنا تھا کہ دنیا کے کم ترقی یافتہ ملکوں کو فائدہ پہنچانے کے لیے سائنس اور ٹیکنالوجی کو کیسے استعمال کیا جائے؟ اس کانفرنس میں مختلف ملکوں کے ممتاز سائنس داں، منتظمین، ماہرینِ اقتصادیات اور صنعت کار شریک ہوئے۔ بہت کچھ بحث و تمحیص کے بعد تمام شرکا اس اس امر پر متفق ہوئے کہ سائنس کا اطلاق کم ترقی یافتہ ملکوں کے نہ صرف بس میں ہے، بلکہ وہ جدید ذرائع سے خوش حالی حاصل کرنے کے لیے مختصر راہ استعمال کر سکتے ہیں۔ اگر کم ترقی یافتہ ملکوں کی حکومتیں سائنس کے استعمال پر زور دیں اور اسے اپنے پروگراموں میں اوّلیت بخشیں تو انھیں خرام روی سے نجات مل جائے گی اور وہ ایک ہی جست میں جدید دور میں داخل ہو جائیں گے۔

یہ لوگ چاہیں تو عام والو کی جگہ ٹرانزسٹر اور زراعت کے دقیانوسی طریقوں کے بجائے بیجوں کو گاما شعاعوں کے ذریعے بہتر اور محفوظ بنا سکتے ہیں۔ اپنی قدیم تہذیبوں کا عرصہ معلوم کرنے کے لیے اب انھیں شمسی نقوش پر بھروسا کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ وہ کاربن کے جدید طریقے سے مدد لے کر آثارِ قدیمہ کی عمر دریافت کر سکتے ہیں۔ اگر کوئی ملک ایسا ہے کہ وہاں سڑکیں بنانا مشکل ہے تو ہوائی جہاز ذریعۂ حمل و نقل بن سکتا ہے۔ اگر سینکڑوں میل تک تاروں کا جال نہیں پھیلایا جا سکتا تو ٹیلیفون کے بجائے وائرلیس استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اگر کوئلہ اور تیل جیسے روایتی ایندھن پر بہت زیادہ لاگت آتی ہے تو جوہری توانائی سے مدد لی جا سکتی ہے۔

ترقی کے عبوری دور میں اِن ملکوں کو قدیم اور جدید دونوں طرح کے ذرائع سے مدد لینی پڑے گی۔ یعنی ایک ہی وقت میں ان کے پاس بیل گاڑی بھی ہوگی اور بوئنگ بھی، ایک ہی گاؤں میں رہٹ بھی ہوگا اور ٹیوب ویل بھی، کوئلے یا گیس سے چلنے والا جنریٹر بھی ہوگا اور ایٹمی پلانٹ بھی اور ایک ہی زمین پر اپلوں کی کھاد بھی ڈالی جائے گی اور کیمیائی کھاد بھی۔ ظاہر ہے کہ ایسے ملک کو اپنے محدود ذرائع اور وسائل کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے بڑی احتیاط سے منصوبہ بندی کرنی پڑے گی اور مختلف پروگراموں کو ان کی اہمیت کے مطابق اوّلیت اور فوقیت دینی ہوگی لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جنیوا میں جس سائنس اور ٹیکنالوجی کا ذکر ہوا، کیا ترقی پذیر ممالک اپنے داخلی مسائل کے باوجود اس سے مستفید ہو سکتے ہیں اور کیا وہ ایک معقول عرصے میں ایسا معیارِ زندگی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے، جو دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں کا مقابلہ کر سکے؟ آج ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکا کے عوام، جو دنیا کی دو تہائی آبادی سے زیادہ ہیں، اس سوال سے براہِ راست واسطہ رکھتے ہیں۔ ان ملکوں میں سالانہ آمدنی کا فی کس اوسط ۱۰۰ ڈالر سے بھی کم ہے، جب کہ شمالی امریکا میں یہی اوسط ۲۰۰۰ ڈالر ہے۔ قحط، بیماری اور افلاس کا خنجر ان اوّل الذکر ممالک میں پیوست ہے، لہٰذا یہ کسی ایک ملک کا مسئلہ نہیں، بلکہ پوری دنیا کا مسئلہ ہے۔ آج جب کہ فاصلوں نے اپنا مفہوم کھو دیا ہے اور زمان و مکان کی وسعتیں سمٹتی جا رہی ہیں تمام ممالک ایک مختصر سی دنیا میں مرکوز ہو کر رہ گئے ہیں۔ دنیا بھر کی دولت صرف ایک تہائی حصۂ ارض کے ہاتھ میں ہے اور باقی دو تہائی حصّہ افلاس کے شکنجے میں کسا ہوا ہے۔

صنعتی انقلاب کے بعد انگلستان میں پھیلے ہوئے حالات کے متعلق ڈِسرائیلی نے لکھا تھا:

"دو طبقے ایک ساتھ رہ رہے ہیں ــــــــ ایک وہ جو دولت میں کھیلتا ہے اور دوسرا وہ جو بے انتہا غریب ہے۔" آج ساری دنیا میں یہی حالات موجود ہیں، لہٰذا انھیں ایک عالمی مسئلے کی طرح سنبھالنا ہوگا۔ اِس مسئلے کو حل کرنے کے لیے دنیا بھر کے مالی، مادّی اور انسانی

وسائل سے کام لینا ہوگا۔ سب مل کر ہی دُنیا سے ناداری، بیماری اور قحط دور کر سکتے ہیں۔
آیئے سب سے پہلے مالی وسائل پر غور کریں جو اِس بین الاقوامی سعی کے لیے دستیاب ہو سکتے ہیں:
اقوامِ متحدہ کے مرتب کردہ اعداد و شمار کے مطابق اس وقت دنیا کے ممالک ہر سال ۱۲۰ ارب ڈالر اسلحہ کی خرید پر صَرف کرتے ہیں۔ یہ رقم تمام کم ترقی یافتہ ملکوں کی قومی آمدنی کے دو تہائی حصّے کے برابر ہے۔ گزشتہ دس سال کے عرصے میں اسلحہ پر جتنی رقم خرچ کی گئی اتنی رقم پچھلے تین سو سال میں بھی تعلیم پر صرف نہیں کی گئی۔ اس سے بھی زیادہ حیرت ناک بات یہ ہے کہ اس فضول خرچی میں دنیا کے صرف سات ممالک ۸۵ فی صد تک ذمے دار ہیں یعنی کینا ڈا، مغربی جرمنی، فرانس، چین، روس، برطانیہ، اور ریاست ہائے متحدہ امریکا۔ اگر یہ غیر معمولی رقم اگلے دس سال کے دوران ترقی پذیر ممالک کی طرف بڑھا دی جائے تو ان کی فی کس آمدنی تین گنی ہو جائے اور افلاس کا یہ سایہ جو ہم اپنے گردو پیش بڑھتا دیکھ رہے ہیں مستقبل کے تاریخ دانوں کے لیے پیچھے رہ جائے۔
انسان نے تخریب کے کیا کیا ذرائع ایجاد کیے ہیں۔ اس کا اندازہ اس حقیقت سے ہو سکتا ہے کہ میزائل اور ان کے ایٹمی ہتھیار ایک بٹن دبانے ہی چند منٹ کے اندر ساری دُنیا کو ایک عظیم جہنم میں تبدیل کر دیں گے اور کوئی نہ ہوگا جو اس تماشے کو دیکھ سکے، الغرض دُنیا کی متموّل اقوام اپنے وسائل انسانیت کو تباہ کرنے کے لیے خرچ کرنے کو تو تیار رہتی ہیں لیکن اسے افلاس و ناداری کے قعر سے نکالنے کو آمادہ نظر نہیں آتیں۔ وہ ٹیکس ادا کرنے والے کی خون پسینے کی کمائی بغیر کسی حجت کے نصف گھنٹے کی دیوانگی پر تو صَرف کر دیں گی لیکن خوشحالی کی ایک پوری صدی پر نہیں۔ وہ صرف اپنے وقار کی خاطر انسان کو چاند پر اتارنے کی دوڑ جیتنے کے لیے پورے تیس ارب ڈالر صَرف کرنے کو تیار ہیں لیکن اس کا عشرِ عشیر بھی بیرونی امداد کے طور پر خرچ کرنا ہو تو اس پر بحث مباحثہ شروع ہو جاتا ہے۔
جب تک امیر تر اقوام کے دماغ اس فرق کو نہ سمجھیں گے اور انسان کے متعلق ان کی اخلاقی اقدار میں بہتری کے آثار پیدا نہیں ہوں گے، اس وقت تک اسلحہ کی دوڑ ختم نہیں ہوگی۔ ہمارے جیسے ممالک فنی امداد کے عوض ان اقوام کو روحانی درس دے سکتے ہیں۔ مجھے اس میں کوئی شبہ نظر نہیں آتا کہ جیسے جیسے ہماری تہذیب میں روحانیت کے ساتھ ساتھ مادّیت کا عنصر شامل ہوتا جائے گا اور دنیا کی اقوام کے مابین مفاہمت بڑھتی جائے گی۔ ایک ہی صدی تو گزری ہے کہ ان ترقی یافتہ اقوام کے افراد ذاتی جھگڑا طے کرنے کے لیے ڈوئل لڑتے تھے۔ کیا اب ہم اس حماقت پر ہنستے نہیں ہیں؟ کون کہہ سکتا ہے کہ ہمارے پوتے اور پڑپوتے موجودہ رہبروں پر نہیں ہنسیں گے، جو صرف،

یہ طے کرنے کے لیے کہ زندگی گزارنے کے واسطے یہ نظام بہتر ہے یا وہ ——— کروڑوں ڈالر محض اسلحہ خریدنے پر صَرف کر رہے ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ بات چیت سے کسی بھی قِسم کے مسائل طے کرنا میدانِ جنگ میں لڑنے اور ایٹمی راکٹ استعمال کرنے کے مقابلے میں کہیں زیادہ آسان اور ارزاں طریقہ ہے۔ ممکن ہے آنے والی نسلیں باہمی اختلافات طے کرنے کے لیے اس سے بھی بہتر کوئی طریقہ تلاش کرلیں۔ امن و ترقیٔ عالم کا دارومدار اسی امید پر ہے۔

جب تک اسلحہ کی دوڑ ختم نہ ہو اس وقت تک متمول اقوام کو کیا کرنا چاہیے؟ کیا انھیں چُپ چاپ ہماری غربت کا تماشا دیکھنا چاہیے یا انسانیت کی لاج رکھنے کے لیے اسے دُور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے؟ ہمیں بتایا جا رہا ہے کہ اگر دنیا کے کم ترقی یافتہ ممالک اپنی قومی آمدنی کا دس فی صد حصّہ بچا کر نفع بخش منصوبوں میں لگائیں تو اس میں ہر سال ۲ فی صد کا اضافہ ہو سکتا ہے لیکن آبادی تو ہر سال ۲ فی صد سے بھی زیادہ شرح کے ساتھ بڑھتی جارہی ہے۔ ان حالات میں ان غریبوں کو فی کس آمدنی کا اوسط۔۔اڈالر سے بھی کم سے۔۔۔۲ڈالر تک لے جانے میں کتنا عرصہ لگے گا؟

ایک اور اقتصادی پہلو بھی قابلِ غور ہے۔ کم ترقی یافتہ ملکوں کی اکثریت خام مال پیدا کرتی ہے جسے برآمد کر کے زرِ مبادلہ کماتی ہے۔ بدقسمتی سے اس مال کی قیمت میں غیر معمولی کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ اگر ۱ فی صد کی بھی کمی واقع ہو جائے تو متعلقہ ملک کے کمائے ہوئے زرِ مبادلہ میں اتنا خسارہ آجائے گا کہ بیرونی امداد یا قرضوں کا نصف حصّہ بمشکل تمام اس کی تلافی کر سکے گا۔ اس کا تقابل اس رقم سے کیجیے جو متموّل اقوام اسلحہ کے بھاری سَودوں کے باوجود غریب اقوام کے لیے بچا سکتی ہیں۔ اگر مشرق و مغرب مل کر اپنی قومی آمدنی کے ایک فی صد حصّے سے کچھ زیادہ رقم یک جا کریں تو ہر سال ۱۵ ارب ڈالر کا ایک فنڈ تعمیر ہو سکتا ہے جسے دنیا کے کم ترقی یافتہ ممالک میں لگایا جا سکتا ہے۔ یہ رقم ان مشینوں اور ساز و سامان کی قیمت کی دوگنی ہے جو دنیا کے تمام ترقی یافتہ ممالک درآمد کرتے ہیں۔

اگر اتنی رقم ہر سال ان ملکوں میں لگتی رہے تو کہیں پچاس سال میں ان کی فی کس آمدنی اتنی ہوگی جتنی آج کے صنعتی ممالک کے باشندوں کے حصّے میں آئی ہے۔ اگر اسلحہ کی دوڑ ختم ہو جائے تو یہ عرصہ مزید کم ہو سکتا ہے اور اکیسویں صدی ہی میں دنیا کے ایک گوشے سے لے کر دوسرے گوشے تک کا انسان احتیاج سے بے نیاز ہو جائے۔ کیا ہم دیوانگی ترک کر کے بین الاقوامی تعاون سے اس دنیا کو جو آج جہنم بنی ہوئی ہے جنّت نہیں بنا سکتے؟ کیا متمول اقوام دوسروں کی امداد کو اٹھیں گی یا اپنی مجرمانہ ذہنیت کے بوجھ تلے دبی رہیں گی اور یونہی مر جائیں گی؟ انھیں ٹھنڈے دل سے ان حقائق پر غور کرنا چاہیے اور اپنی پارلیمنٹ یا کانگریس میں اس

تھوڑی سی رقم پر بحث نہیں کرنی چاہیے جو وہ ایک شریفانہ مقصد کے لیے خرچ کرتی ہیں، یعنی صفحۂ ارض سے افلاس، بھوک اور بیماری کا مٹانا۔ سائنس اور ٹیکنالوجی ہماری دسترس میں ہیں۔ اب ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ ہم انھیں تعمیر کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں یا تخریب کے لیے!

سائنس اور پاکستان

کم ترقی یافتہ ملکوں کی اقتصادیات میں صرف بیرونی امداد سے کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی۔ ترقی کے لیے سیاسی استحکام، عمدہ انتظامات اور تربیت یافتہ عملے نیز قدرتی وسائل ضروری ہیں اور جہاں یہ عوامل میسر نہیں وہاں بیرونی مالی امداد اور سائنس اور ٹیکنالوجی سے کما حقہٗ استفادہ کرنے میں ممد ثابت نہیں ہو سکتی۔ ہر ملک کو اپنے حالات کی روشنی میں اس پہلو پر غور کرنا ہوگا۔ میں یہاں اسے اپنے ملک پاکستان کے لحاظ سے بیان کروں گا۔

میں نے اب تک جو کچھ کہا ہے اس سے آپ کو اس سوال کا جواب مل گیا ہوگا کہ "ہمارے معاملات میں سائنس کو اہمیت کیوں دی جائے؟" اگر ہم غربت و افلاس کے اس بوجھ سے آزاد ہونا چاہتے ہیں جو صدیوں کی غلامی نے ہم پر مسلط کیا ہے تو ہمیں سائنس اور ٹیکنالوجی کو وسیع پیمانے پر رواج دینا ہوگا لیکن صرف اتنا سمجھ لینا کافی نہیں۔ سائنس کی اہمیت تسلیم کرنا ایک بات ہے اور سائنسی رجحان رکھنا قطعی دوسری بات ہے۔ جب تک ہم غربت کو ختم کرنے کے لیے سائنس سے وہی کام نہ لیں گے جو کفر و الحاد کے خلاف جہاد کرتے وقت تلوار سے لیا جاتا ہے اس وقت تک ہم زندگی کی بازی نہیں جیت سکتے۔ یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہو سکتا جب تک ہمارے معاشرے کا ہر طبقہ اس کام میں معاونت نہ کرے اور حکومت اس کی سربراہی اور سرپرستی نہ کرے۔

اس "جہاد" کی بنیاد تین عوامل پر ہونی چاہیے۔ سب سے پہلے تو ہمیں پاکستان کو 'دریافت' کرنا چاہیے۔ ہمیں اپنے قدرتی وسائل اور اپنے مسائل کا جائزہ لینا چاہیے۔ دوم ہمیں زراعت، صنعت و حرفت، فن کان کنی اور طب و صحت کے میدانوں میں موجودہ سائنسی و ٹیکنالوجی معلومات و ایجادات کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں استعمال کرنا چاہیے اور ان سے کسی قسم کا تعصب نہیں برتنا چاہیے۔ سوم ہمیں صرف اُن موضوعات پر ہی تحقیقات نہیں کرنی چاہیے جن کا تعلق صرف پاکستان سے ہے بلکہ ان موضوعات پر بھی توجہ دینی چاہیے، جن کا تعلق پوری دنیا سے ہے اور جن کی وضاحت سائنس کی سرحدوں کو بحیثیت مجموعی وسعت بخشے گی۔ اگر ہم اپنے مفکروں اور سائنس دانوں کو سائنسی مساعی کے صلے میں صفِ اوّل

میں جگہ نہیں دیں گے تو ٹیکنالوجی کو فروغ حاصل نہیں ہوگا۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے سدابہار دماغ قوم کو نئے خیالات اور نئے موضوعات دیں گے۔ جو قوم غور و خوض کرنا ترک کر دیتی ہے وہ صفحہ ہستی سے مٹ جاتی ہے۔

پاکستان کی دریافت

پاکستان میں اس وقت تقریباً بارہ کروڑ نفوس آباد ہیں۔ مشرقی پاکستان کی آبادی ۶ کروڑ ۷۷ لاکھ اور باقی مغربی پاکستان کی آبادی ہے۔ آبادی میں ہر سال تقریباً تین فی صد اضافہ ہو رہا ہے۔ پاکستان کے ان دونوں صوبوں کے درمیان ایک ہزار میل سے زیادہ طویل ہندوستانی علاقہ حائل ہے۔ دونوں حصّوں کے باشندوں کی غذا اور معاشرت بڑی حد تک مختلف ہیں، کیوں کہ اِن حصّوں کی آب و ہوا، جغرافیائی حالات، زبان ـــــ سب ہی چیزیں مختلف ہیں۔ جب ایک عام انسان دونوں صوبوں کا دورہ کرتا ہے تو یہ کہے بغیر نہیں رہتا کہ

"مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب ہے اور یہ دونوں کبھی نہیں مل سکتے۔"

لیکن وہ یہ بھول جاتا ہے کہ مذہبی اشتراک اور روحانی یکسانیت تمام جغرافیائی بندشوں اور تفریقات پر حاوی آجاتی ہیں۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے باشندوں کے دلوں میں وحدت اور اتّفاق کی جو شمع روشن ہے اس نے اس قسم کے ظاہری اختلافات کی تاریکی دور کر دی ہے۔ اگر علاقائی اتصال ہی قومی سالمیت کی واحد شرط ہے تو پھر یورپ مشترک ثقافت، مشترک تاریخ اور کہیں کہیں واحد زبان بولے جانے کے باوجود اتنے ملکوں میں کیوں بٹا ہوا ہے۔ کینیڈا اور ریاست ہائے متحدہ امریکا الگ الگ کیوں ہیں؟ الاسکا اور ہوائی امریکا کی ریاستیں کس طرح بن گئیں جبکہ ان کے درمیان دو ہزار میل کا فاصلہ حائل ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ ان کی آب و ہوا، باشندوں کی عادات، زبان، ثقافت ـــــ سب ہی چیزیں مختلف ہیں!

ہم پھر اپنے ملک کی طرف واپس آتے ہیں۔ پاکستان کا رقبہ انگلستان، فرانس، بلجیم، ہالینڈ، آسٹریا اور سوئٹزرلینڈ کے مجموعی رقبے سے زیادہ ہے۔ ہمارا نظامِ آب پاشی دنیا میں سب سے بڑا ہے۔ ہمارے ہاں تین اہم ریشے یعنی جوٹ، کپاس اور اون افراط سے پیدا ہوتے ہیں۔ ہمارے معدنی وسائل ابھی تک خوابیدہ پڑے ہیں، لیکن جتنی معدنیات ہم نے اب تک دریافت کی ہیں ان میں قدرتی گیس، چونے کا پتّھر، نمک، جپسم اور سلیکا سب سے زیادہ ہیں۔ ان کے علاوہ ہمارے ملک میں کرومیم، لوہے، تانبے، یورینیم اور سیسے کے ذخائر کے علاوہ بعض ایسی

معدنیات بھی موجود ہیں، جن کے حصول اور تجزیے کے لیے جدید سائنسی ذرائع اور تفصیلات کی ضرورت ہے۔ یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ ہمارے اوپر ہوا اور سامنے سمندر موجود ہے، جن سے صنعت و حرفت کے بعض بنیادی اجزا حاصل ہو سکتے ہیں۔ چھوٹی موٹی مشینیں اس نئی توانائی سے آسانی سے چلائی جا سکتی ہیں۔

ان تمام ذرائع کے علاوہ جوہری توانائی بھی ہمارے قریب ہے۔ ہم اس کی مدد سے نہ صرف سمندر کے نمکین پانی کو تازہ، شیریں پانی میں تبدیل کر کے اسے آب پاشی اور عام استعمال کے قابل بنا سکتے ہیں، بلکہ اس سے بعض قیمتی معدنیات بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ ہمارے عہد کے ایک ممتاز ماہرِ طبیعیات آرتھر کومپٹن کے بقول جوہری توانائی ہمارے گھروں اور کارخانوں کی تاریکی ہی دور نہیں کرے گی بلکہ موجودہ صدی ختم ہونے تک وہ اتنی ارزاں ہو جائے گی کہ اس کی مدد سے سونا چاندی اور دوسری دھاتیں افراط سے حاصل کی جا سکیں گی۔ اُس وقت یہ دھاتیں سستی ہو کر اسی منزل پر آجائیں گی، جس پر آج لوہا اور تانبا ہیں۔

ہمارے جنگلات بانس اور انواع واقسام کے دوسرے درختوں کے علاوہ طرح طرح کی گھاس سے اَٹے پڑے ہیں، جن سے کاغذ اور ریان کثرت سے تیار کیا جا سکتا ہے۔ یہ جنگلات پانچ کروڑ ساٹھ لاکھ ایکڑ رقبے پر چھائے ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ ہمارے پاس تقریباً آٹھ کروڑ ساٹھ لاکھ ایکڑ قابلِ کاشت زمین موجود ہے، لیکن اس میں سے صرف چھے کروڑ بیس لاکھ ایکڑ پر کاشت ہوتی ہے۔ ان اعداد و شمار سے آپ کو اندازہ ہو سکتا ہے کہ پاکستان میں قدرتی وسائل کی کمی نہیں۔ ہم اس معاملے میں دنیا کی بہت سی دوسری اقوام سے زیادہ خوش قسمت ہیں۔ ہمارے پاس زرعی اور معدنی وسائل اتنی مقدار میں موجود ہیں کہ وہ ہماری بڑھتی ہوئی آبادی کا بار برداشت کر سکتے ہیں۔

ان وسائل کے باوجود ہم کہاں کھڑے ہیں؟ ہمارے ہاں پیداوار کا فی ایکڑ اوسط دنیا میں تقریباً سب سے کم ہے۔ آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ ریاست ہائے متحدہ امریکا کی صرف تین فی صد آبادی زراعت کے پیشے سے متعلق ہے۔ اس کے باوجود وہ لوگ اتنا غلہ پیدا کر لیتے ہیں کہ نہ صرف اپنی تقریباً بیس کروڑ آبادی کا پیٹ بھرتے ہیں، بلکہ آٹھ ارب ڈالر مالیت کا غلہ بچ بھی جاتا ہے، جو دنیا کے دوسرے ملکوں کے کام آتا ہے۔ ہماری ۸۵ فی صد آبادی کاشت کاری کرتی ہے، پھر بھی ہم غذا کے معاملے میں خود کفیل نہیں ہیں۔ ہماری خوراک بھی اتنی سادہ ہے کہ اوسطاً ہر شخص کو صرف ڈیڑھ ہزار حرارے (کیلوری) ہر روز میسر آتے ہیں۔ سیم اور تھور کی وجہ سے ہماری زرخیز زمین کا تقریباً ڈیڑھ لاکھ ایکڑ رقبہ ہر سال بیکار

ہو جاتا ہے۔ ہماری فی کس آمدنی کا اوسط دنیا میں کم ترین شمار ہوتا ہے اور ہمارے ہاں اوسطاً ہر سال ایک فرد کو ۳۴ یونٹ بجلی میسر آتی ہے جب کہ ناروے کا ہر شخص ...۷، امریکا کا ہر شخص ... ۵، ہر انگریز ۲۰۰۰ اور ہر جاپانی تقریباً ..۹ یونٹ بجلی صرف کرتا ہے۔

جہاں تک طب و صحت کا تعلق ہے، کوئی مہلک مرض ایسا نہیں ہے، جو ہمارے ہاں نہ پایا جاتا ہو۔ ہماری آبادی کا ایک اچھا خاصا حصّہ دق و سل میں گرفتار ہے۔ اس کے علاوہ برص، سرطان، آنکھوں کی بیماریاں اور گرم آب و ہوا سے پیدا ہونے والے کتنے ہی دوسرے امراض جان لیوا ثابت ہوتے ہیں۔ پھر ہر سال ہزاروں آدمی سیلابوں اور قحط کی وجہ سے بے گھر ہو جاتے ہیں۔ ان آفاتِ ارضی و سماوی کے باوجود ہماری آبادی دو فی صد سے زیادہ شرح کے ساتھ بڑھتی جا رہی ہے۔ لکھنے پڑھنے والوں کی تعداد سولہ فی صد سے زیادہ نہیں۔ صرف چند شہروں کی چمک دار روشنیاں خوبصورت دکانیں اور فلک بوس عمارتیں تاریکی کے ان طویل سایوں کو دور نہیں کر سکتیں جو ہمارے دیہی علاقوں پر محیط ہوتے جا رہے ہیں۔

ہم نے اپنی آزادی کے گزشتہ بیس سال کے دوران میں ان مسائل کا مقابلہ ہمّت، عزم اور پامردی کے ساتھ کیا ہے اور بہت سی مشکلات اور رکاوٹوں کے باوجود ہماری ترقی کی رفتار حیرت ناک رہی ہے۔ ۱۹۴۷ء میں ہمارے ہاں پرائمری اسکولوں کی تعداد ۳۷،۴۵ رکھی، جو بڑھ کر ۱۹۶۰ء میں ..۵۷،۴ ہو گئی۔ اسی حساب سے طلبا کی تعداد ۳۱ لاکھ سے بڑھ کر ۵۵ لاکھ کو پہنچ گئی۔ حصولِ آزادی کے وقت ہمارے حصّے میں تین یونی ورسٹیاں آئی تھیں لیکن اب ان کی تعداد دس ہے، جن میں سے چار ٹیکنیکل یونی ورسٹیاں یعنی دو زراعت کی اور دو انجینئرنگ کی ہیں۔ ہماری صنعتی پیداوار کئی گنا بڑھ چکی ہے اور اگر مزید زرِ مبادلہ دستیاب ہو تو اور بڑھ سکتی ہے۔ اب ہمارے ملک میں ہر طرح کے کپڑے سے لے کر بہت سی مشینوں تک انواع و اقسام کی چیزیں بنائی جا رہی ہیں۔ ہماری بعض مصنوعات دوسرے ملکوں میں اس درجہ مقبول ہیں کہ ہمارے کمائے ہوئے زرِ مبادلہ کا چوتھائی حصّہ ان ہی کا مرہونِ منّت ہے۔

اِس مختصر عرصے میں ہم نے متعدّد ڈیم، بیراج اور نہریں تعمیر کی ہیں، جن سے نہ صرف لاکھوں ایکڑ زمین سیراب ہو رہی ہے بلکہ بجلی بھی کثیر مقدار میں پیدا کی جا رہی ہے۔ ملک میں سینکڑوں میل لمبی نئی سڑکوں کا جال بچھایا گیا ہے۔ اِسی کے ساتھ بحری اور ہوائی سفر میں بھی قابلِ قدر ترقی ہوئی ہے۔ ریڈیائی مواصلات کی ترقی بھی کسی کی نظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔

زراعت اور طب میں ہم جوہری توانائی پہلے ہی استعمال کر رہے ہیں اور مزید برقی قوت فراہم کرنے کے لیے جوہری ری ایکٹر بھی لگائے جا رہے ہیں۔ ہم نے بہت سے تجرباتی راکٹ چھوڑے ہیں۔ اس طرح ہمارا ملک خلائی دور میں بھی داخل ہو چکا ہے۔

ان کامیابیوں پر کوئی بھی قوم بجا طور پر فخر کر سکتی ہے، لیکن ہمارے ان تمام منصوبوں میں سائنسی عنصر کہیں نظر نہیں آتا۔ ہمارے سول حکام اور نجی صنعت کار ترقی کے ان تمام پروگراموں کو سائنسی واقفیت اور تجربے کے ساتھ کہیں زیادہ کامیابی سے چلا سکتے تھے۔ ہمارے منتظمین اپنی "کارکردگی" دکھانے کے لیے اور صنعت کار زیادہ منافع کمانے کی غرض سے غیر ملکی "مشیروں"، "ماہرین" اور "ایڈوائزروں" کی خدمات حاصل کرتے ہیں جن کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ درآمد شدہ مشینوں کو اپنی نگرانی میں نصب کرا دیتے ہیں۔ اکثر صورتوں میں ایسے منصوبے تکمیل کے بعد بھی غیر ملکی "ماہرین" کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں۔ اس کے بعد پاکستانی کارکنوں کی باری آتی ہے اور وہ کچھ تربیت حاصل کرتے ہیں۔ اس طرح ان منصوبوں پر نہ صرف بہت زیادہ لاگت آتی ہے بلکہ قومی وسائل کا ضیاع بھی ہوتا ہے۔

کون نہیں جانتا کہ مالی سال ختم ہونے کے خوف سے جلدی جلدی کوئی سڑک یا کوئی عمارت مکمل کر دی جاتی ہے، لیکن بارشوں کا موسم آتے ہی وہ کٹ پھٹ کر ملبے کا ڈھیر بن جاتی ہے۔ محکمۂ مال اس کی مرمت اور دیکھ بھال کے لیے دوبارہ بھاری رقوم مختص کرتا ہے۔ محکمۂ تعمیرات عامّہ بھی اِس سلسلے کو برقرار رکھنے میں خوشی محسوس کرتا ہے۔ اگر ہمارے ہاں کوئی تحقیقاتی شعبہ ایسا ہو، جس میں مختلف علاقوں کی مٹی اور وہاں دستیاب ہونے والے مسالے پر تحقیقات ہو سکیں تو ہم وقت اور رُپے کے اس غیر معمولی زیاں سے بچ سکتے ہیں۔

یہ اجتماعِ ضدّین نہیں تو اور کیا ہے کہ ایک نہایت وسیع اور مضبوط نہری نظامِ آب پاشی رکھنے کے باوجود ہمارے پاس کوئی تحقیقاتی ادارہ ایسا نہیں جس میں ہائیڈرولوجی، ہائیڈرو ڈائی نمکس HYDRODYNAMICS ، پانی کے جذب ہونے اور نہروں کے فرش کو ٹھیک رکھنے اور ایسے ہی دوسرے مسائل پر تحقیقات ہو سکیں۔ حصولِ آزادی سے قبل اس مقصد کے لیے لاہور میں جو ادارہ قائم کیا گیا تھا، وہ نہ ہونے کے برابر ہے، کیوں کہ نہ اُس کے پاس اچھا اسٹاف ہے اور نہ ریسرچ کی سہولتیں۔ جب سندھ طاس سے تعلق رکھنے والے منصوبے تکمیل کو پہنچیں گے تو ان پر دو ارب ڈالر سے کم لاگت نہیں آئی ہو گی۔ اس عظیم رقم میں سے کسی تحقیقاتی ادارے کے قیام پر کیا خرچ کیا جا رہا ہے؟ ڈیم تعمیر کرنے کے فن، ہائیڈرولوجی، ارضیات اور طبیعیات وغیرہ پر تحقیقات کرنے کے لیے کتنے سائنس داں اور انجنیئر اعلا

تربیت کے لیے ترقی یافتہ ملکوں میں بھیجے جا رہے ہیں ؟
اگر سندھ طاس کے اس تخمینے کا صرف ایک فی صد حصّہ جدید طرز کے ایک تحقیقاتی ادارے کے قیام پر صرف کر دیا جاتا تو ہمیں اپنی تعمیرات میں لاکھوں کروڑوں رُپوں کی بچت ہو جاتی اور ہمارے ملک میں وہ عمارتیں نظر نہ آتیں جو ایک ہی سال بعد بیٹھنے لگتی ہیں اور وہ ڈیم یا آبی ذخیرے تعمیر نہ ہوتے، جن کے ٹوٹنے کا خطرہ رہتا ہے۔
اگر ہم مشینری، غیر ملکی ماہرین اور غیر ملکی ٹیکنالوجی درآمد کر کے ایک کارخانہ یہاں اور ایک کارخانہ وہاں تعمیر کرتے گئے تو فیکٹریاں تو بہت سی کھل جائیں گی، لیکن ملک میں صنعتی ترقی نہیں ہو سکے گی۔ آج دنیا کے ترقی یافتہ صنعتی ملکوں میں جس رفتار سے جدید طریقے اور نئی مصنوعات سامنے آ رہی ہیں وہ ایسی ہوش رُبا ہے کہ ہم سیاسی شہنشاہیت و سامراجیت سے نجات پانے کے بعد "سائنسی شہنشاہیت" کے شکار ہو جائیں گے۔ اِسی برِّعظیم میں کسی زمانے میں رنگ سازی کی صنعت عروج پر تھی۔ نیل اور دوسرے پودوں سے طرح طرح کے رنگ حاصل کیے جاتے تھے۔ لیکن جب وہی رنگ کولتار سے مصنوعی طور پر حاصل کیے جانے لگے تو یہ صنعت ختم ہو گئی۔ ہزاروں لاکھوں آدمی بے روزگار ہو گئے اور وہ مصیبت آئی کہ بیان نہیں ہو سکتی۔ ہماری آنکھوں کے سامنے کاغذ، پلاسٹک، نائیلون، ریون اور دوسرے مصنوعی ریشے تیزی سے جوٹ، کپاس اور اون کی جگہ لے رہے ہیں۔ کیا یہ بیدار ہونے کا وقت نہیں ہے کہ ہم اپنے قدرتی ریشوں پر تحقیقات کریں اور ان کے دوسرے استعمال دریافت کر کے ان کی قدر و قیمت میں اضافہ کریں ؟
صرف اس موضوع پر تحقیقات کرنے کے لیے بے اِنتہا جواز موجود ہے، لیکن اس موضوع سے غیر ملکی "مشیروں" اور "ماہرین" کو دل چسپی نہیں ہو سکتی۔ وہ کسی نئے جوٹ مل کا خاکہ ضرور تیار کر سکتے ہیں کہ اس میں لاتنے کرگھے ہوں گے اور اتنے تکلے اور ہمارے منتظمین و صنعت کار خوشی سے اس کارخانے پر کروڑوں رُپے لگا دیں گے، لیکن اگر ہم اسی رقم کا صرف ایک فی صد حِصّہ تحقیقات کے لیے طلب کریں تو ہم سے پوچھا جاتا ہے "بھلا اس کا فائدہ ؟"
لوہے اور فولاد کی صنعت کی مثال لے لیجیے۔ ہمارے ملک میں لوہے کی بہترین کچ دھات (میگنا ٹائٹ) موجود ہے، جس میں نصف سے زیادہ لوہا موجود ہے۔ چترال کی پہاڑیوں پر یہ کچ دھات اوپر ہی پڑی ہوئی ہے، لیکن اس کی مقدار اسّی لاکھ ٹن سے زیادہ نہ ہو گی۔ غیر ملکی ماہرین اسے "مختصر" کہتے ہیں، جس پر توجّہ دینا عبث ثابت ہو گا۔ ان ماہرین نے اپنے ملک میں وہ عظیم بھٹّیاں دیکھی ہیں جو ہر سال لاکھوں ٹن ایسی کچ دھات نگل لیتی ہیں۔ اُن کے لیے

اسّی لاکھ ٹن کی کیا حیثیت ہو سکتی ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مغل بادشاہ بابر کی توپیں جن سے اس نے ہندوستان فتح کیا، کس ملک کی بھٹیوں میں تیار ہوئی تھیں؟ اور اسلام کی اُن تلواروں کے لیے کس برقی بھٹّی کا صاف کیا ہوا فولاد آیا تھا، جو مغرب میں بحرِ اوقیانوس سے لے کر مشرق میں جزائر بحرالکاہل تک لہرائیں؟ ہم اپنے حالات کے مطابق ایک نئی ٹیکنالوجی کی طرح کیوں نہ ڈالیں جو چھوٹی بھٹیوں میں ہمارے لیے فولاد تیار کرے، جس کی قیمت بھی ہماری قوتِ خرید کے مطابق ہو؟ اگر ہم کراچی اور چٹاگانگ میں ایک ارب رُپے کی لاگت سے فولاد سازی کے کارخانے قائم کر سکتے ہیں تو کیا اِس رقم کا عشرِ عشیر تحقیقات کے لیے مختص نہیں کیا جا سکتا؟ صرف چترال میں لوہے کی اِتنی کچ دھات موجود ہے کہ ہماری آئندہ دس پندرہ سال کی ضروریات اس سے پوری ہو سکتی ہیں اور اگر کالا باغ کی کچ دھات سلیقے سے استعمال کی جائے تو ہماری معیشت میں انقلاب آ سکتا ہے۔ ہم نے اس کچ دھات پر تحقیقات کرنے پر کتنی رقم خرچ کی ہے؟ غیر ملکی ماہرین یا تجربہ گاہوں کو کیا پڑی ہے کہ وہ ہمارے مخصوص مسائل کا حل تلاش کریں؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمیں شروع میں وہی طریقے اپنانے ہوں گے جو برسوں سے استعمال ہو رہے ہیں، لیکن اگر ہم اپنے وسائل اور حالات کے مطابق تحقیقات نہیں کریں گے تو ہم تیزی سے ترقی کرنے والی اس دنیا کا مقابلہ نہیں کر سکتے!

صنعتی اعتبار سے ترقی کرنے والوں ملکوں سے جو ٹیکنالوجی ہم تک پہنچی ہے، اس کا انحصار مصنوعات اور خام مال کی افراط پر ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکا کی دیو پیکر مشینوں نے گزشتہ چالیس سال کے عرصے میں جتنا خام مال استعمال کیا ہے اتنا باقی تمام دنیا نے گزشتہ چار ہزار برس کے عرصے میں بھی نہیں کیا۔ ظاہر ہے کہ یہ تیز رفتاری اور ضیاع ہمارے حالات پر پورا نہیں اتر سکتا۔

اب ہم فنِ تعمیر اور سامانِ تعمیر کے مسئلے میں آتے ہیں۔ مغل شہنشاہوں نے اس زمانے کے فنِ تعمیر کے بعض ایسے شاہکار چھوڑے ہیں جن کا شمار عجائبات عالم میں ہوتا ہے۔ کیا انھوں نے سمنٹ اور فولادی ڈھانچے استعمال کیے تھے؟ کیا انھوں نے چونے کے مسالے، اینٹوں اور مٹی سے سڑکیں، پُل اور ڈیم تعمیر نہیں کرائے تھے؟ ہم اپنی عمارتوں کی محرابیں اور چھتیں مغل طرزِ تعمیر کے مطابق بنائیں تو کوئی حرج ہے؟ کیا ہم اپنے ملک کا وہ مال مسالہ استعمال نہیں کر سکتے، جو ہماری اپنی تحقیقاتی تجربہ گاہوں میں تیار ہوا ہو؟ کیا ہم سیمنٹ اور لوہے کے بغیر اپنے اُن کروڑوں دیہاتیوں کے لیے اِس مسالے سے چھوٹے چھوٹے گھر تعمیر نہیں کر سکتے جو کچے ٹوٹے پھوٹے مکانوں میں رہنے پر مجبور ہیں؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ اب سے ہزاروں سال پہلے

موہنجوڈارو، ٹیکسلا اور ہڑپّہ کے باشندوں نے اپنے لیے بہتر نظامِ صفائی، سڑکیں اور مکانات تعمیر کیے تھے؛ اس کے برعکس ہمارے دیہاتوں کی حالت ناقابلِ بیان ہے۔ آج ہمارے کروڑوں ہم وطن اپنی نصف زندگی تاریکی میں بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ سورج غروب ہونے کے بعد ان کے تاریک گھروں کو اگر کچھ روشنی میسّر آتی ہے تو اس آگ سے جو کھانا پکانے کے لیے روشن کی جاتی ہے!

جس قوم کی یہ کیفیت ہو اس پر اور اس کی آئندہ نسلوں کے دل و دماغ پر ان حالات کا جو نفسیاتی اثر مرتب ہوگا اس کا اندازہ مشکل نہیں ہونا چاہیے۔ اگر ہم دیہاتوں تک برقی قوت پہنچانے کے مسائل کا جائزہ سائنسی بنیادوں پر لیں تو جدید سائنس ہمارے ان بھائیوں کے گھروں میں بھی اجالا کرسکتی ہے، لیکن اگر آپ غیر ملکی "ماہرین" سے مشورہ کریں گے تو وہ تو یہی کہیں گے کہ یہ منصوبہ "غیر منفعت بخش" ثابت ہوگا۔ ہمارے محکمۂ مال کو جب تک کسی منصوبے میں کم از کم چھے فی صد کا فائدہ نظر نہ آئے وہ "غیر منفعت بخش" سمجھا جاتا ہے۔ انھیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ اگر دیہاتوں میں بجلی پہنچ جائے تو گھریلو صنعتوں کو فروغ حاصل ہوگا، زرعی مشینیں کام کرنے لگیں گی، دیہاتیوں کا معیارِ زندگی بلند ہوگا اور وہ خوش حال ہوجائیں گے وہ غذائی اشیا سستی کرتے یا کپڑا ارزاں کرنے کے لیے تو کوشاں رہیں گے، لیکن ہمارے قصبات اور دیہاتوں کو برقی توانائی فراہم کرنے کے لیے کچھ رقم خرچ کرنا گوارا نہیں کرسکتے۔ حد یہ ہے کہ وارسک جیسے منصوبے سے بھی جو کینیڈا کے عوام نے اہلِ پاکستان کو تحفۃً دیا تھا، نفع کمایا جا رہا ہے۔

ہمارے ہاں بجلی کو ضروریاتِ زندگی میں شمار کرنے کے بجائے محصول کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ یہاں لینن کا ایک جملہ نقل کرنا دل چسپی سے خالی نہ ہوگا، جو اس نے اس سوال کے جواب میں کہا تھا کہ بولشویک اور مارکسی نظام میں کیا فرق ہے؟ لینن نے کہا تھا کہ "بالشوزم برابر ہے مارکسزم جمع بجلی" سوویت یونین میں غذا، لباس، تعلیم، طبی سہولتیں اور مکانات کی طرح بجلی کو بھی زندگی کی بنیادی ضرورت سمجھا جاتا ہے اور اسے ملک کے گوشے گوشے تک پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ فلسفہ عالمی بنک یا ایڈ کے مشیروں کی سمجھ میں نہیں آسکتا۔ ہمارے ملک میں ہمارے مخصوص حالات کے مطابق برقی مسائل پر تحقیق ہونی چاہیے اور عوام کے استعمال کے لیے ارزاں لیکن کارآمد سامان تیار ہونا چاہیے۔

ہم نے اپنے دوسرے اور تیسرے پنج سالہ منصوبے میں بجلی کے لیے لاکھوں روپیہ مختص کیا ہے، لیکن دھوپ، ہوا یا مدّوجزر کی طاقت سے بجلی پیدا کرنے، برقی ترسیل، بہتر حاجز اشیا کا

استعمال، ٹربائن، ٹرانسفورمر اور سوئچ گیئر وغیرہ پر تحقیقات کرنے کے لیے ایک پیسہ نہیں دیا۔

الغرض زراعت، طب و صحت، صنعت و حرفت، کان کنی، بجلی، آب پاشی، مواصلات ـــــــ قومی ترقی کا کوئی بھی شعبہ ایسا نہیں، جہاں سائنس کا اطلاق نہ ہو سکے اور بہتر نتائج کی توقع نہ کی جا سکے۔ بد قسمتی سے ہمارے منتظمین سائنسی مساعی و تحقیقات پر روپیہ صرف کرنے کی اہمیت نہیں سمجھتے۔ اس مقصد کے لیے ہمیں اپنا طریق استدلال بدلنا پڑے گا۔ جب انگریزوں کو چھے ہزار میل کے فاصلے سے ہندستان پر حکومت کرنی پڑی تو انھوں نے کیا انتظام کیا تھا؟ انھوں نے ایک واضح مقصد کے پیشِ نظر سول سروس قائم کی اور محصول و ٹیکس جمع کرنے کے علاوہ ملک میں نظم و ضبط قائم کرنے کی ذمےداری بھی اس کے سپرد کی۔ انھوں نے انڈین سول سروس کو اتنا وقار بخشا کہ انگلستان اور ہندستان کے بہترین دماغ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ ان افسروں سے ہر قسم کے فرائض کی بجا آوری کی توقع کی جاتی رہتی، تاہم برطانوی طرزِ حکومت کا بنیادی اصول یہ ہے کہ ہندستانیوں پر بھروسا نہ کیا جائے اور انھیں شبہ کی نظر سے دیکھا جائے۔

اِسی نقطۂ نظر کو تبدیل کرنے کے لیے پاکستان میں سول سروس اکیڈمی، ایڈمنسٹریٹو اسٹاف کالج، نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف پبلک ایڈمنسٹریشن جیسے ادارے قائم کیے گئے۔ سرکاری ملازم اب عوام کے خادم بنتے جا رہے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ افلاس کے خلاف ہمارے 'جہاد' میں یہ ملازم ہمارے کام آئیں گے۔ ہم ساتھ ساتھ یہ بھی چاہتے ہیں کہ ملک ان لوگوں کی بجا طور پر قدر و منزلت کرے، جو اپنے اپنے شعبے میں یک گونہ امتیاز کے حامل ہیں خواہ وہ سائنس داں ہوں، انجنیر ہوں، اہل قلم ہوں یا اساتذہ۔ انھیں معاشرے میں اعلاترین مقام ملنا چاہیے، ان کی تنخواہیں سب سے زیادہ ہونی چاہییں اور ان کی سب سے زیادہ عزت ہونی چاہیے۔ عزت و احترام صرف منتظمیں کے لیے مخصوص نہ کر دیا جائے بلکہ قابلیت اور ذہانت جہاں کہیں بھی ہوں انھیں معزز ٹھیرایا جائے۔

ایک ہزار سال سے زیادہ عرصہ گزرا ہے کہ خلفائے اسلام کو صرف ایک ہی شوق تھا اور وہ یہ کہ عالم جہاں بھی ہو اسکی حوصلہ افزائی کی جائے اور اس کی قدر کی جائے۔ علم ان امرا کے نزدیک زندگی کا جزو لاینفک تھا، انھیں صرف دربار لگانے کا شوق نہیں تھا، بلکہ وہ کتب خانوں اور رصدگاہوں میں بھی اتنی ہی دل چسپی لیتے تھے۔ وہ مباحثوں اور مذاکروں میں شریک ہوتے تھے اور سائنس دانوں سے مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے تھے۔ ہر مسجد

کے ساتھ ایک مدرسہ ہوتا تھا۔ پڑھے لکھے لوگوں کو بلا تمیز مذہب و ملت باقی سب لوگوں پر ترجیح دی جاتی تھی۔ اُن پر انعام و اکرام کی بارش کی جاتی تھی اور انھیں انتظامیہ میں اہم عہدے بھی دیے جاتے تھے۔

روزگار اور قدر و منزلت کی کمی کی وجہ سے ہمارے سینکڑوں انجینئر افریقی ملکوں میں چلے گئے، بہت سے ڈاکٹر انگلستان اور دوسرے یورپی ملکوں میں ایسے گئے کہ وہیں کے ہو رہے اور بے شمار سائنسداں یا تو ملک چھوڑ گئے یا چھوڑتے جا رہے ہیں۔ یہ رجحان ہر قیمت پر ختم ہونا چاہیے، کیونکہ کسی ملک کی عظمت و اہمیت کا انحصار اس کی لمبی چوڑی آبادی پر نہیں ہوتا بلکہ اس کے اعلا دماغوں اور تعلیم یافتہ لوگوں پر ہوتا ہے۔

وھائٹ ہیڈ نے کیا خوب کہا تھا:

> "آج کی زندگی میں ایک قانون اٹل ہے: جو قوم ذہانت کی قدر نہیں کرتی وہ تباہ ہو جاتی ہے۔ آپ کی تمام تر دلاوری، معاشرتی بلندی، تیز فہمی، خشکی اور تری پر برتری —— غرض کوئی امتیاز بھی وقت کے تقاضوں کو نہیں بدل سکتا۔ آج ہم یہاں ہیں، کل سائنس اس سے بھی آگے ہوگی۔ اس دوڑ میں پیچھے رہ جانے والے کو کہیں جگہ نہیں ملے گی۔"

کم از کم آئندہ کچھ عرصے تک ہمارے ہاں ہر ڈاکٹر کو پچاس ہزار رُپے ملنے چاہییں لیکن اس شرط پر کہ وہ کسی منتخبہ گاؤں میں پریکٹس شروع کر دے۔ نوجوان انجینئروں کو طویل المیعاد بلا سُود قرضے ملنے چاہییں جن سے وہ گھریلو صنعتیں اور ورکشاپ قائم کریں۔ اسی طرح زراعت کی ڈگریاں حاصل کرنے والوں کو حکومت کی طرف سے زمین اور مالی امداد ملنی چاہیے، جس پر وہ ماڈل فارم بنا سکیں۔ ان کاموں میں حکومت کا کچھ رُپیہ تو ضرور خرچ ہوگا، لیکن ملک سے ذہانت کا اخراج رک جائے گا اور عوام کی خوش حالی میں اضافہ ہوگا۔ سائنس دانوں کی قدر و منزلت بھی بڑھے گی اور آنے والا وقت بتائے گا کہ رُپے کا یہ خرچ ضائع نہیں جائے گا۔

اکثر اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ پاکستانی سائنس دانوں نے ملکی مسائل حل کرنے میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ پھر ان کی عزت کیسے ہو؟ ہم پر یہ الزام بھی لگایا جاتا ہے کہ ہم میں آپس میں اتفاق نہیں۔ ہم اس وقت تک کسی نتیجے پر نہیں پہنچتے جب تک کسی منتظم کا اشتراک حاصل نہ کیا جائے۔ ممکن ہے یہ الزامات کسی حد تک صحیح بھی ہوں لیکن یہ بھی تو سوچیے کہ ایک ایسے ملک میں جہاں

سائنسی سہولتوں کا سراسر فقدان ہے۔ ہم نے بیس سال کے عرصے میں دو ایسے سائنس داں پیدا کیے جنھیں بین الاقوامی شہرت و عظمت حاصل ہوئی اور جنھیں رائل سوسائٹی کا فیلو منتخب ہونے کا اعزاز ملا۔ ہماری مراد عبدالسلام اور سلیم الزماں صدیقی سے ہے جنھوں نے بالترتیب طبیعیات اور کیمیا میں یہ امتیاز حاصل کیا۔ زراعت، طب و صحت، ارضیات، موسمیات اور جوہری توانائی کے میدانوں میں ہمارے بعض سائنس دانوں کو بین الاقوامی انجمنوں اور اجتماعات میں بلند ترین مقام ملا ہے۔

ہمارے ان سائنس دانوں نے گیہوں، کپاس اور پھلوں کی نئی اقسام دریافت کی ہیں۔ انھوں نے دیسی جڑی بوٹیوں سے نئی دوائیں تیار کی ہیں۔ انھوں نے جوہر کی اندرونی ساخت پر غور کیا ہے اور ابتدائی ذرات کے متعلق نئے نظریات وضع کیے ہیں۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ ملک کے بعض اہم مسائل کی طرف ہنوز توجہ نہیں دی جاسکی لیکن خاص مسائل کے لیے خاص طرز کا ساز و سامان اور مخصوص فنڈ درکار ہوتے ہیں۔ اگر ہم سائنس دانوں پر اعتماد کیا جائے اور ترقیاتی بجٹ کا عشرِ عشیر بھی تحقیقات و تجربات کے لیے دے دیا جائے تو یہ مسائل یقیناً حل ہو سکتے ہیں۔ ہمیں اِس قسم کے سوالات سے تکلیف ہوتی ہے کہ جب ملک میں لانگ ویو ٹرانسمیٹر موجود ہے تو شورٹ ویو ٹرانسمیٹر کی کیا ضرورت ہے؟ ہم یہ نہیں بتانا چاہتے کہ وان ڈی گراف مشین کے لیے کتنا یورینیم درکار ہوتا ہے۔ ہمیں تعطّل پیدا کرنے والے سرخ فیتے کے بجائے کام یابی کے نیلے فیتے کی ضرورت ہے۔

پاکستان کے سائنس دانوں اور منتظمین کے سامنے اس وقت اہم ترین مسئلہ باہمی تعاون اور اتفاق کا ہے۔ انھیں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر باہمی اعتماد کی فضا میں کام کرنا چاہیے۔ ضرورت ہے کہ سائنس کی سرحدیں فائلوں سے نکال کر مختلف میدانوں میں پھیلائی جائیں، اور انھیں وسعت دی جائے۔ صنعت و حرفت اور زراعت کے میدانوں میں اس انقلاب آفریں تبدیلی کی اور بھی ضرورت ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ ہمارے سائنس داں پاکستان کی مخصوص ضروریات کے پیشِ نظر سائنسی موضوعات پر تحقیق کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ ہمیں کتابی معلومات کے بجائے عملی اقدامات کی ضرورت ہے۔ وہ بیرونی ملکوں سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے شوق میں رہتے ہیں اور اس ڈگری کے حصول کے لیے کرتے کیا ہیں؟ وہ کسی ایسے موضوع پر تحقیق کرتے ہیں، جس کا تعلق سراسر اس غیر ملک سے ہوتا ہے۔ ان موضوعات کا تجربہ ہمارے ان سائنس دانوں کو وہ بالغ نظری یا قابلیت نہیں بخشتا جس سے

وہ پاکستان کے مخصوص مسائل حل کر سکیں۔
ہمارے بہت سے سائنس داں واپس آکر میز پر بیٹھ کر صاف ستھری زندگی گزارنا چاہتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ ان کے سامنے خود کار آلات سجے ہوں جن کے سُوئچ دبا کر وہ اپنی ضرورت کی ہر چیز حاصل کر لیا کریں۔ ہمارے نوجوانوں میں یہ رُجحان پیدا کرنے کی ذمّے داری بہت کچھ ہمارے نظامِ تعلیم پر ہے۔ ہمیں اپنے سائنسی اور ٹیکنیکل طریقِ تعلیم میں اہم تبدیلیاں پیدا کرنی ہوں گی، مثلاً ہم زیادہ سے زیادہ افراد کو ابتدائی تعلیم دینے اور اگلے دس پندرہ سال کے عرصے میں ملک سے جہالت دور کر دینے کے منصوبے بنا رہے ہیں۔ کوئی سمجھ دار انسان بھی اِس تجویز کی مخالفت نہیں کرے گا لیکن ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو یہ منصوبہ ناقابلِ عمل ثابت ہوگا۔

اعداد و شمار شاہد ہیں کہ ۱۹۶۰ء سے پہلے ہمارے ملک میں اسکولوں کی عمر کے بچّوں کی تعداد ڈیڑھ کروڑ چالیس لاکھ تھی لیکن ۱۹۶۰ء تک ۴۷۵۰۰ اسکولوں میں صرف ۵۵ لاکھ بچّوں کی تعلیم کا بندوبست کیا جا سکا یعنی اوسطاً ہر اسکول میں ۱۱۶ بچّے۔ اس تعداد میں ہر سال بیس لاکھ بچّوں کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس کارِ عظیم کی تکمیل کے لیے حکومت کو اسکولوں کی ہزاروں عمارتوں، لاکھوں کتابوں اور اساتذہ کا بندوبست کرنا ہوگا۔ حکومت کو جدید طرز کے زیادہ سے زیادہ اسکول ضرور قائم کرنے چاہییں لیکن اتنا بڑا کام صرف حکومت سے نہیں ہو سکتا۔ اس میں قوم کو بھی ہاتھ بٹانا چاہیے۔

حکومت کو بالغوں کی فنّی اور پیشہ ورانہ تعلیم پر زیادہ زور دینا چاہیے۔ اس مقصد کے لیے ماڈل فارم، کارخانے اور پولی ٹیکنک ادارے کھولنے ہوں گے۔ کوئی بھی بالغ انسان دو سال کے عرصے میں نہ صرف کوئی فن سیکھ سکتا ہے، بلکہ اسے لکھنا پڑھنا بھی آ جائے گا۔ اگر ہر تحصیل میں ایک تجرباتی فارم، ایک صنعتی اسکول اور ایک تربیتی مرکز موجود ہو تو دس سال کے عرصے میں جہالت خود بخود دور ہو جائے گی۔ ایسے مراکز ہزاروں بڑھئی، درزی، خانساماں، جفت ساز، بجلی کے مستری، دوسرے مستری، معمار اور دستکار پیدا کر سکتے ہیں۔ ان مرکزوں میں آن سینکڑوں لڑکوں لڑکیوں کو داخلہ بھی مل سکتا ہے، جو میٹرک کرنے کے بعد بے کار پھرتے رہتے ہیں۔ بے کار پھرنے سے کوئی کارآمد فن سیکھ لینا بہر حال بہتر ہے۔ ہمارے بیشتر نوجوان اسکولوں سے نکلنے کے بعد خواہ مخواہ کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں داخلہ لے لیتے ہیں، کیوں کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا کریں۔ بھلا ایسی بے مقصد ڈگریوں کا کیا فائدہ ہو سکتا ہے؟

ہماری یونیورسٹیوں کا معیار بھی بلند ہونا چاہیے اور ساز وسامان کی کمی دور ہونی چاہیے، جو اچھی تعلیم کے حصول میں حائل ہوتی ہے۔ اگر ہمارے ہاں قابل اور تجربہ کار پروفیسروں کی کمی ہے تو ہمیں دوسرے ملکوں سے انھیں مدعو کرنا چاہیے، تاکہ طریقِ تدریس بہتر ہو۔ اگر ڈیڑھ کروڑ ڈالر خرچ کر دیے جائیں تو سائنس پڑھانے کے لیے ہماری چھے یونیورسٹیوں کا معیار بلند ترین ہو سکتا ہے۔ ہمیں صرف ریاست ہائے متحدہ امریکا سے اجناس کی شکل میں دس کروڑ ڈالر کی جو مدد ملتی ہے، یہ رقم اس کا معمولی جزو ہے۔ اس ملک کو یہ احساس ہونا چاہیے کہ تعلیم یافتہ طبقے کے دماغوں کو مسخر کرنا زیادہ اہم ہے بہ نسبت اس کے کہ وہ اپنی زرعی فالتو اشیا ہمارے ہاں جمع کرتا رہے۔

دوسرے پنج سالہ منصوبے میں تعلیم کے لیے صرف چار فی صد رقم رکھی گئی تھی۔ اگر ہم ملک میں تجرباتی فارم، صنعتی اسکول، پولی ٹیکنک ادارے، تربیت گاہیں اور یونی ورسٹیاں قائم کرنا چاہتے ہیں تو ظاہر ہے کہ اگلے منصوبوں میں یہ رقم برابر بڑھانی پڑے گی۔ جس ملک میں ہر سال بیس لاکھ بچوں کا اضافہ ہو جاتا ہے وہاں ابتدائی تعلیم کے تقاضے کہاں تک پورے کیے جا سکتے ہیں؟ جب انگلستان میں صنعتی انقلاب آیا تو وہاں بھی پڑھے لکھے لوگوں کی شرح اتنی ہی تھی، جتنی اب پاکستان میں ہے۔ آج بھی انگلستان میں اسکول جانے والے بچوں کی تعداد کا دس فی صد سے زیادہ حصہ یونیورسٹی میں داخل نہیں ہوتا۔ باقی طلبا کوئی فنی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ہمارے ملک کے عوام ہر سال تقریباً بیس کروڑ روپے کے سگریٹ تو پھونک دیتے ہیں، اپنے بچوں کی ابتدائی تعلیم پر کچھ خرچ نہیں کر سکتے؟ حکومت کو کچھ ماڈل اسکول ضرور قائم کرنے چاہییں اور باقی ضرورت پرائیویٹ اسکولوں کو پوری کرنی چاہیے۔ حکومت کو سائنسی اور ٹیکنیکل تعلیم پر زیادہ روپیہ خرچ کرنا چاہیے۔

سائنس میں اشاریت

ایک ایسے ملک میں جہاں سائنس کو ابھی اپنی جڑیں جمانی ہیں، اشاریت خلافِ توقع طور پر ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ جب بھی کسی جوہری ری ایکٹر کے قیام کی خبر آتی ہے یا کوئی راکٹ چھوڑا جاتا ہے تو ہمارے نوجوان طبقے میں مسرت و شادمانی کی لہر دوڑ جاتی ہے اور اُن میں کوئی سائنسی پیشہ اختیار کرنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ سائنس کے حق میں آواز اٹھانے سے وہ بات پیدا نہیں ہوتی۔ اگر ہماری سائنسی تجربہ گاہوں کی عمارتیں ہمارے تعمیری ورثے کی آئینہ دار ہوں تو ان پر لاگت تو شاید کچھ زیادہ آئے گی، لیکن وہ ہمارے نوجوانوں میں ایک

جذبہ، ایک نئی امنگ پیدا کرنے کا سبب بنیں گی۔

مشرق میں اشاریت ایک قوی محرک کی حیثیت رکھتی ہے اور ہمارے نوجوانوں پر دیرپا اثر چھوڑتی ہے۔ عوام میں سائنس کا شوق پیدا کرنے کے لیے اسے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ مغربی ممالک میں بھی اشاریت اتنا ہی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ جب روسی سائنسدانوں نے پہلا مصنوعی سیارہ "اسپوتنک" چھوڑا تو ریاست ہائے متحدہ امریکا میں اس کا زبردست ردِ عمل ہوا۔ امریکی حکومت محض اپنا وقار برقرار رکھنے کی غرض سے چاند پر روس سے پہلے انسان اتارنا چاہتی ہے اور اس مقصد کے لیے کثیر رقوم خرچ کر رہی ہے۔ اس مقابلے نے امریکا میں روزگار کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ سینکڑوں ہزاروں مرد عورتیں سائنسی پیشہ اختیار کر رہے ہیں۔ وہاں کا پورا نظام وقت کے ان نئے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے بدلا جا رہا ہے۔ اُدھر روس میں امریکا کے مقابلے میں چار گنے زیادہ انجینیر اور تین گنے زیادہ ڈاکٹر ہر سال تیار کیے جا رہے ہیں۔ یہ ہے ایک نظامِ تعلیم کی دوسرے نظامِ تعلیم پر برتری کا ثمر۔ روس میں نہ صرف یہ کہ سائنس داں کا وقار نہایت بلند ہے، بلکہ لوگوں کی توجہ سائنس کی طرف مبذول کرانے کے لیے اور بھی بہت سے انتظامات کیے جا رہے ہیں۔ ماسکو سے تقریباً سترہ سو میل جانب مشرق نووسی برسک نامی مقام پر سائبیریا کے لق و دق صحرا میں روسیوں نے ایک شہرِ سائنس تعمیر کیا ہے، جس کی سڑکوں کے نام انسانوں کے اسمائے گرامی پر نہیں بلکہ سائنسی مضامین کے ناموں پر رکھے گئے ہیں۔ اس با کمال شہر میں تحقیقاتی اداروں کے سوا کوئی اور عمارت نہیں ہے۔ اگرچہ یہاں کا ٹمپریچر سال کے بیشتر حصے میں صفر سے نیچے رہتا ہے، تاہم یہاں دس لاکھ سے زیادہ انسان آباد ہیں، جو تمام تر سائنس داں یا ان کے متعلقین ہیں۔

ان مثالوں سے ظاہر ہے کہ سائنس میں اشاریت کی زبردست اہمیت ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ ہم بھی پاکستان میں ایسے ہی تحقیقاتی ادارے تعمیر نہ کر سکیں۔ یہ ادارے ہر مذہب و ملت کے افراد کے لیے کھلے ہوں گے، بالکل اسی طرح جیسے ہمارے آباؤ اجداد نے قاہرہ، بغداد، دمشق، شیراز، قسطنطنیہ اور قرطبہ میں دارالعلوم قائم کیے اور اپنے پرائے ہر ایک کو ان سے مستفید ہونے کی اجازت دی۔

موجودہ حکومت نے ۱۹۵۸ء میں ایک سائنسی کمیشن قائم کیا تھا جس میں پاکستانی سائنس دانوں کے علاوہ کچھ تجربہ کار منتظمین بھی شامل تھے۔ ان کی مدد کے لیے بین الاقوامی شہرت کے چند سائنس داں بھی موجود تھے۔ کمیشن نے ملک کی صورتِ حال کا پورا پورا جائزہ لیا،

سائنسی مساعی تیز تر کرنے کے لیے بعض تجاویز پیش کیں اور مندرجہ ذیل اہم سفارشات کیں :

۱۔ چوں کہ یونیورسٹیاں علم کا سب سے بڑا سرچشمہ ہیں، اس لیے ان کے سائنسی شعبوں کو مرکزی حکومت سے سب سے زیادہ امداد ملنی چاہیے۔ یہ امداد صرف تجربہ گاہیں، لائبریریاں اور ورکشاپ بنانے کے لیے ہی کافی نہیں ہونی چاہیے بلکہ بعد میں بھی اس کا کچھ حصہ ملتا رہنا چاہیے، تاکہ تدریس و تحقیق کا سلسلہ جاری رکھا جا سکے۔

۲۔ مرکزی حکومت کو شروع میں پانچ ریسرچ کونسلیں قائم کرنی چاہییں :
(i) ایگریکلچرل ریسرچ کونسل (ii) میڈیکل ریسرچ کونسل (iii) کونسل آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ (iv) اٹومک انرجی کونسل (v) کونسل فار ورکس اینڈ اریگیشن ریسرچ۔
ان کونسلوں کو مرکزی حکومت کی مختلف وزارتوں سے متعلق ہونا تھا لیکن داخلی معاملات میں انھیں خود مختار رکھا جانا تھا۔ ان کا تمام تر انتظام خود سائنس دانوں کے سپرد ہونا تھا۔ ان کونسلوں پر یہ ذمے داری بھی عائد ہوتی تھی کہ وہ تحقیقات کے لیے مختلف ادارے اور تجربہ گاہیں قائم کریں۔ مقصد یہ تھا کہ ایسے موضوعات پر تحقیقات کی جائیں، جو ہمارے ملک کے لیے اہمیت رکھتے ہیں۔
ان تجربہ گاہوں کو ملکی یونیورسٹیوں کے ساتھ الحاق کرنا تھا۔ دفاع کی مخصوص ضروریات کے پیشِ نظر ایک جداگانہ ادارہ قائم کرنے کی سفارش کی گئی تھی، جو وزارتِ دفاع سے متعلق ہونا تھا۔

۳۔ مختلف تحقیقاتی کونسلوں کے مابین رابطہ پیدا کرنے اور سائنسی معاملات میں حکومت کو مشورہ دینے کے لیے ایک نیشنل سائنس کونسل قائم کی جائے۔ اس کا دفتر صدر کی ذاتی سیکریٹریٹ میں ہوگا اور وہ صدر کو یا ان کے نامزد کردہ ایک وزیر کو جواب دہ ہوگی۔

۴۔ تمام یونیورسٹیاں، ریسرچ کونسلیں اور منتخب سائنسی شعبے ہر قسم کی سائنسی کتب، میگزین، رسالے وغیرہ بغیر کسی پابندی کے درآمد کر سکیں۔

۵۔ ایک جداگانہ پاکستان سائنس سروس کے قیام پر غور کیا جائے۔

۶۔ ذہین و طباع سائنس دانوں کو ملک سے باہر جانے یا انتظامیہ میں شامل ہونے سے روکنے کے لیے ان کی تنخواہوں کے سکیلوں میں غیر معمولی ترمیم کی جائے۔ (نمونے کے کچھ سکیل پیش بھی کیے گئے تھے۔)

۷۔ سائنس کی ترقی کے لیے یہ ضروری ہے کہ مرکزی حکومت آمدنی کا کم از کم ایک فی صد حصہ ریسرچ کونسلوں اور یونیورسٹیوں پر صرف کرے۔

یہ رپورٹ ملک اور بیرونِ ملک میں بڑی پسند کی گئی تھی۔ ہمارے نوجوان سائنسداں توقّع کرنے لگے کہ اب ان کے لیے ایک نئے دَور کا آغاز ہوگا اور سائنس کی طرف عوام اور حکومت دونوں کا رجحان بدل جائے گا۔ بد قسمتی سے یہ رپورٹ وزارتِ تعلیم میں کہیں پھنس کر رہ گئی کیونکہ یہ وزارت تعلیمی اصلاحات نافذ کرنے میں مصروف ہے۔ کئی برس گزر جانے کے بعد بھی کسی کونسل کو وہ آزادیٔ کار نصیب نہ ہوسکی جس کی توقّع کی گئی تھی۔ سائنسی کتب اور رسالے اب بھی مشکل سے دستیاب ہوتے ہیں۔ سائنسی سامان کی درآمد پر اب بھی پابندیاں اور ٹیکس لگے ہوئے ہیں۔ سائنسدانوں کے مرتبے اور تنخواہوں میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی۔ نیشنل سائنس کونسل بھی کچھ نہیں کرسکی۔ کونسل آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ اور اٹومک انرجی کونسل کے سوا کوئی اور کونسل اپنے تحقیقاتی ادارے یا تجربہ گاہیں قائم نہیں کرسکی۔ دفاعی ریسرچ بھی ابتدائی منازل طے کر رہی ہے۔

یونیورسٹیوں کو اتنی امداد نہیں ملتی کہ وہ سائنسی تحقیقات پر پوری توجّہ دے سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری یونیورسٹیوں کی تجربہ گاہیں کسی یورپین یا امریکی ہائی اسکول کی تجربہ گاہوں کے مقابلے میں بھی کم حیثیت معلوم ہوتی ہیں۔ اس سے بھی زیادہ افسوس ناک امر یہ ہے کہ ہماری بعض یونیورسٹیوں میں فلکیات، الیکٹرونکس، ایرکنڈیشننگ کیمیکل انجنیرنگ، کان کنی، موسمیات، ارضی طبیعیات، بحری حیاتیات اور بایوکیمسٹری جیسے مضامین کی تعلیم کا کوئی انتظام ہی نہیں ہے۔ یہ خامیاں اُسی وقت دور ہوسکتی ہیں جب ہماری یونیورسٹیاں چند کالج اپنے ساتھ ملحق کر کے ممتحن ادارے بننے کے بجائے تدریس اور تحقیقات کی زرّیں روایات قائم کریں۔ اس کام کے لیے فنڈ ضرور درکار ہوں گے۔ چند سال پہلے ملک میں تمام سائنسی شعبوں پر کُل سالانہ آمدنی کا صرف ۰۱۴ فی صد حصّہ خرچ ہو رہا تھا۔ ترقی یافتہ ممالک میں یہ شرح کم ازکم دو فی صد ہے۔ ریاست ہائے متحدہ ہر سال ۱۲ ارب ڈالر سائنسی شعبوں پر خرچ کرتا ہے جس کا دس فی صد حصّہ بنیادی تحقیقات پر صَرف ہوتا ہے۔ اگر پاکستان میں اِس مقصد کے لیے ایک فی صد رقم بھی مخصوص کر دی جائے تب بھی کام چل سکتا ہے۔ ہمیں دوسری اقوام کے دوش بدوش آنے کے لیے عظیم تربیتی پروگرام شروع کرنا پڑے گا۔ ہمیں یونیورسٹیوں اور کالجوں میں تحقیقاتی سہولتیں دینی ہوں گی۔ ریسرچ کے لیے خاص اداروں کا قیام بھی ضروری ہے۔ اِس مقصد کے لیے ہم اور ہمارے دوست ملک آسانی سے یہ رقم مہیا کرسکتے ہیں۔ ضرورت ہے صرف عزم اور نیک نیتی کی۔

آخر میں میری دُعا ہے کہ: "اے خدا ہمیں اُن حالات کو قبول کرنے کی استقامت عطا فرما جنھیں ہم تبدیل نہیں کرسکتے، اُن حالات کو بدل ڈالنے کی ہمّت دے جنھیں ہم تبدیل کرسکتے ہیں اور ساتھ ہی دونوں کا فرق سمجھنے کی صلاحیت بخش۔ آمین!"



ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی

[شام ہمدرد کراچی ، اگست ۱۹۶۳ شمسی]

ڈاکٹر سلیم الزّماں صدّیقی

ڈاکٹر سلیم الزّماں صدیقی کی شخصیت تعریف سے بے نیاز ہے۔ برصغیر پاک و ہند کے ایک عظیم ترین سائنسداں کی حیثیت سے ہم ان کے نام سے اتنے مانوس ہیں جتنی برصغیر کی کسی دوسری ممتاز شخصیت سے۔ ڈاکٹر صدیقی بارہ بنکی (لکھنؤ کے قریب) میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۱۹ء میں مسلم یونی ورسٹی سے گریجویشن کیا۔ ۱۹۲۰ء میں لندن کے یونیورسٹی کالج میں داخل ہوئے اور ۱۹۲۱ء میں جرمنی روانہ ہو گئے، جہاں انھوں نے فرینک فرٹ یونی ورسٹی میں پروفیسر جے۔ فان۔ برون (ڈائریکٹر یونی ورسٹی کیمیکل انسٹی ٹیوٹ) سے تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۲۷ء میں ڈاکٹر صدیقی کو طبیعی فلسفے میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی۔ ۱۹۲۸ء میں ہندوستان واپسی کے بعد انھیں آیورویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج دہلی کے ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے لیے منصوبہ تیار کرنے کی دعوت دی گئی، جو دیسی دواؤں کی تحقیقات کے کام کے لیے مخصوص تھا۔ انسٹی ٹیوٹ میں آپ کی ڈائریکٹر شپ کا زمانہ اس قدر ممتاز اور درخشاں تھا کہ آپ نے اہم سائنٹفک کام اسی مدت میں ۱۹۲۸ء سے ۱۹۴۰ء تک انجام دیا۔ خصوصیت کے ساتھ دوا اُلشفاء (راولفیا سرپنٹینا) اور چاکسو کے سلسلے کے الکلائڈوں کی دریافتیں اسی زمانے کی یادگار ہیں۔

۱۹۴۰ء میں آپ نے کاؤنسل آف سائنٹی فک اور انڈسٹریل ریسرچ میں شمولیت اختیار کی اور کاؤنسل کے مرکزی معمل کے قائم مقام ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ آپ کے کارناموں میں بھلاواں اور نیم کی تحقیقات بھی شامل ہے۔ بھلاواں کا درخت جنگل کی پیداوار ہے جس کی آپ نے عظیم معاشی اہمیت کو ثابت کیا۔

آپ ۱۹۵۱ء میں پاکستان کاؤنسل آف سائنٹی فک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے اور اس کاؤنسل کی تنظیم کا کام آپ کے سپرد کیا گیا جس کا افتتاح ۱۹۵۳ء میں ہوا۔ معمل کی تدریجی ترقی کے بعد آپ اس قابل ہوئے کہ راولفیا سرپنٹینا کے اجزا کے دوائی خواص کا چھوڑا ہوا کام از سرِ نو شروع کریں۔ اس میں سے آپ اجملین اور سرپن ٹین کے سلسلے کے اساسیں اس سے پہلے برآمد کر چکے تھے۔ اس مرتبہ آپ نے تازہ اور سبز جڑوں کو استعمال کر کے ایک نئے طرز سے کام کا آغاز

کیا، جس کے نتیجے میں کئی الکلائڈی مرکبات جُدا کیے، جن میں سے سرپ اجملین میں فشار الدّم اور قلب میں رشک سازی کے ازالے کے خواص نمایاں طور پر موجود ہیں۔

ڈاکٹر صدّیقی کے سائنٹی فک کارناموں کا ملک اور ملک سے باہر دونوں جگہ اعتراف کیا گیا۔ ۱۹۴۶ء میں آپ کو ایم۔بی۔ای کا خطاب ملا اور ۱۹۵۸ء میں سائنس کی روسی اکادمی نے آپ کو سونے کا تمغہ دیا۔ اسی سال آپ کو فرینک فرٹ یونی ورسٹی کی جانب سے ڈاکٹر آف مڈیسن کی اعزازی ڈگری دی گئی اور صدر پاکستان کی طرف سے تمغۂ پاکستان عطا ہوا۔ قدرتی پیداوار کی کیمیا میں تحقیقات اور پاکستان میں سائنٹی فک انڈسٹری کی ترقی کے اعتراف میں اب آپ کو فیلو آف دی رائل سوسائٹی کا اعزاز بخشا گیا ہے۔ ۱۹۶۱ء میں آپ کو پاکستان نیشنل سائنس کونسل اور پاکستان کاؤنسل آف سائنٹی فک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ کا صدر مقرر کیا گیا۔ اس طرح آپ کا کام برابر جاری ہے۔ آپ ملک کی سماجی بہبود، نئے علاقوں میں معاشی وصنعتی حالات کی ترقی اور سائنس میں نئے ابواب کے اضافے میں مشغول ہیں۔ ہمیں آپ کی ذات پر فخر ہے۔

ڈاکٹر سلیم الزّماں صدّیقی کو طبِ مشرقی سے بڑی دل چسپی ہے۔ اِس طب کے مسائل پر ان کی نظر ہے اور وہ اس کے ذخائر اور پاکستانی ذخائر نباتاتِ دوائی پر تحقیقی کام کرنے کی تائید میں ہیں۔ آج شام وہ اِسی موضوع پر اظہارِ خیال فرمائیں گے۔

محمد سعید

پاکستانی ذخائرِ نباتاتِ دوائی دواسازی کے لیے اِن کی ترقی

ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی۔ ایف۔آر۔ایس

خواتین وحضرات!

مَیں آج شام حکیم محمد سعید صاحب کی دعوت پر آپ لوگوں کے درمیان انتہائی مسرّت محسوس کر رہا ہوں کہ مَیں "دواسازی کی صنعت کے لیے دیسی دوائی پودوں کے وسائل کے ارتقا" پر اظہارِ خیال کر سکوں گا۔ میں خصوصیت کے ساتھ اس موقع کا خیر مقدم کرتا ہوں، کیوں کہ تیس سال سے زیادہ عرصے سے اِس برصغیر کے دوائی پودوں کے اجزائے موثرہ کا مُطالعہ میری زندگی کا مشغلہ ہے۔ مزید برآں اِس وجہ سے بھی کہ اِس میدان میں میرے کام کا آغاز آیورویدک اور یونانی طبیہ کالج کے ریسرچ اِنسٹی ٹیوٹ میں ہوا، جس کو یونانی طب کے حاذقِ اعظم حکیم محمد اجمل خاں مرحوم نے قائم کیا تھا۔ میرے محترم دوست حکیم محمد سعید صاحب نے اپنی تعارفی تقریر میں جو کلماتِ مدح ارشاد فرمائے ہیں اس کے جواب میں فارسی کی ضربُ المثل "من آنم کہ من دانم" بہ خوبی چسپاں ہوتی ہے۔

پھر میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اپنے تحقیق کے کام کی عرق ریزی میں، جو میں نے دوائی پودوں کے اجزا پر کی یونانی اور آیورویدک اطبّا کے قریبی اتصال کا کس قدر ممنونِ احسان ہوں اور آخری سالوں میں محترم حکیم عبدالحمید صاحب صدر ہمدرد (وقف۔ دہلی) نے جن نوازشوں سے سرفراز کیا وہ خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ موصوف نے ان نظریات اور منصوبوں کو بروئے کار لانے کے لیے اپنی تمام صلاحیتوں کو مرتکز کر دیا ہے، جن کی حکیم اجمل خاں مرحوم نے داغ بیل ڈالی تھی اور جن کے لیے وہ مدت العمر انتہائی ناسازگار حالات کے باوجود نبرد آزما رہے۔

میری آج شام کی گفتگو کا موضوع بین الاقوامی سمپوزیم سے قریبی تعلق رکھتا ہے، جو ۱۹۶۰ء میں پشاور کے مقام پر یونسکو، پاکستان کونسل آف سائنٹی فک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ اور پاکستان

ایسوسی ایشن فار دی ایڈوانسمنٹ آف سائنس کی مشترکہ سرپرستی میں منعقد ہوا تھا۔ اس سمپوزیم کی کارروائی جنرل آف سائنٹی فک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ کے کافی ضخیم خصوصی نمبر کی شکل میں شائع ہوچکی ہے۔ میری دلی خواہش ہے کہ آپ میں سے وہ لوگ جو دیسی پودوں کی ترقی کے وسائل کے مسائل سے گہری دل چسپی رکھتے ہیں، اس کے مطالعے کے لیے کچھ وقت صرف کریں۔ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میرے لیے نہایت دشوار ہے کہ میں اپنی اس مختصر تقریر میں عمومی تبصرے سے زیادہ کچھ بیان کرسکوں۔ بہرصورت اِس سلسلے میں سب سے مقدم اور اوّلین مسئلہ یہ ہے کہ معتبر اور اصلی دوائی پودوں کے مواد کو جمع کرنے اور مناسب نگرانی میں اس کو خشک اور ذخیرہ کرنے کی سہولتوں کی تنظیم کی جائے۔ یہ بات دواسازی کی صنعت اور دواؤں کی برآمد کے لیے کافی اہم ہے۔ ناقص اور آمیزش والی دواؤں پر کام کرنا ریسرچ کرنے والے کے لیے مایوس کن ہوسکتا ہے۔ مجھے اپنے حالیہ تجربات کی بناپر اس نکتے کی وضاحت کرنے کی اجازت دیجیے، مجھے یقین ہے کہ یہی صورتِ حال برصغیر میں اُن تمام لوگوں کو درپیش ہے جو ریسرچ کے میدان میں میرے رفیق ہیں۔ پلٹ کر ۱۹۲۵ء پر نظر ڈالیے۔ میں نے اپنے ایک شاگرد کی رفاقت میں مشہور دوا چاکسُو سے ڈوالکلائڈ نکالے، جو چاکسُو کا فائدہ تراخوما (رمدجیبی۔ گکرے) میں مشہور ہے۔ ہماری ایک اشاعت میں یہ رپورٹ دی گئی تھی کہ اس دوا سے ایک اعشاریہ پانچ فی صد الکلائڈ دستیاب ہوئے ہیں۔ اُن میں سے ایک الکلائڈ میں، جس کا نام آئسوچاکسین ہے، فشار الدم کو کم کرنے کی قوی تاثیر پائی گئی۔ اس بنا پر میں نے اس الکلائڈ کی ساخت کا گہرا مُطالعہ کرنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں میرے چند نوجوان ساتھی شریک تھے لیکن میرے ساتھیوں میں سے کوئی ایک بھی ہماری سابقہ رپورٹ کے حاصل کے تیس چالیس فی صد سے زیادہ برآمد نہیں کرسکا۔ میں اپنے ساتھیوں کو الزام نہیں دُوں گا۔ اگر وہ ہماری سابقہ دریافتوں کو مشتبہ خیال کرنے لگے ہوں۔ بہرحال ہماری خوش قسمتی سے ہمدرد وقف کے کارکنان نے محنتِ شاقہ کے بعد منکشف کیا کہ ہمارے تخم چاکسو میں جس کا ہم مطالعہ کررہے تھے، ستّر فی صد نقلی تھے، جو بڑی عیّاری کے ساتھ ملا دیے گئے تھے!

اصلی دوا کی بہم رسانی کے مسئلے کی بنیادی اہمیت کے اعتراف میں ایک اعلا اختیارات کی فارماسیوٹیکل کمیٹی میں کافی غور وخوض کیا گیا، جو آزادی سے کچھ پہلے تشکیل دی گئی تھی۔ اس کمیٹی کی سفارشات میں پودوں کی صنعت کے سلسلے میں ریاست ہائے متحدہ امریکا اور روس کے خطوط پر ایک بیورو کے قیام کی سفارش بھی شامل تھی۔ عمل کے پروگرام کے ایک حصّے کے طور پر یہ طے کیا گیا کہ اس ادارے کو پودوں کی کاشت اور ترقی دینے کے لیے ایک منصوبہ تیار کرنا چاہیے اور معاشی پودوں کی اہمیت کے متعلق پوری معلومات حاصل کرنے کے لیے اِس ادارے کو عام جائزے لینے اور دواؤں کی برآمد و درآمد کے پورے اعداد وشمار رکھنے کا کام سپرد ہوا۔ میں وثوق کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ صرف انھیں خطوط پر منصوبہ

سازی سے ان مشکلات کا اچھی طرح مقابلہ کیا جا سکتا ہے، جن کا میں نے حوالہ دیا ہے۔
دوسرا انتہائی اہم مسئلہ دوا سازی میں استعمال ہونے والے دوائی پودوں کو کام میں لانے سے تعلق رکھتا ہے یعنی ایسی سہولتیں بہم پہنچانا ضروری ہے کہ کیمیا دان، ماہرِ نباتات، دواساز اور مُعالجین ایک دوسرے کے تعاون کے ساتھ ریسرچ میں حصّہ لے سکیں، کیوں کہ ان سب کی متحدہ کوششوں ہی سے نئے مُعالجاتی عوامل متعیّن کیے جا سکے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہم میں سے اکثر یہ جانتے ہوں گے کہ کس طرح ہم راولفیا کے الکلائڈ کو قلب وعروق اور دماغ کے امراض میں کام میں لانے سے چوک گئے۔ اِس دوا کے مطالعے میں پاکستان کے سائنس دانوں کے تقدم اور نمایاں کارکردگی کا تمام عالم میں اِعتراف کیا جاتا ہے لیکن راولفیا پر مبنی دواؤں کی پیداوار کے سالانہ اندراجات کا اندازہ تقریباً چالیس ملین ڈالر (ایک ملین ۔ دس لاکھ) ہوتا ہے۔ اس پیداوار میں نہایت چھوٹی کسر ہندوستان کے حصّے میں آتی ہے اور پاکستان اب تک اس فہرست سے خارج ہے۔ اس کا اصل سبب مشترکہ ریسرچ کی کمی ہے اور یہ بات اِس حقیقت سے روشن تر ہو جاتی ہے کہ اجملین کی دریافت کی رپورٹ ۱۹۳۱ء میں کی گئی تھی لیکن قلب کی بدنظمی کی مختلف صُورتوں کے علاج میں یورپ کو اس دوا کا منتخب دوا کی حیثیت سے اِعتراف کرانے میں تیس سال سے زیادہ عرصہ لگ گیا۔ میں امید کرتا ہوں کہ سرپ اجملین الکلائڈ کا مرکب (جو ہم نے تازہ (سبز) راولفیا کی جڑ سے برآمد کیا ہے، بہت سے اعتبارات سے فشارالدّم (بلند) اور اختلاجِ قلب کے علاج میں ریسربین اور اجملین سے بہتر ہے) ایسے حشر سے محفوظ رہے گی۔
میں نے ابھی راولفیا کی سبز جڑوں سے ایک الکلائڈ مرکّب کے استخراج کا حوالہ دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے پودوں کی پیداوار پر کام کے سلسلے میں کیمیائی اور دوائی خواص کے مطالعے کے دوران ہمیشہ تازہ، غیر خشک شدہ مواد پر خاص طور سے زور دیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مجھے یہ سبق پودوں سے ان کے اجزائے موثرہ کو جُدا کرنے کے دوران بڑی مشقت برداشت کرنے کے بعد حاصل ہوا لیکن بالآخر اس نظریے تک پہنچنے کے لیے میں بہت رہینِ منت ہوں دیسی طریقۂ علاج کا، جس میں دوا کو تازہ حالت میں استعمال کرنے کی تاکید کی جاتی ہے۔ اس سے پہلے اور بھی بہت سے سائنس کے کارکنان نے اسی خیال کا اظہار کیا ہے اور ان تبدیلیوں کا ذکر کیا ہے، جو پودوں کو خشک کرنے کے عمل کے دوران اجزا کی اصلی ساخت میں واقع ہو سکتی ہیں، لیکن اِس تنبیہہ پر کافی توجہ نہیں کی گئی ہے۔ اس کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ نباتی کیمیا کی تحقیق کا اکثر کام قدرتی دواؤں کی جائے پیدائش سے بہت دور مغربی ممالک میں انجام دیا گیا ہے۔ وہ سائنس داں جو ہمارے علاقے میں کام کر رہے ہیں۔ ان کے لیے یہ ایک اچھا موقع ہونے کے علاوہ ایک چیلنج بھی ہے۔
موضوعِ سخن کے اعتبار سے میں ایک اور نکتے کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔ قدرتی پیداوار اجزائے

موثّرہ کے سائنسی مطالعے سے دُہرا مقصد پورا ہوتا ہے۔ ایک تو اِس طریقے سے دوائی اہمیت کے نئے مواد سامنے آئے ہیں، دوسرے کیمیائی معالجے کے مطالعے کے لیے ایک اساس ہاتھ آتی ہے، جو شفائی عوامل کی اُن تالیفات میں ہماری رہنمائی کرتی ہے، جو قدرتی نوعیت کی کیمیائی ساخت کی پیداوار پر مبنی ہوتی ہے۔ بدیہی معاشی اسباب کی بنا پر ترقی یافتہ مغربی ممالک کا اس کام سے یہ مقصد ہے کہ وہ اپنی دواسازی کی صنعت کو ممالک حارّہ اور گرم وتر کی محتاجی سے نجات دلائیں۔ اِس رُجحان سے بیماریوں کے ازالے اور ان سے تحفظ نیز انسانی بہبود کی ترقی میں امداد تو ضرور ملی ہے لیکن اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ تالیفی دوا کے استعمال کے ساتھ ذاتی ملکیت کی دواؤں کا سیلاب امنڈ آیا ہے، جو عکس بین[1] کی طرح اپنے زنگا رنگ مناظر سے نظر کو دھوکا دیتی ہیں اور اکثر مریضوں سے زیادہ دواسازی کے بڑے بڑے کارخانوں کو نفع پہنچاتی ہے۔ ایسی مثالوں کی کمی نہیں ہے، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدرتی دواؤں کے جزوِ موثر اور ضمنی جزوِ موثر کے توانائی بخش و ترقیاتی اثرات اور موثر وغیر موثر اجزا کے باہمی فعل و انفعال سے قطعی طور پر معالجاتی فوائد مرتب ہوتے ہیں۔ راؤلفیا کے الکلائڈی مرکبات پر ہمارے موجودہ مطالعے سے بھی اِس نظریے کی توثیق ہوتی ہے اور اس زاویۂ نگاہ سے دوائی پودوں کا عمیق مطالعہ اس میدان میں سائنٹی فک کام کرنے والوں کو واضح اور پُرثمر نتائج تک پہنچانے کا کام دے سکتا ہے۔

مجھے اندیشہ ہے کہ اس بات سے، جو مَیں نے ابھی کہی ہے، مَیں نے ایک بہت بڑا نزاعی مسئلہ چھیڑ دیا ہے۔ دواؤں کی معیار بندی پر ہمدرد دواخانے کی ایک حالیہ یادداشت میں یہ استدلال پیش کیا گیا ہے کہ یونانی عربی طب اِس معنیٰ میں کثیر الاجزا دواسازی کی طب ہے کہ وہ ایک ایسے اصول پر مبنی ہے جس کو اب 'ترکیبی علاج' (کمبائنڈ تھیراپی) کہا جاتا ہے اور اس کے دوائی مرکبات کثیر دوائی اجزا پر مشتمل ہوتے ہیں، جن پر معیار بندی کے معمولہ اصول کا منطبق کرنا مشکل ہے۔ یادداشت میں اس بات پر بھی زور دیا گیا ہے کہ اسی وجہ سے یونانی طب میں مرکب کے مختلف موثر اور مصلح اجزا کے مجموعی اثرات پر زور دیا جاتا ہے نہ کہ کسی ایک جزوِ موثر پر۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، مجھے اس کے بنیادی تصور سے کوئی اختلاف نہیں ہے اور وسیع ریسرچ میں اس کی پیروی سے بہت زیادہ فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ بہرحال اس سلسلے میں اس

---

[1] عکس بین: ایسی نلکی جس کے ذریعے سے سڈول اور متناسب صورتیں دیکھی جاتی ہیں، جو رنگین شیشے کے ٹکڑوں سے پیدا ہوتی ہیں اور جن میں نلکی کے پھرانے سے تغیر و تبدل واقع ہوتا ہے۔ (ہمدرد صحت)

حقیقت کو نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دینا چاہیے کہ "ترکیبی علاج" میں کیمیائی طور پر اچھی طرح متعین کیے ہوئے مواد کا ایسا فارمولا بنایا جا سکتا ہے، جسے صحیح طور پر مکرّر تیار کیا جا سکے۔ برخلاف اس کے یونانی اور دوسرے عقاقیری مرکبات کی صورت میں ان کی معیار بندی اور مکرّر تیاری کی راہ میں کبھی ختم نہ ہونے والے مسائل پیش آئیں گے۔ مجھے اپنے نئے تجربے سے اس کی وضاحت کی اجازت دیجیے۔ راولفیا سرپینٹینا کی جڑوں سے پانچ الکلائڈی اساسوں کا ایک سلسلہ برآمد کیا گیا۔ یہ جڑی ہندوستان کے صوبۂ بہار کے گرم و تر خطے کی پیداوار تھی۔ کئی سال کے بعد ۱۹۶۰ء میں ایسی جڑوں پر کام کرنے سے، جو دہرہ دون کی وادی کے معتدل علاقے سے حاصل کی گئی تھی، معلوم ہوا کہ اس میں زرد سرپنٹین گروپ کی اساسیں یکسر غائب ہیں اور وہ زیادہ تر ریسرپین پر مشتمل ہے، جو اب فشار الدم اور دماغی امراض کے علاج میں بے حد مشہور ہو چکی ہے۔ علاوہ ازیں قریب زمانے کے تجربات سے ہم نے غیر منظم رفتار قلب اور فشار الدم میں سرپ اجملین کے خواص میں وسیع اختلافات مشاہدہ کیے ہیں۔ یہ اختلافات جڑ کی عمر، آب و ہوا اور زمین کے اختلافات پر مبنی تھے۔ بلاشبہ یہ ایک مسئلہ ہے، جو حقیقت پسندانہ تحقیق کے لیے ایک زرخیز میدان پیش کرتا ہے، جو قدیم اور جدید دونوں علاج کے طریقوں کے لیے بھی نہایت قیمتی ثابت ہو سکتا ہے۔ قدیم و جدید کے الفاظ استعمال کرتے ہوئے مجھے اپنے بعض سائنٹفک رفیقوں کا اعتراض یاد آتا ہے، جو 'قدیم' اور 'جدید' نظام ہائے علاج کے الفاظ پر کرتے ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ آگے چل کر کسی وقت طب کی صرف ایک سائنٹفک بنیاد ہو سکتی ہے۔ پشاور کے سمپوزیم میں اس نکتے کو بحث کے لیے اٹھایا بھی گیا تھا۔ متحدہ جمہوریہ عربیہ کے پروفیسر صابر، جنھوں نے الکلائڈ کی حیاتیت کے مطالعے میں بڑا کام کیا ہے، مضبوطی سے اس رائے پر قائم تھے کہ یونانی اور آیورویدک علاج کے طریقوں کے ساتھ ہم زمانی کا سا سلوک ہونا چاہیے، (یعنی اس معاملے میں زمانے کے فرق کا امتیاز نہ کیا جائے) لیکن دراصل یہ معاملہ اس قدر سادہ نہیں ہے اور میں نے آخری سیشن کی اختتامی تقریر کے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس مبحث پر اپنے دلائل کو ایک حد تک وضاحت سے پیش کیا تھا۔ نہ تو میرے پاس اتنا وقت ہے اور نہ آپ میں اس کے سننے کی تاب ہے کہ اِس موقع پر اس کا اعادہ کروں۔ بہر حال یہاں میں اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ بنیادی طبی مضامین ـــــــ کیمیا، حیاتیاتی کیمیا، علم خواص الادویہ اور منافع الاعضا کی حیرت انگیز ترقی کے باوجود طب از روئے حقیقت ابھی تک اپنے علم و عمل میں بیشتر تجرباتی ہے، کیوں کہ اس کے مباحث انتہائی پیچیدہ ہیں۔ مثلاً ہم آج کیمیائی ساخت اور دوائی اثرات کے باہمی تعلق کے بارے میں برائے نام جانتے ہیں اور دوا کے یقینی طریقۂ کار کے علم سے تقریباً بے خبر ہیں اور یہ بات بلاشبہ جدید طب کے

لیے معقول وجوہات فراہم کرتی ہے کہ وہ تحقیق و مطالعے کے لیے بار بار قدیم طب کی طرف پلٹ کر دیکھے اور طب کے قدیم نظریاتی تصورات اور علاج سے بھی صَرفِ نظر نہ کرے۔ بعض عظیم ترین نظریاتی طبیعی، ایٹم کے مرکزی مفروضے کی پیچیدگی اور اس کے نام نہاد بنیادی ذرّات کے تمام تر اٹالے کے باوجود فی الحقیقت حکیم دیماقراطس کے نظریۂ وحدتِ جوہر کو احتیاط سے ٹٹولنے اور کان دھر کر سننے کی کوشش کرتے رہتے ہیں، جس کو اس دُنیا سے گزرے ہوئے ڈھائی ہزار سال سے زیادہ ہو چکے ہیں۔ یہ ہمارے سامنے ایک صحت مند مثال ہے۔

خواتین و حضرات! مجھے تکلیف ہو رہی ہے کہ میں نے ایسی باتیں طوالت کے ساتھ بیان کرنی ہیں، جو موضوع سے بڑی حد تک منحرف و متجاوز معلوم ہوتی ہوں گی، آپ کا اتنا وقت لیا۔ بہر حال میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ وہ باتیں ہیں، جو کہی جانی چاہییں۔ نہایت پیچیدہ مسائل سے دوچار ہونے میں ہماری خود اعتمادی کو ذرا سا ٹھونسا دیا جائے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ میں اپنی جگہ پر بالکل مطمئن ہوں کہ سائنٹیفک ریسرچ کی راہ میں اسی انکسار و عاجزی اور پُرخلوص تن دہی سے ہم قدیم طریقۂ علاج کا صحیح معنٰی میں احیا کر سکتے ہیں اور جو دلائل میں نے آج شام کی تقریر میں پیش کیے ہیں، وہ مستقبل میں دوا سازی کی ترقی کو استوار کرنے کے لیے دیسی دوائی پودوں کے وسائل کو کام میں لانے کی بھرپور تائید کرتے ہیں۔

شامِ ہمدرد۔ کراچی
اگست ۱۹۶۳ شمسی



مسٹر جسٹس ایس ۔ اے رحمان

[شام ہمدرد لاہور ، ٥ ستمبر ١٩٦٣ شمسی]

مسٹر جسٹس ایس۔اے۔رحمان

مجھے پچھلے کئی سالوں سے ہر ماہ یہاں آکر اہلِ لاہور کی خدمت کا موقع مل رہا ہے اور کراچی کی طرح یہاں بھی میں اس میدان میں اپنی محدود صلاحیتوں سے جو خدمت کر رہا ہوں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں۔ خاص طور پر اس لیے بھی کہ یہاں کی متواتر حاضری سے مجھے بہت سے اچھے لوگوں سے ملنے کا موقع ملا۔ یہاں مجھے ایسے دوست ملے جن کے خلوص کے آئینے میں مجھے زندگی کے بہت سے نشیب و فراز سمجھنے کا موقع ملا۔ سچی بات یہ ہے کہ ایسے دوستوں کا ملنا اور ان کا محبت بھرا تعلق فکر و نظر کے بہت سے گوشے انسان پر واضح کر دیتا ہے۔ لاہور کا قدیم اور حسین شہر اپنی تمام تر تاریخی عظمتوں اور ثقافتی رعنائیوں کے ساتھ انسان کو اپنے میں جذب کر لینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ لاہور کے صاحبِ نظر اور اہلِ علم دوستوں سے مِل کر مجھے قلبی طمانیت حاصل ہوتی ہے اور مسرت کا احساس ہوتا ہے لیکن اسی کے ساتھ اپنے ماہانہ قیام کی مختصر مدت کی وجہ سے تشنگی کا ایک احساس بھی ہوتا ہے۔ اس تشنگی کو دُور کرنے کے لیے میرے ذہن نے ایک راہ نکالی۔ وہ راہ یہ ہے کہ دوستوں سے انفرادی ملاقات کے لطف کے ساتھ اجتماعی ملاقات کی صورت بھی پیدا کی جائے۔ چناں چہ یہ پہلی اجتماعی ملاقات ہے جس میں ہم سب اس وقت شریک ہیں۔ کراچی میں بھی اپنی گوناگوں ذمّے داریوں کی وجہ سے میں نے دوستوں سے ملاقات کی یہی سبیل پیدا کر رکھی ہے۔ ایسی ملاقاتوں میں اپنی علمی پیاس بجھانے کی بھی شکل پیدا ہو جاتی ہے اور ہر ماہ کسی نہ کسی صاحبِ نظر، ماہرِ فن یا اہلِ فکر کے افکار و آرا سے مستفید ہونے کا موقع ہو جاتا ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ لاہور میں اس سلسلے کے آغاز میں پاکستان کی ایک قابلِ فخر شخصیت نے میری ہمت افزائی کی۔ میری مراد عالی جناب ڈاکٹر جسٹس ایس۔اے۔رحمان صاحب (جج سپریم کورٹ آف پاکستان) سے ہے، جن کے بے پایاں خلوص نے مجھے اس درخواست کی جُرأت بخشی کہ وہ اس کا افتتاح فرمائیں اور پھر آپ نے ازراہِ کرم اس درخواست کو قبول بھی فرمالیا۔ میں اس نوازش کے لیے بے حد ممنون ہوں اور متشکر۔

محترم جسٹس رحمان صاحب کا اس اجتماع سے خطاب ہم سب کے لیے باعثِ مسرت ہے جسٹس رحمٰن صاحب پاکستان کی ان چند گنی چُنی ہستیوں میں سے ہیں، جن کا وسیع علم، جن کا متوازن فکر اور جن کی عمیق نظر اہلِ ملک کے لیے روشنی کے مینار کی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ کی شخصیت گوناگوں خصوصیات کی حامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہم اور نازک منصبی ذمے داریوں کے باوجود علم و ادب کے میدان میں بھی آپ کے نتائج فکر سے ہمیں مستفید ہونے کا موقع مل جاتا ہے۔ آپ کی نظر جہاں عصرِ حاضر کے افکار و نظریات پر ہے وہاں اسلامی علوم اور قرآنی معارف کی روشنی سے بھی آپ کے دل و دماغ منور ہیں، جس کا اندازہ آپ کے خطبات کے مطالعے سے ہوتا ہے، جو ہماری خوش قسمتی سے اسی سال "حدیثِ دل" کے نام سے شائع ہو گئے ہیں۔ غرض آپ کے افکار اور آپ کے ذاتی اوصاف دونوں میں قدیم و جدید کا ایسا خوش گوار امتزاج ہے، جو وقت کی بہت بڑی ضرورت ہے، مگر جو نایاب ہے۔

مسٹر جسٹس رحمان نے آج جو موضوع اپنے خیالات کے اظہار کے لیے منتخب فرمایا ہے، اس کی اہمیت، افادیت اور نزاکت کا اندازہ ہم سب کو ہے۔ عدلیہ عوام کے حقوق کی محافظ اور ہر قسم کی آزادی کی نگہبان ہے۔

عدلیہ مقننہ اور انتظامیہ میں تفریقِ اختیارات اپنی جگہ مسلم لیکن عدلیہ کی آزادی اور بلندی بھی اہم اور ناقابلِ انکار ہے۔ بہر حال "ملکی نظام میں عدلیہ کے مقام" پر عدلیہ کے ایک بڑے سربراہ کے خیالات سے استفادے کا موقع میسر آنا ہمارے لیے بڑی خوشی کی بات ہے۔

محمد سعید

مُلکی نظام میں عدلیہ کا مقام

ڈاکٹر جسٹس ایس۔ اے۔ رحمان۔ ہلالِ پاکستان۔ جج سپریم کورٹ آف پاکستان

برادرانِ گرامی!
میرے مکرم دوست حکیم حافظ محمد سعید صاحب دہلوی ایک ہمدرد طبیب ہی نہیں بلکہ ایک مجلس طراز ادیب بھی ہیں۔ وہ لکھتے بھی ہیں اور بات کرنے کا سلیقہ بھی رکھتے ہیں۔ میرے پاس ایک مرتبہ تشریف لائے تو باتوں باتوں میں انھوں نے کراچی کی شاموں کو بہلانے کے لیے اپنی خوش گوار کوششوں کا ذکر چھیڑ دیا۔ ان کوششوں کو سراہنے کے جرم میں مجھے فوراً گرفتار کر لیا گیا! کہنے لگے کراچی کی مجلسوں کا سلسلہ لاہور میں بھی جاری کرنے کا ارادہ ہے، اور توقع ہے کہ آپ اس نظامِ کار کی افتتاحی تقریب میں شریک ہو سکیں گے۔ بات اس سادگی سے ہوئی کہ مجھے ہاں کہتے ہی بنی۔ کچھ تحت الشعور میں یہ خیال بھی گزرا کہ اگر نہ کہہ دوں تو خیر نہیں۔ کسی موقع پر تلخیٔ روزگار چشیدہ بہ ورق نقرہ پیچیدہ قِسم کی کوئی کڑ وی کسیلی معجون تجویز کر کے کام و دہن کو آزمائش میں نہ ڈال دیں۔ میری عافیت کوشی کا تکملہ یہ ہے کہ اس تقریب میں مجھے آپ کی سمع خراشی پر مامور کر دیا گیا ہے!

خیر یہ تو رہا جملہ افتتاحیہ، اب خبریہ کی طرف رجوع کیجیے۔ میں نے اس گفتگو کا عنوان "مُلکی نظام میں عدلیہ کا مقام"، تجویز کیا ہے۔ مجھے مناسب معلوم ہوا کہ اپنے ناچیز خیالات کو ایک ایسے موضوع تک محدود رکھوں، جس سے مجھے براہِ راست واقفیت کے موقعے حاصل رہے ہیں۔ یہ تو ایک پیش پا اُفتادہ حقیقت ہے کہ معاشرے کی تشکیل افراد کے تعامل اور تعاون سے ہوتی ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ انسانی معاشرے کی بنیاد اوائل میں نسل اور قبیلے پر تھی۔ اس نظام میں سردارِ قبیلہ محیطِ کُل ہوتا تھا۔ اس کا لفظ قانون تھا اور اس کا فیصلہ اٹل۔ اُس دَور میں زندگی سادہ تھی اور پیچیدگیوں سے خالی۔ ارتقا کی منزلیں طے کرتے کرتے تمدّنی زندگی کی نئی نئی راہیں کھلیں۔ تجارت، صنعت و حرفت میں ترقی ہوئی۔ آمد و رفت کے

وسائل وسیع ہوئے۔ مختلف ملک اور قومیں ایک دوسرے کے قریب آئیں۔ نئے نئے مسائل پیدا ہوئے، تب اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ تمدّن کا کاربار تقسیمِ کار کے اصُول پر چلایا جائے۔ اسی اصول کے ماتحت متمدّن ممالک میں انتظامیہ، مقنّنہ اور عدلیہ میں تفریق کی گئی تاکہ کارکردگی میں اضافہ ہو اور روز افزوں مسائل کے حل کے لیے ہر شعبے میں ماہرین و محققین پیدا ہوسکیں۔ ان تینوں اداروں کی حدود قائم کرنے کے لیے دستورِ اساسی اور قانون وضع ہوئے اور حدود کا تعین معاشرے کو افراتفری اور بدنظمی سے بچانے کے لیے لازمی تھا۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا عطائی نسخہ، حیاتِ اجتماعی کے پیکر کو توازن نہ بخش سکتا تھا۔ یہ تفریق ہمارے ہاں بھی موجود ہے۔

ظاہر ہے کہ ان تینوں بنیادی اداروں میں سے کوئی ایک اگر دوسرے اداروں کے احاطۂ اختیار پر تجاوز کرے تو ملکی نظام کو ثبات نہ مل سکے گا۔

لہٰذا یہ ضروری ہے کہ جب اِس قسم کا اختلاف رُونما ہو تو ان میں سے کسی ایک ادارے کو یہ اختیار ہونا چاہیے کہ وہ رفعِ اختلاف کے لیے حَکم بن جائے۔ تھوڑے سے غور و فکر سے یہ امر روشن ہوجاتا ہے۔ یہ وظیفہ عدلیہ کے ہی سپرد کیا جاسکتا ہے۔ انتظامیہ وہ فُعّال ادارہ ہے جس کی معرفت قوم کا اجتماعی ارادہ بروئے کار آتا ہے لیکن مصالحِ ملّی اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ اس مقصد کی تکمیل اس طریقے کے مُطابق ہو جس کی نشان دہی مُلکی قوانین سے ہوتی ہے۔ یہ انسانی کمزوری ہے کہ کام کرنے والا اپنا مقصُود حاصل کرنے کے لیے بعض اوقات طریقۂ کار کی قانونی حدبندیوں کو نظر انداز کردیتا ہے یا کم از کم اس کا امکان ہے کہ وہ اس آزمائش میں پورا نہ اُترے۔ مقننہ ایک ایسا ادارہ ہے جو ملکی آبادی کے مختلف عناصر کا نمائندہ ہوتا ہے اور اس لیے اس میں ہر قسم کے افراد شامل ہوتے ہیں، مثلاً وکیل، زمیندار، تاجر، صنّاع وغیرہ۔ بہ حیثیتِ مجموعی ایسے ادارے کے لیے کسی نزاعی معاملے پر منصف بن کر فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ خواہ وہ اختلاف دُو افراد میں ہو یا اداروں میں۔ ان کے اجلاس خاص خاص وقتوں پر اور ایک مخصُوص مقام پر ہی ہوسکتے ہیں۔ لے دے کے عدلیہ ہی ایک ایسا ادارہ ہے جس سے توقع کی جاسکتی ہے کہ اپنی تربیت اور خصُوصی صلاحیتوں کے پیشِ نظر ان مشکلوں کو سُلجھا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام متمدّن ممالک میں عدلیہ کی آزادی پر خاص زور دیا جاتا ہے تاکہ کسی معاملے میں مخصُوص مفاد کی عصبیّت انصاف کے آڑے نہ آئے۔ اس کی معرفت شخصی آمریت کے بجائے قانون کی حکومت قائم ہوسکتی ہے اور اسی طرح استبداد اور خود رائی کے عناصر کاربارِ عدل سے خارج ہوسکتے ہیں۔

یہ امر اس بات سے بھی واضح ہو جاتا ہے کہ نزاعی معاملات طے کرنے کے لیے جمہور کا اعتماد عدلیہ پر نسبتہً زیادہ ہوتا ہے۔ چناں چہ ہمارے ملک میں بھی عوام کے نمائندوں کی طرف سے مطالبہ ہوا کہ سابق دستور کے مطابق بنیادی حقوق کی نگہداشت عدلیہ کے سپرد ہو۔ حکومت نے بھی یہ مطالبہ تسلیم کر لیا ہے اور اس بارے میں قانون سازی کا مرحلہ باقی ہے۔ عوامی رائے کے مطابق عدلیہ ہی جمہور کی آزادیوں اور ان کے قانونی حقوق کی محافظ ہو سکتی ہے۔ بات یہ ہے کہ عدالتوں سے نہ صرف انصاف ملنے کا امکان ہے بلکہ اس کے حصول کے ظاہری لوازمات بھی اس ادارے کے طریقِ کار میں موجود ہیں۔

یہ امر قابلِ فہم ہے کہ بعض اوقات انتظامیہ کو عدلیہ سے شکایت پیدا ہوتی ہے۔ انتظامیہ کے اراکین غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ جج کچھ سر پھرے قسم کے ہوتے ہیں جنھیں عملی دنیا کا کوئی تجربہ نہیں ہوتا، اِس لیے وہ اپنی قانونی مُوشگافیوں سے چلتی گاڑی میں روڑا اٹکاتے رہتے ہیں۔ لہٰذا بعض اُمور اُن کے اختیارِ سماعت سے باہر ہی رہنے چاہییں۔ گورنمنٹ کا کاروبار آج کل اس قدر پیچیدہ اور وسعت پذیر ہے کہ لامحالہ بعض امور میں انتظامیہ کے افراد یا ادارے ہی فیصلہ کُن اقدام کر سکتے ہیں اور ایسے معاملات ہر متمدّن ملک میں انتظامی اداروں کے ہی سپرد کیے جاتے ہیں جن کو عدالتوں کی صوابدید پر چھوڑنا طوالت اور تضیعِ اوقات کا باعث ہوگا، مثلاً لائسنسوں وغیرہ کا اجرا لیکن عدالتیں کسی ادارے یا فرد سے تعرض نہیں کرتیں، جب تک وہ قانون کی حدود میں رہے۔ ان کا مقصود چلتی گاڑی میں روڑا اٹکانا نہیں بلکہ اُسے متعیّنہ پٹڑی پر قائم رکھنا ہے۔

مُقننّہ کے ساتھ ساتھ عدلیہ کے متعارض ہونے کا امکان اور بھی کم ہے، البتّہ یہ ہو سکتا ہے کہ مُقننّہ کی نیت ایک قانون پاس کر دینے سے کچھ ہو اور الفاظ کا قالب، جس کو اس مقصد کے لیے اِختیار کیا گیا ہے، اس نیت سے ہم آہنگ نہ ہو۔ ایسی صورت میں عدلیہ کا یہی فرض ہے کہ وہ قانون کی عبارت کی تعبیر یا تفسیر معیّنہ اصولوں اور قاعدوں کے مطابق ہی کریں اور اگر نتیجہ خاطر خواہ نہ ہو تو مقننّہ کو اختیار ہے کہ قانون کی ترمیم یا اصلاح سے اپنا عندیہ واضح کر دے۔ عدالتیں مجرّد نیتوں کی عالِم نہیں ہیں، نیّت کا فیصلہ مستعملہ الفاظ سے ہی کیا جا سکتا ہے۔

جرائم کے انسداد کے لیے پولیس کا محکمہ نہایت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یہ شکایت بعض اوقات سُنی جاتی ہے کہ عدالتی کارروائی کے طفیل بعض بے گناہ سزا پا جاتے ہیں اور گناہ گار بَری الذمہ قرار پاتے ہیں۔ پولیس کی طرف سے یہ عذر پیش کیا جاتا ہے کہ انھیں فراہمیٔ شہادت

میں عدالتی نقطۂ نظر سامنے رکھنا پڑتا ہے اور اگر ایسی شہادت، جو عدالت کے لیے قابلِ قبول ہو، میسّر نہ آئے تو اس کی اختراع اور ایجاد کو جائز سمجھا جاتا ہے، بہ شرطیکہ صاحبِ تفتیش کو اخلاقی طور پر استغاثہ کی صداقت پر یقین ہو۔ یہ روش خطرے سے خالی نہیں۔ ہر فردِ بشر سے غلطی ہوسکتی ہے اور ارکانِ عدالت اِس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں۔ اگر عدالت میں اس "ایجادِ بندہ" کا پول کُھل جائے، جیساکہ اکثر ہوتا ہے تو اچھا بھلا استغاثہ بھی شک اور شبے کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ بھی ایک غلط خیال ہے کہ عدالتیں کسی خاص قبیل کی شہادت پر مُصر ہوتی ہیں۔ ان کا اصرار صرف اس بات پر ہوتا ہے کہ جو شہادت بھی پیش ہو، خواہ آئینی ہو یا قرائن کی، ایسی ہو کہ اس سے بلاشبہ ملزم کی مجرمیت کا معقول نتیجہ نکلتا ہو۔ لہٰذا تفتیشی افسروں کو عدالتوں کی انصاف پسندی پر اِعتماد کرکے واقعات کے متعلق صحیح معلومات پیش کرنی چاہییں۔

اس مسئلے کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ عدالتیں انصافِ مطلق کی دعوے دار نہیں ہوتیں، بلکہ انصاف بروئے قانون کی ہی مجاز ہیں۔ متمدّن معاشرے میں ایسا ہونا لازمی ہے۔ یہ ضروری ہے کہ مُعاشرے کا ہر فرد قانون کی اہم دفعات سے واقفیت رکھے تاکہ وہ اپنی زندگی قانون کی حدود کے اندر رہ کر گزار سکے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہو کہ قانون جہاں تک ممکن ہو متعین شکل میں موجود ہو، نہ کہ اہلِ عدالت کے کامل اختیارِ تمیزی پر موقوف۔

عدالتوں اور وکلا کا چولی دامن کا ساتھ ہے، دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ اگر وکلا دیانتداری سے اصل واقعاتِ مقدمہ کو روشنی میں لانے کی کوشش کرتے ہیں تو ایک اہم فریضہ ادا کرتے ہیں۔ ان کی امداد کے بغیر معاملے کی حقیقت تک پہنچنا عدالت کے لیے دشوار ہو جاتا ہے لیکن بعض اوقات غلط اندیش فریقوں کی انگیخت پر بعض وکلا بھی اِظہارِ حق کے بجائے اخفائے حق کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ خدا ناترس گواہوں کی دروغ بافیاں اس پر مستزاد۔ اندریں حالات عدالتوں کا کام مشکل در مشکل کی صورت اِختیار کرلیتا ہے۔ عدل درحقیقت تبھی اپنی تابانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوسکتا ہے جب فریقین، گواہ، وکلا اور تفتیشی عملہ سب اس بات کا التزام کریں کہ عدالت کے سامنے صرف صحیح واقعات لائے جائیں اور جودتِ طبع اس بات پر مرکوز ہو کہ ان واقعات کی روشنی میں کیا قانونی نتائج مترتب ہوتے ہیں۔ بعض بدخود غلط فریقینِ مقدمہ ججوں تک سفارش پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں اور بعض پیروں فقیروں کی مزعومہ خدارسی کو تعویذ کامیابی بنا کر ججوں پر جھاڑ پھونک سے حملہ کرتے ہیں۔ یہ سرچشمۂ عدل کو گدلا کرنے کی صورتیں ہیں۔ مجھے اِس ضمن میں وہ روایت یاد آتی ہے جس کے مطابق رسولِ کریمؐ نے فرمایا کہ ہوسکتا ہے کہ میں بھی بتقاضائے بشریت کسی ایسے فریق کے حق میں فیصلہ کر دوں جو دوسرے سے

زیادہ چرب زبان ہو لیکن اگر وہ حق پر نہیں تو دراصل آگ کا ایک ٹکڑا ہے جو اس کے پاس گیا۔ اسے اختیار ہے کہ اسے اٹھائے یا چھوڑ دے۔ کاش یہ وعید ہمارے مقدمہ باز عوام کے دلوں میں جاگزیں ہو جائے۔

اسلام نے ہمیں عدل کا ایک نہایت بلند معیار دیا ہے۔ عدل صفتِ خداوند کریم ہے۔ واللّٰہ یقضی بالحق۔ پھر قرآنِ کریم تنبیہہ کرتا ہے، ولا یجرمنکم شنآن قوم الا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقوٰی "خبردار! کسی قوم سے دشمنی تمھیں ناانصافی پر آمادہ نہ کرے۔ عدل کرو۔ یہ تقوےٰ سے زیادہ قریب ہے۔" اسلامی تاریخ کے اوراق اس بات پر شاہد ہیں کہ ہمارے اسلاف نے عدل کے اس زرّین اصول کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھا۔ حضرت عمرؓ کی خلافت کا واقعہ ہے کہ ایک یہودی نے حضرت علیؓ پر نالش کی۔ جب یہودی پیش ہوا تو حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ سے کہا "یا ابو الحسن! تم بھی مدعی کے برابر کھڑے ہو جاؤ۔" حضرت علیؓ کے چہرے پر تکدر کے آثار ظاہر ہوئے۔ مقدمے کے اختتام کے بعد حضرت عمرؓ نے ان سے دریافت فرمایا کہ کیا انھیں اس سے ملال ہوا ہے کہ انھیں ایک یہودی کے دوش بدوش کھڑا کیا گیا؟ حضرت علیؓ نے جواب میں فرمایا "نہیں، اے عمرؓ تم نے میرے نام کے بجائے میری کنیّت سے مجھے خطاب کیا۔ مجھے یہ خیال ہوا کہ کہیں یہودی یہ نہ سمجھے کہ تم میری رعایت کرو گے۔" اللہ اللہ، یہ تھی اُن بزرگوں کی احتیاط کہ نہ صرف انصاف ہو بلکہ صریحاً نظر آئے کہ انصاف ہوا۔

اِس بلند معیار کی موجودگی میں پاکستانی ججوں پر بڑی نازک ذمّے داریاں عائد ہوتی ہیں۔ انھیں اس ملک میں اپنے بھائی بندوں کے درمیان رہ کر بھی اِس ڈھب سے زندگی گزارنی چاہیے کہ کسی کو ان پر جنبہ داری کا شبہ نہ ہو۔ بشریت کے تقاضے خطا کی طرف لے جاتے ہیں۔ یہ جج دار و مرنے کی سی صورت ہے، لیکن اسلامی نصب العین کا تقاضا ہے کہ امارت کو فقر کے ساتھ باہم کیا جائے جو انسان کو دنیادار ہوتے ہوئے بھی دنیاوی علائق کی آلائشوں سے پاک رکھتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے ججوں کو حضرت ابو بکرِ صدیقؓ کے ان الفاظ کو مشعلِ راہ بنانا چاہیے، جو آپ نے اپنے پہلے خطبۂ خلافت میں ارشاد فرمائے تھے:-

اَلضَّعِیْفُ مِنْکُمْ قَوِیٌّ عِنْدِیْ حَتّٰی اُرُدَّ عَلَیْهِ حَقَّهٗ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ وَالْقَوِیُّ مِنْکُمْ ضَعِیْفٌ عِنْدِیْ حَتّٰی اٰخُذَ الْحَقَّ مِنْهُ۔

شامِ ہمدرد - لاہور
۵ ستمبر ۱۹۶۳ شمسی

ڈاکٹر اِشتیاق حسین قریشی

۱۹۰۳ شمسی

ڈاکٹر قریشی صاحب ایک ممتاز ماہرِ تعلیم، ایک نامور مورخ اور محقق، ایک بلند پایہ مصنف اور ایک اعلا منتظم ہیں اور ان تمام مختلف حیثیتوں اور ٹھوس خدمات کا اندازہ و اعتراف ہمارا ملک کرچکا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ۱۹۰۳ش میں پیدا ہوئے۔ دہلی یونی ورسٹی سے ۲۶ش میں تاریخ میں بی اے آنرز اور ۲۸ش میں ایم۔ اے کیا پھر ۲۹ش میں فارسی میں ام۔ اے کیا۔ ۳۹ش میں کیمبرج یونی ورسٹی سے تاریخ میں پی۔ ایچ۔ ڈی کیا۔ ایم۔ اے کرنے کے بعد ہی آپ نے سینٹ اسٹیفن کالج دہلی میں پڑھانا شروع کیا۔ ۴۰ش میں آپ دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ تاریخ میں ریڈر کی حیثیت سے مامور ہوئے۔ اِسی یونی ورسٹی میں دو سال بعد پروفیسر اور اس کے صرف ایک سال بعد شعبۂ فنون میں ڈین مقرر کیے گئے۔ ۴۷ش تک آپ اپنی اسی حیثیت میں علمی خدمات انجام دیتے رہے اور اِسی دوران میں آپ نے اپنی مشہور کتاب "دی ایڈمنسٹریشن آف سلطنتِ دہلی" تالیف فرمائی۔

آزادی کے بعد ہماری خوش قسمتی سے آپ نے پاکستان کی خدمت کرنے کا فیصلہ فرمایا اور آپ کو پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی کا رکن نامزد کیا گیا۔ اِس کے علاوہ آپ ۴۸ - ۴۹ش میں ہمارے ملک کی سب سے پُرانی جامعہ پنجاب یونی ورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر رہے۔ ۴۹ش میں شہیدِ ملت لیاقت علی خاں مرحوم نے آپ کو نائب وزیر مقرر کیا۔ آپ کی غیر معمولی صلاحیتوں کے پیشِ نظر ۵۰ش میں آپ کو وزیرِ مملکت اور ۵۱ش میں وزیرِ کابینہ کے عہدے پر فائز کیا گیا۔

۴۰ش سے قیامِ پاکستان تک آپ "انڈین ہسٹوریکل ریکارڈس کمیشن" کے رکن اور ۴۷ش سے ۱۹۵۴ش تک "پاکستان ہسٹوریکل ریکارڈس اینڈ آرکائیوز کمیشن" کے رکن رہے۔ اسی دوران میں آپ "پاکستان اِنسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل افیرس کی کونسل کے رکن بھی رہے۔ ۱۹۵۱ش میں آپ "پاکستان پولیٹکل سائنس ایسوسی ایشن" اور ۱۹۵۴ش اور ۱۹۵۸ش میں "پاکستان ہسٹری کانفرنس" کے صدر رہے۔ ۱۹۵۵ش سے ۱۹۶۰ش تک آپ کولمبیا یونیورسٹی نیویارک کے شعبۂ تاریخ میں "وِزیٹنگ پروفیسر" رہے۔

۱۹۶۰ش سے ۱۹۶۲ش تک "سنٹرل اِنسٹی ٹیوٹ آف اسلامک ریسرچ" کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ ۱۹۶۱ش سے آپ کراچی یونی ورسٹی کے وائس چانسلر ہیں اور ہم سب کے علم میں ہے کہ یہاں آپ کس خلوص، انہماک اور قابلیت کے ساتھ نئی نسل کو تعلیم دے رہے ہیں اور پاکستان کی اس اہم جامعہ کے معیارِ تعلیم کو بلند کرنے کے لیے اپنی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لا رہے ہیں۔ اسی نسل کو آئندہ پاکستان کی قیادت و رہنمائی کا بار اٹھانا ہے اور اسی کو پاکستان



ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی

[شام ہمدرد کراچی ۔ ۱۰ اکتوبر ۱۹۶۳ شمسی]

کی ترقی اور تعمیرِ نو کا کام انجام دینا ہے۔ اس خصوص میں کراچی یونی ورسٹی کی اہمیت واضح ہے۔ یونی ورسٹی ہی وہ ادارہ ہے جہاں سے صحیح معنی میں علم کی اشاعت اور علم میں وسعت کے سرچشمے جاری ہوتے ہیں اور جہاں اصحاب کمال اور اکابرِ علم اپنی عمر بھر کی ذہنی کاوشیں اور نتائج تحقیق اور حاصلِ مطالعہ اپنے طالب علموں کو منتقل کر دیتے ہیں۔ یہیں سے قوم کو آبِ حیات پلا کر زندگی عطا کی جاتی ہے اور بقائے دوام کا راستہ بتایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ہماری تعلیم کو صحیح خطوط پر ڈھالنے اور معیارِ تعلیم کو بڑھانے کے لیے جو سب سے بڑا قدم اٹھایا ہے وہ ایک بیرونی اور غیر زبان کے بجائے ہماری اپنی زبان اردو کو ذریعۂ تعلیم قرار دینا ہے۔

ہمیں کسی زبان سے کد نہیں ہے اور نہ ہم کسی زبان کے سیکھنے سمجھنے اور استعمال کرنے میں کوئی عیب دیکھتے ہیں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہمیں اپنی زبان عزیز نہ رہے اور یہ بات بھی میری سمجھ میں نہیں آتی کہ اپنی زبان کے کسی قابل ہو جانے کے انتظار میں ہم دوسری زبان کو پروان چڑھاتے رہیں اور منتظر رہیں کہ غیب سے کوئی طاقت یکایک وجود میں آئے گی اور وہ ایک ڈھلی ڈھلائی، منجھی منجھائی اور آبِ کوثر سے دُھلی دُھلائی اردو زبان ہمیں دی جائے گی اور ہماری خوشامد کرے گی کہ صاحبو! اب تو یہ ایک مکمل زبان ہے، اسے اپنا لیجیے۔

سیدھی سی بات ہے کہ جب تک آپ اُردو کو بنائیں گے نہیں، وہ کیسے بنے گی، جب تک آپ دوسری زبان میں سوچنا نہیں چھوڑیں گے، اردو میں سوچنا نہیں آئے گا۔ جب تک آپ دوسری زبان سے مرعوب رہیں گے آپ کا احساسِ کمتری کیسے دُور ہوگا اور اپنی زبان کی لطافتیں اور نزاکتیں کیسے آپ کی سمجھ میں آئیں گی؟ اردو زبان کتنی ہی خام سہی، اِس میں کتنی ہی کمیاں سہی لیکن سوال یہ ہے کہ اس کی خامیاں، اس کی کمیاں کون دُور کرے گا؟

یہاں میں ایک اور نکتے کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ مجھے اردو نہیں آتی، یعنی اردو زبان کے بہت سے الفاظ کا صحیح مفہوم مجھے نہیں معلوم۔ اب جب میں اِس میں اظہارِ خیال کرنا چاہتا ہوں تو اپنے کو عاجز پاتا ہوں، مگر اپنے عجز کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا، بلکہ اس کو اردو کا عجز سمجھتا ہوں۔ اسی طرح میں اردو ادب کا مطالعہ نہیں کرتا، لیکن ادبی محفل میں یا اردو کے ادیبوں کے درمیان بات ہوتی ہے تو اردو میں اعلا ادب کی کمی کا رونا روتا ہوں۔ انصاف کیجیے یہ کس کا قصور ہے؟ —— اردو زبان کا یا میرا اپنا؟ یہ کس کی کمزوری ہے؟ —— اردو ادب کی یا میری اپنی؟ آپ کی سلامتیِ طبع اور حق پسندی سے مجھے امید ہے کہ آپ میری نالائقی کو چھپانے کی کوشش نہ فرمائیں گے۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی میدانِ تعلیم میں یقیناً بلند مقام رکھتے ہیں اس موضوع پر وہ جو کچھ فرمائیں گے اس کا وزن ہوگا۔ آج وہ کراچی میں یونیورسٹی اور کالج کی تعلیم کے بعض مسائل پر اظہارِ خیال فرمائیں گے۔

محمد سعید

کراچی میں یونی ورسٹی اور کالج کی تعلیم کے بعض مسائل

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ۔ وائس چانسلر کراچی یونی ورسٹی

جناب حکیم صاحب اور خواتین و حضرات!

مَیں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے یہ موقع دیا کہ کراچی میں اعلا تعلیم کے سلسلے میں جو مشکلات درپیش ہیں اور جن مسائل سے یونی ورسٹی اور کالج دوچار ہیں وہ آپ کی خدمت میں عرض کروں۔ اِس میں تھوڑی سی خود غرضی بھی شامل ہے، وہ یہ ہے کہ کوئی جامعہ یا کوئی ادارہ کسی خلا میں کام نہیں کر سکتا۔ لازم ہے کہ وہ کسی معاشرے کے اندر رہ کر اپنے فرائض انجام دے اور کام کرے۔ جامعۂ کراچی کے لیے ناگزیر ہے کہ اس کے اور اس شہر کے اہلِ فکر کے مابین کسی قسم کا رابطہ ہو، تاکہ اہلِ فکر کو جامعہ کے مسائل کا علم ہوتا رہے۔ یہ بالکل ظاہر ہے کہ ہر قدم پر جامعہ کو اور اس کے ملحقہ اداروں کو بعض مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ان مسائل کی نوعیت سے باخبر رہنا شہر والوں کا فرض ہے اور ہم جامعہ والوں کا بھی یہ فرض ہے کہ ہم آپ کو تمام مسائل سے آگاہ کرتے رہیں۔ اِس لیے جب مجھے حکیم صاحب کی طرف سے یہ دعوت موصول ہوئی تو مَیں نے اِس موقع کو بہت غنیمت سمجھا، تاکہ جو مسائل اعلا تعلیم کو اس ملک میں عام طور پر اور خصوصیت سے اِس شہر میں درپیش ہیں، اُن کا کچھ ذکر اس محفل میں کر سکوں تاکہ آپ بھی ان مسائل کی طرف متوجہ ہوں۔

تعلیم کے عام طور پر دو مقصد قرار دیے جاتے ہیں۔ پہلا مقصد تو طلبا میں علم کا ذوق پیدا کرنا ہے، اِس لیے کہ اس زمانے میں علم کی مقدار اتنی بڑھ گئی ہے کہ پورے علم کو طلبا میں منتقل نہیں کیا جا سکتا

اور کسی زمانے میں بھی غالباً یہ صورت نہیں تھی کہ تمام علم منتقل کر دیا جاتا ہو لیکن اس زمانے میں خصوصیت سے جب دُنیا کے چھاپے خانوں میں، ہر فن اور ہر علم کے ہر شعبے میں ہزاروں کتابیں چھپ کر ہر ہفتہ نکلتی ہیں، یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی جامعہ کسی علم کو طالب علموں میں تفصیل کے ساتھ منتقل کر دے اور چوں کہ علم کو بالتفصیل منتقل نہیں کیا جا سکتا، اِس لیے اب سے کئی سال پہلے سے یہ امر عام طور پر تسلیم ہوتا رہا ہے کہ اُستاد کے سامنے صحیح مقصد یہ ہونا چاہیے کہ وہ طالبِ علم کے دل میں علم کا شوق پیدا کر دے، اور اس مضمون سے جو وہ پڑھاتا ہے، دل چسپی پیدا کر دے۔ دُوسرا مقصد یہ ہے کہ وہ طالبِ علم میں تنقید کی قابلیت پیدا کر دے، تاکہ جب اس کے سامنے کوئی بیان آئے تو اس کی قدر و قیمت کو پرکھ لے۔ ظاہر ہے کہ جب اس کثرت سے علمی مباحث پر تحریر کیا جاتا ہے تو بہت سے ایسے خام خیال بھی سامنے آجاتے ہیں، جن کی تردید لازمی ہوتی ہے، اِس لیے طالبِ علم میں مضمون سے دل چسپی اور قوتِ تنقید پیدا کرنے کے دو کام دراصل استاد کے فرائض ہیں اور اس کی ذمّے داری میں شامل ہیں۔ ایک اور اہم ذمّے داری بھی اُستاد اور ان اداروں پر جو اساتذہ پر مشتمل ہیں، عائد ہوتی ہے، وہ یہ کہ وہ طلبا میں ایسا کردار پیدا کریں کہ جو علم انھیں حاصل ہوتا ہے اس کا وہ صحیح استعمال کر سکیں اور اس کا غلط استعمال نہ کریں، تاکہ علم ان کے لیے باعثِ رحمت ہو، اور حجابِ اکبر نہ بن جائے۔ یہ بات پیدا ہو سکتی ہے صرف کردار کی تربیت سے۔

یہ تو میں نے آپ سے عرض کر دیا کہ ہر جامعہ اور ہر اعلا درس گاہ کے یہ مقاصد ہونے چاہییں لیکن اس کے بعد اگر یہ بھی عرض کروں کہ یہ مقاصد کراچی میں پورے ہو رہے ہیں تو یہ صریح غلط بیانی ہوگی۔ یہ اس وجہ سے غلط بیانی ہوگی کہ بہت سے اسباب ایسے ہیں، جن کی وجہ سے اُستاد طالبِ علموں میں وہ صحیح ذوق پیدا کرنے سے قاصر رہتے ہیں جو انھیں علم کی جستجو میں آگے لے جا سکے۔ آپ اپنے کو دیکھیے یہاں کے جو اہلِ ثروت لوگ ہیں انھیں دیکھیے اور ان کے مکانوں کو اندر سے دیکھیے۔ مکان عالیشان نظر آئیں گے، اس میں آرائش کا سارا سامان موجود ہوگا، لیکن اگر نہیں ہوگی تو ایک چیز یعنی پڑھنے کے قابل کتاب۔ یہ ایک ایسا سانحہ ہے، جس کا ذکر ہر مجلس میں کرنا چاہیے۔ ہم تعلیم کا مقصد صرف یہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں کسی طرح کسی نہ کسی قسم کی کوئی سند حاصل ہو جائے، خواہ وہ سند صحیح طور پر کسی علم کی سند ہو یا محض لاعلمی کی غمّازی کرتی ہو۔ یہ سند ایک حد تک اور ایک زمانے تک کام آسکتی ہے۔ یہ سند اگر اچھی ہو تو اس حد تک تو کام آتی ہے کہ جب کسی جگہ درخواست دی جائے تو وہ شخص یا ادارہ جسے کسی کی ضرورت ہو، یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ اس شخص نے فلاں امتحان کام یابی کے ساتھ پاس کیا ہے لیکن اگر سند میں اور قابلیت میں ایسا تفاوت پیدا ہو جائے کہ سند سے قابلیت کا اندازہ ہرگز نہ لگ سکے تو یہ بالکل ظاہر ہے کہ وہ سند کچھ عرصے کے بعد اتنی بھی قیمتی نہ ہوگی، جتنا قیمتی وہ کاغذ

ہوتا ہے، جس پر وہ چھاپی جاتی ہے۔ ایسی اسناد کا تقسیم کرنا، جن کے پیچھے صحیح قابلیت نہ ہو محض کاغذ کو خراب کرنا ہے۔ اسی طرح عام طور پر توقع یہ کی جاتی ہے کہ پڑھے لکھے افراد معاشرے کو مسائل کی اس اونچ نیچ سے واقف ہوں گے، جن سے واقفیت معاشرے کو ذرا سی توجہ سے بہتر بنا سکتی ہے اور ان مسائل سے ادنا عدم توجہی معاشرے کو بگاڑ سکتی ہے۔ آپ نے کبھی یہ غور کیا ہے کہ اس کا کیا سبب ہے کہ ہمارے ہاں کردار کی کمی صرف جاہل طبقے تک محدود نہیں ہے، بلکہ ہم میں سے بہت اعلا ڈگری یافتہ بھی اس مرض میں مبتلا ہیں اور ان سے بھی جس کردار کی توقع کی جا سکتی ہے، وہ ان میں نہیں پیدا ہونے پاتا اور میرا خیال یہ ہے کہ کوئی اُستاد اور کوئی ایسا شخص جو کسی تعلیمی ادارے کو اس شہر میں یا اس ملک میں چلاتا ہو یا کوئی شخص جس کا تعلق خود تعلیم سے ہو وہ کبھی بھی اس پر غور کرنے پر اگر مجبور نہیں ہوتا تو یہ کردار کی کمی اس کے تغافل کا نتیجہ ہے اور اس کی توجہ اپنے فرائض کی طرف نہیں ہے۔ یہ بالکل ظاہر ہے کہ اگر ہمارے ادارے صاحبِ کردار طالب علم پیدا نہیں کرتے تو ان اداروں کی بڑی سخت کوتاہی ہے اور اگر اُستاد کی صحبت اور تربیت اور تعلیم کا اثر طالب علم قبول نہیں کرتا تو یقیناً کہیں نہ کہیں ہم میں کھوٹ موجود ہے اور اس ملک کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ ہم یہ معلوم کریں کہ وہ کھوٹ کس جگہ ہے۔

حکیم صاحب نے اُردو میں تعلیم دینے کا ذکر کیا ہے۔ ہم چند ایسے سفید مو افراد زندہ ہیں جنھیں اپنی زبان سے دل چسپی اور محبت ہے، ورنہ یہاں تو کیفیت یہ ہے کہ اُردو سے محبت کو عقل کی کوتاہی سمجھا جاتا ہے۔ یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہمارا فکر بہت ہی گھٹیا قسم کا ہے کہ ہمارے تصور میں اپنی زبان کی اہمیت بھی آتی ہے۔ ایک اور مجلس میں تقریر کرتے ہوئے میں نے یہ عرض کیا تھا کہ جہاں تک اُردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کا تعلق ہے، مجھے کسی فرد یا کسی گروہ کی طرف سے اتنا اندیشہ نہیں ہے جتنا کہ اپنی تمام قوم کے احساسِ کمتری سے۔ یہ احساسِ کمتری ہی تو ہے، جو ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ اگر انگریزی زبان استعمال کریں تو ہماری قابلیت اعلا اور اگر ہم اُردو زبان استعمال کریں تو اس کے معنٰی یہ ہیں کہ ابھی ہماری تعلیم مکمل نہیں ہے۔ ضرورت اِس امر کی ہے کہ اس ملک کے اعلا تعلیم یافتہ ہر مجلس میں حتی الوسع اردو کو استعمال کریں، تاکہ لوگوں کے ذہن سے یہ احساسِ کمتری مٹ جائے اور وہ یہ سمجھیں کہ قابلیت کا تعلق کسی زبان سے نہیں ہے۔ ہماری بدقسمتی تو یہ ہے کہ لوگ غلط چیز کو قابلیت سمجھتے ہیں۔ آپ یاد رکھیں کہ زبان اظہارِ خیال کا ایک ذریعہ ہے، خود علم نہیں ہے۔ زبان محض ایک منہاج کی حیثیت رکھتی ہے کہ جس کے ذریعے سے ہم ایک مقصد تک پہنچ سکتے ہیں۔ اب آپ یہ دیکھیے کہ قطع نظر اس کے کہ اُردو زبان کی اہمیت کیا ہے اور اس کی ہمارے دلوں میں کیا محبت ہے، انگریزی کے استعمال سے کیا مشکلات پیش آتی ہیں۔ محض ایک معلّم کی حیثیت سے میں بعض

مشکلات آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں معلم کے لیے سب سے زیادہ کٹھن یہ چیز ہوتی ہے کہ وہ پہلے اپنے خیالات میں سُلجھاؤ پیدا کرے۔ اگر اس کا مطالعہ وسیع ہے اور اگر اس کے خیالات میں سُلجھاؤ ہے تو پھر ان خیالات کو اِس طرح پیش کرے کہ طالب علموں کو اس کو سمجھنے میں کسی قِسم کی دِقّت اور مشکل پیش نہ آئے۔ اپنے دماغ سے دوسرے دماغ میں خیالات منتقل کرنا آسان کام نہیں ہے ؎

غلط فہمی بڑی ہے عالَمِ الفاظ میں اکبرؔ
بڑی دشواریوں کے بعد اکثر کام چلتا ہے

یہ تو اس زبان کے متعلق ہے، جو ہماری گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ اب آپ لیں ایک غیر زبان کو تو یہ دشواریاں بہت بڑھ جاتی ہیں۔ مَیں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے ۹۵ فی صد اساتذہ کی انگریزی اس قابل نہیں ہوتی کہ وہ اپنے خیالات کی صحیح ترجمانی کرسکیں اور اگر وہ اس کے مدّعی ہیں تو اُن کا دعوا غلط ہے۔ یہ اگر کیفیت ہو اس شخص کی جو اپنے خیالات کو دوسروں تک منتقل کرنا چاہتا ہے تو آپ اس کی دشواریاں بھی دیکھیں، جو اُن کو حاصل کرنے کے لیے سامنے بیٹھا ہے۔ اگر چند بنے بنائے جملے نوکِ زبان ہوں اور استاد اور شاگرد کی کُل متاع وہی ہوں تو فکر کی تربیت نہیں ہوسکتی اور نہ دماغ کسی نئی چیز کی طرف متوجہ ہوسکتا ہے۔ ناممکن ہے کہ کوئی نیا فکر دماغ میں داخل ہو، یا کوئی اُپج یا کوئی نئی چیز پیدا ہوسکے۔ ہمارے ہاں کی کیفیت یہ ہے کہ میری جامعہ میں کم سے کم ۹۵ فی صد سے زیادہ طالب علم ایسے داخل ہوتے ہیں جنھیں انگریزی پر اتنا بھی قابو نہیں ہوتا کہ وہ سیدھے سادے خیالات کو صحیح طور پر ادا کرلیں اور ان میں یہ قابلیت تو یقینی نہیں ہوتی کہ کسی پیچیدہ مضمون پر اُن کے سامنے تقریر کی جائے تو اس کی تمام باریکیاں ان پر روشن ہو جائیں۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ ایک تو طالب علم کی توجہ مضمون سے ہٹ جاتی ہے، وہ سمجھتا ہے کہ ایک مصیبت میرے سر پر آپڑی ہے۔ اس مصیبت کو امتحان تک کسی نہ کسی طرح نبیڑنا ہے۔ امتحان کے بعد مجھے یوم نجات منانے کا موقع ملے گا، اس لیے اس کے دل میں کبھی شوق پیدا ہی نہیں ہوتا۔ شوق پیدا ہوتا ہے اس چیز سے جو دل میں جگہ لے۔ شوق پیدا ہوتا ہے اس چیز سے جو دماغ میں اُترے۔ جو چیز دماغ میں اترتی ہی نہیں اس سے شوق کیسے پیدا ہوگا؟ اِس مجلس میں بہت سے اساتذہ اس جامعہ کے موجود ہیں۔ دوسرے حضرات بھی ایسے موجود ہیں، جو معلم ہیں۔ وہ شہادت دیں گے کہ طالب علم کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اُستاد چند سوال اچھی طرح سمجھا دے۔ سمجھانے کے معنیٰ یہ ہیں کہ لیکچر نوٹ ایسے مفصّل اور ایسے اچھے ہوں کہ اگر انھیں امتحان کی کاپی میں منتقل کردیا جائے تو نمبر اچھے مل جائیں۔ ہوتے ہوتے اب

مرض نے یہاں تک ترقی کر لی ہے کہ طالب علم آٹھ یا دس متوقع سوال اچھی طرح یاد کر لیتے ہیں۔ اگر پانسہ سیدھا پڑ گیا اور سوال یاد کیے ہوئے میں سے آگئے تو پھر کیا کہنا۔ وارے نیارے ہیں۔ اور اگر کہیں ایسا ہوا کہ سوالات کے متعلق ممتحن کے اور اُستاد کے دماغ میں توارد نہ ہوا تو پھر یہ ہوتا ہے کہ ہر چند وہ سوال نصاب میں شامل ہوں اور ہر چند ان کا معیار زیادہ سخت نہ ہو۔ طالب علم جسے پڑھنے سے اب اِتنی نفرت پیدا ہو گئی ہے کہ وہ سلیبس بھی بھول کر نہیں دیکھتا اور اکثر استاد بھی نہیں پڑھتے، دونوں یہ کہتے ہیں کہ سوالات نصاب کے باہر تھے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ طالب علم اِمتحان کے کمرے سے باہر اٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ پھر یہ ہوتا ہے کہ اک شور اٹھتا ہے۔ تمام شہریوں کی طرف سے کہ اربابِ جامعہ کو اس کا بھی اندازہ نہیں ہے کہ پرچہ کیسے بنائیں۔ اخبار یہ لکھتے ہیں کہ یہ تو ستم ہو گیا۔ کوئی یہ نہیں دیکھتا کہ یہ سوال نصاب کے اندر تھے یا نہیں لیکن کہتے سب یہ ہیں کہ تمام تر غلطی جامعہ کی غلطی اس وجہ سے ہے کہ جامعہ کو کبھی تو اس کا احساس ہونا چاہیے کہ یہ نظام، یہ طریقہ شروع سے لے کر آخر تک غلط ہے۔ اس زمانے میں کہ جب مدراس میں انگریزی جاننے والے استاد موجود نہیں ہیں۔ اسکولوں کے اساتذہ کی انگریزی قابلیت بہت کم ہے۔ جب کیفیت یہ ہے کہ کالجوں میں بھی کم لوگ ایسے ہیں جو صحیح طور پر انگریزی میں اپنا مفہوم ادا کر سکیں تو ایک موقع، ایک لمحہ فکر کا ایسا بھی ہونا چاہیے کہ جب جامعہ یہ سوچے کہ اگر یہ سب غلط ہے تو ہم اس میں شریک کیوں ہیں۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اصل میں ایک ہی طریقہ ہے ایک دیانت دار آدمی کے لیے، یا تو وہ یہ کہے کہ صاحب یہ نظام سارا غلط ہے۔ میرا وقت اس میں خراب ہوتا ہے۔ اساتذہ کا وقت اس میں خراب ہوتا ہے۔ طلبا کا وقت اس میں خراب ہوتا ہے۔ یہ کس مخمصے میں آپ نے تمام قوم کو گرفتار کر رکھا ہے کہ سال ہا سال گزر جاتے ہیں اور بڑی بڑی اَسناد حاصل ہو جاتی ہیں، مگر رہتے ہیں جاہل کے جاہل۔ آپ لوگوں میں سے بعض حضرات ایسے ہوں گے جنھیں شاید انگریزی سے کوئی تعلق نہ ہو۔ اکثر تو ایسے ہیں جنھیں تعلق ہے اور آپ ہم لوگوں سے پوچھیے، جو اِس راستے سے گزر چکے ہیں، جنھیں حقیقت معلوم ہے۔ ان لوگوں کی قابلیت کی جنھوں نے تمام عمر ایسی زبان کے ذریعے پڑھا ہے اور پڑھایا ہے تو ہم یہ عرض کریں گے کہ ہم میں سے چند افراد اپنی ذہانت کی وجہ سے ایسے درجے پر ضرور پہنچ گئے ہیں کہ جن میں وہ قابلیت موجود ہے جو اُستاد میں ہونی چاہیے لیکن جس قسم کی قابلیت دوسرے ممالک کی جامعات کے اساتذہ میں ہونی چاہیے وہ افسوس ہمارے ہاں بالعموم پیدا نہیں ہوتی۔ اگر ہمارے ملک میں پیدا ہوتی تو ہم اپنے طالب علموں کو غیر ممالک میں تعلیم کے لیے کیوں بھیجتے۔ کیا ہمارے طالب علم کند ذہن ہوتے ہیں یا ہمارے اساتذہ ذہین کم ہیں۔ ساری دِقّت یہ ہی ہے کہ ع زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمے دانم۔

سارا قصہ یہ ہے کہ ایک ایسی زبان کے ذریعے تعلیم حاصل کرنے اور تعلیم دینے پر تمام قوم مجبور ہے، جو نہ صرف اس کی زبان نہیں ہے، بلکہ اس کی ثقافت، عقائد اور روایات کسی چیز سے لگا نہیں کھاتی ہے۔ حکیم صاحب نے یہ بالکل صحیح فرمایا کہ ہمیں کسی زبان سے کد نہیں ہے، مجھے تو خاص طور پر نہیں ہے۔ میں نے تو دو سال ایسے ملک میں تحصیلِ علم میں گزارے ہیں اور پانچ سال دوسرے ایسے ملک میں پڑھایا ہے کہ وہاں اردو زبان بولنے کو مل جاتی تھی تو اُسے بڑا غنیمت سمجھتے تھے، لیکن مسئلہ اصل میں یہ ہے کہ آیا ہمیں کوئی ایسا قدم اٹھانا چاہیے یا نہیں کہ جس سے ہمارے ہاں بھی فکر و غور کا ملکہ لوگوں میں پیدا ہو سکے۔ اسی وجہ سے جامعۂ کراچی نے ایک چھوٹا سا قدم اٹھایا ہے۔ آپ یہ نہ سمجھیے کہ یہ منزل طے ہو گئی۔ ابھی بڑی مشکلات راستے میں حائل ہیں اور سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ اگر دوسری جامعات اس طرف توجہ نہ کریں اور قدم ہمارے ساتھ نہ اٹھائیں تو پھر ظاہر ہے کہ ملک میں ہم اکیلے کوئی کام نہیں کر سکتے۔

اب میں چند اور امور کی طرف توجہ دلانی چاہتا ہوں۔ اِس شہر کے لوگوں کو تعلیم کے مسائل سے دل چسپی لینی چاہیے۔ اگر وہ کوئی کام بگڑتا ہوا دیکھتے ہیں تو یہ کافی نہیں کہ گھر بیٹھ کر کہہ لیں کہ یہ کام بگڑ رہا ہے۔ اِس طرح کبھی معاشرہ درست نہیں ہو سکتا۔ کیا آپ کو معلوم نہیں ہے کہ یہاں پر بعض تعلیمی ادارے محض سوداگری کے اصول پر چل رہے ہیں؟ کیا کردار پیدا ہوگا اس طالبِ علم میں جو ایسے ادارے میں پڑھے جہاں وہ ہفتے میں ایک دن جاتا ہے اور سات دن کی حاضری لگتی ہے۔ ایک معمولی سی فیس ادا کرنے پر وہ غیر حاضر سے حاضر ہو جاتا ہے۔ میں آپ سے سچ عرض کرتا ہوں کہ یہ طالبِ علم کے لیے سمِ قاتل ہے کہ وہ دیکھے کہ وہ ادارہ، جس میں وہ تعلیم پاتا ہے، وہ معمولی اور ادنا دیانت کے اصول کو بھی پیشِ نظر نہیں رکھتا اور اس کے ذہن میں اُستاد کا کیا تصوّر پیدا ہوگا، جب وہ جانتا ہے کہ استاد تو خوب جانتا ہے کہ طالبِ علم سرے سے نہیں آتا، لیکن پھر بھی وہ حاضری لگا دیتا ہے اور پھر یہ کہ اِس طرح جو تعلیم ہوگی وہ بالکل ظاہر ہے۔ ویسے بھی یونی ورسٹی اور کالجوں میں چھٹیاں کافی ہوتی ہیں۔ اس کے بعد جب ہفتے میں صرف ایک دن پڑھائی ہو تو طالبِ علموں کو کیا حاصل ہوگا۔ جو بے چارے طالبِ علم ہفتہ بھر جاتے ہیں، انھیں بھی ہفتے میں صحیح طور پر ایک دن تعلیم میسّر ہوتی ہے، اِس لیے جو تعلیم میسّر ہوتی ہے، وہ آپ کو معلوم ہے۔ کیا اتنا احساس اس شہر کے شہریوں میں نہیں کہ وہ اس طرف توجہ کریں اور دیکھیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ ان بے قاعدگیوں سے ایک نسل نہیں تباہ ہوتی، بلکہ نسلیں تباہ ہو رہی ہیں۔ یہ آپ نہ سمجھیں کہ یہ ان لوگوں کے ساتھ جو بے چارے ہفتے میں چھے دن دفتر میں کام کرتے ہیں اور ایک دن آکر پڑھتے ہیں، رعایت ہے۔ جامعہ نے یہ قانون بنا دیا ہے کہ خارجی

طالبِ علم بغیر کسی مشکل کے اور ایسے اداروں میں داخل ہوئے بغیر امتحان میں شریک ہو سکتا ہے۔ اس سے کیا چیز مانع ہے کہ یہ تعلیمی سوداگر ایسے کالج بنائیں جن کا الحاق جامعہ سے نہ ہو اور وہ شام کے وقت تین چار گھنٹے روزانہ پڑھائیں، بجائے اس کے کہ اتوار کے اتوار۔ جیسے پرانے زمانے میں مکاتب میں جمعرات کو آموختہ ہوتا تھا، آموختہ کرائیں۔ یہ ایسی چیزیں ہیں جن کی طرف فوری توجہ کی ضرورت ہے۔

جہاں تک تربیت کا تعلق ہے، اس کی حالت بھی خراب ہے۔ کراچی میں ایسے حالات پیدا ہو گئے ہیں، جو بہت اندوہ ناک ہیں۔ آپ یہ بات یاد رکھیں کہ تعلیم کا اصل مقصد یہ ہے کہ انسان کے مزاج میں وہ اعتدال پیدا ہو، جو زندگی کو صحیح سانچے میں ڈھال سکے۔ اس اعتدال کے لیے احتسابِ نفس کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر انسان اپنے نفس پر کسی قسم کا احتساب نہ رکھے تو پھر اس میں اور جانور میں کسی قسم کا فرق نہیں رہ جاتا۔ یہی وہ چیز ہے کہ جس کا نام ڈسپلن ہے۔ اسے بعض حالات میں خارجی عوامل سے رائج کرنا پڑتا ہے، اسی لیے کہ نئی عمر میں اس امر کا اندازہ نہیں ہوتا کہ کون سا راستہ خطرناک ہے اور کون سا راستہ ایسا ہے کہ فلاح کی طرف لے جائے گا۔ تعلیم میں تادیب اور مودب کی اسی وجہ سے ضرورت ہوتی ہے۔ اب اگر کسی جامعہ کے یا کسی ادارے کے طالبِ علم ایک ایسی تنظیم قائم کر لیں کہ وہ کہہ سکیں کہ اگر ہم پر کسی قسم کی تادیبی کارروائی کی گئی تو ہم جامعہ کا چلنا دشوار کر دیں گے، شہر میں فساد کریں گے اور جامعہ میں ہڑتال کریں گے اور اسی قسم کے اور اقدامات کریں گے، تو میں آپ سے یہ پوچھتا ہوں کہ ان حالات میں تعلیم جاری رہ سکتی ہے؟

مجھے اس جامعہ سے تعلق پیدا ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ صرف دو سال ہوئے ہیں۔ میں نے اس عرصے میں کافی غائر مطالعے کے بعد یہ محسوس کیا کہ اس قسم کے طالب علموں کی، جو تخریب پیدا کرتے ہیں، زیادہ تعداد نہیں ہے۔ آپ یقین جانیے کہ ہمارے طالبِ علم آپ ہی کے گھروں کے بچے ہیں اور ان میں سے بڑی اکثریت ایسی ہے، جو اصلاح پذیر ہے اور شریف النفس ہے، جو پڑھنا چاہتے ہیں اور وقت برباد نہیں کرنا چاہتے، لیکن اگر انھیں ہر وقت ورغلایا جائے تو وہ ورغلانے میں آجاتے ہیں۔ ایک طرف تو اچھے اُستاد بھی پڑھنے پڑھانے میں مصروف رہتے ہیں اور طالبِ علموں کے ساتھ سارا وقت نہیں گزار سکتے اور دوسری طرف چند مستقل پیشہ ور ورغلانے والے ہر وقت طالبِ علموں کے ساتھ انھیں راہِ راست سے ہٹانے میں لگے رہتے ہیں۔ جب وہ ہنگامہ کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو اخباروں میں موٹی سرخیوں سے اُن کا ذکر آتا ہے۔ انھیں نہ صرف سیاسی کارکنوں تک بلکہ حکومت کے ایوانوں تک رسائی ہو جاتی ہے اور ان کی اہمیت

بڑھتی ہے۔ ان مسائل پر آپ کو غور کرنے کی ضرورت ہے۔ میں آپ سے صحیح عرض کرتا ہوں کہ یہ مسئلہ صرف چند طالب علموں کا نہیں ہے، بلکہ طالبِ علموں کی نسلوں کا ہے۔ آخر اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ گزشتہ سال ڈھاکہ میں ۳۶۵ دن میں صرف ۱۰ دن پڑھائی ہوئی۔ ان لڑکوں کے امتحان بھی ہوں گے، انھیں سندیں بھی ملیں گی۔ جو اُن میں انجنیر بنیں گے تو ان کے بنائے ہوئے پل پر سے گاڑی گزرے گی تو پُل ٹوٹ جائیں گے، ان میں جو ڈاکٹر ہیں وہ جب مریض کا علاج کریں گے تو اسے زہر دے دیں گے، دوا نہیں دیں گے۔ جو استاد بنیں گے اور کسی کو پڑھائیں گے تو اُسے جاہل بنائیں گے۔ غرض یہ زندگی کے کسی شعبے میں کام نہیں آسکتے، مگر سند ان کے پاس موجود ہوگی۔ یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ جامعہ اگر کسی کے خلاف تادیبی کارروائی کرتی ہے تو جامعہ کے کسی استاد کو یا شیخ الجامعہ کو جامعہ کے انتظامیہ کے ارکان کو اس کے ساتھ کوئی کد نہیں ہوتی۔ جامعہ اور طالبِ علموں کا تعلق تو ایسا ہوتا ہے جیسا والدین اور بچوں کا۔ اور ہم ان طالبِ علموں سے، جو طالبِ علم ہیں اور پڑھنا چاہتے ہیں، پوری محبت رکھتے ہیں اور اگر ہم کوئی تادیبی کارروائی کرتے بھی ہیں تو اس لیے کرتے ہیں کہ اُن ۹۹۔۹۹ فی صد کو تخریبی کارروائیوں سے بچائیں، جو پڑھنا چاہتے ہیں۔ میں تو برابر طالبِ علموں سے یہ کہتا ہوں کہ یہ جامعہ ایسی ہے جس کا آغوش ہر قسم کے طالبِ علموں کے لیے کھلا ہوا ہے۔ مجھے اس سے کوئی تعلق نہیں کہ تمھارا دین کیا ہے، تمھارا مذہب کیا ہے، تمھارے سیاسی خیالات کیا ہیں۔ میرا تعلق اس بات سے ضرور ہے کہ تم دوسروں کو چین سے پڑھنے دو۔ اگر تم دوسروں کو چین سے پڑھنے نہیں دو گے تو جہاں تک میرے امکان میں ہے میں اس امر کی کوشش کروں گا کہ تم کو اس تخریب سے روکوں۔

مَیں نے عرض کیا کہ مجھے اس سے تعلق نہیں کہ طالبِ علم کا مذہب کیا ہے۔ اس کی بعض حدود ہیں۔ حدود یہ ہیں کہ جامعہ کا دروازہ غیر مسلم طلبا کے لیے کھُلا ہوا ہے، دہریے کے لیے کھلا ہوا ہے ہر شخص کے لیے کھُلا ہوا ہے لیکن مسلمان طالبِ علموں کی طرف سے ہم پر ایک خاص قسم کی ذمّے داری عائد ہوتی ہے۔ وہ ذمّے داری یہ ہے کہ کم از کم ان کے کان میں سچائی پڑ جائے۔ جو مسلمان طالبِ علم ہے، اُسے ہم کم از کم اتنا تو سمجھا دیں کہ اسلام کیا ہے۔ یہ ہماری کوشش ہے، اس کا اثر اللہ تعالےٰ کے ہاتھ میں ہے۔ آج کل ہماری حالت یہ ہے کہ ہم ایمان کی بازی لگا کر اپنے بچوں کو ایسی درس گاہوں میں بھیجتے ہیں کہ جب وہ وہاں سے نکلتے ہیں تو ان کے دل میں نورِ ایمانی کا ایک شائبہ بھی باقی نہیں رہتا، پھر بھی ہم انھیں برابر وہاں بھیجتے رہتے ہیں، اِس لیے کہ انھیں انگریزی زبان آجائے اور وہ بھی اچھی نہیں آتی ہے۔ ہمیں قطعًا اس سے کوئی تعلق نہیں کہ ہماری اولاد کا فر اٹھے گی یا بے دین اٹھے گی، کیا اٹھے گی۔ ہمیں محض اِس چیز سے تعلق ہے کہ جب یہ ہمارا لڑکا کسی انٹرویو میں جائے گا تو

انگریزی اس طرح سے بولے گا کہ اب تک انگریز کا جانشین، جو کرسی پر موجود ہے، وہ مرعوب ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ اور کوئی مقصد ہمارا نہیں ہوتا اور اس کی خاطر ہم اس کے لیے تیار ہیں کہ ہماری اولاد مسلمان نہ رہے۔ نہ رہے تو کیا بات ہے، ہمارے دل میں بھی اسلام کی کون سی روشنی موجود ہے جو ہمیں بُرے کاموں سے روکے گی اور اچھے کاموں کی ترغیب دے گی۔ اس وجہ سے جامعہ نے ضروری سمجھا کہ ایک عام کورس اسلام کے متعلق رائج کر دے، تاکہ طالب علم کے سامنے ایسے لوگ جو دین سے باخبر ہیں، وہ اسلام کی تعلیم کو پیش کر سکیں۔ اس کے علاوہ دوسری کوشش اس امر کی ہے کہ ایک جماعت ایسے علما کی پیدا کریں، جو علومِ حاضرہ سے بالکل غیر متعلق نہ ہوں اور علومِ دین میں بھی انھیں دسترس ہو۔ یہی سبب ہے کہ ہم نے اسلامی علوم کی ایک فیکلٹی قائم کی ہے، ابھی اس کی ابتدا ہے لیکن مجھے امید ہے کہ یہ فیکلٹی پروان چڑھے گی۔ اگر میرے بعد جامعہ کے اربابِ اقتدار اس طرف متوجہ رہے تو امید ہے کہ ہم کچھ عرصے بعد ایسے لوگ پیدا کر سکیں گے، جو ان لوگوں سے گفتگو کر سکیں جو بالکل دوسری زبان بولنے کے عادی ہیں۔ یہ پہلا موقع نہیں ہے، جو اسلام کو پیش آیا ہے۔ اسلام کی تاریخ میں ایک مرتبہ نہیں کتنی ہی مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ ایسے لوگ پیدا کرنے کی ضرورت پیش آئی ہے، جو اسی زبان میں کلام کر سکیں جو زبان مُعترضین کی تھی۔ فلاسفہ کی توجہ سے ہمارے ہاں علم الکلام پیدا ہوا۔ ایک زمانے میں جب مُعاملہ علما کے ہاتھ سے نکل گیا تو ہم نے خانقاہیں قائم کیں۔ ہم نے صوفیا کے بڑے بڑے دائرے بنائے، اِس لیے کہ بعض ایسی تحریکات کا، جو اسلام کے خلاف تھیں، مقابلہ کر سکیں۔ ہمارے ہاں جب انگریزی تعلیم داخل ہوئی تو ہم نے شیخ عبدہ اور سر سیّد احمد خاں سے لوگ پیدا کیے۔ اب تو کیفیت یہ ہے کہ ہمارا ذہن بھی اس طرف نہیں جاتا کہ ہمیں ایسے لوگوں کے پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

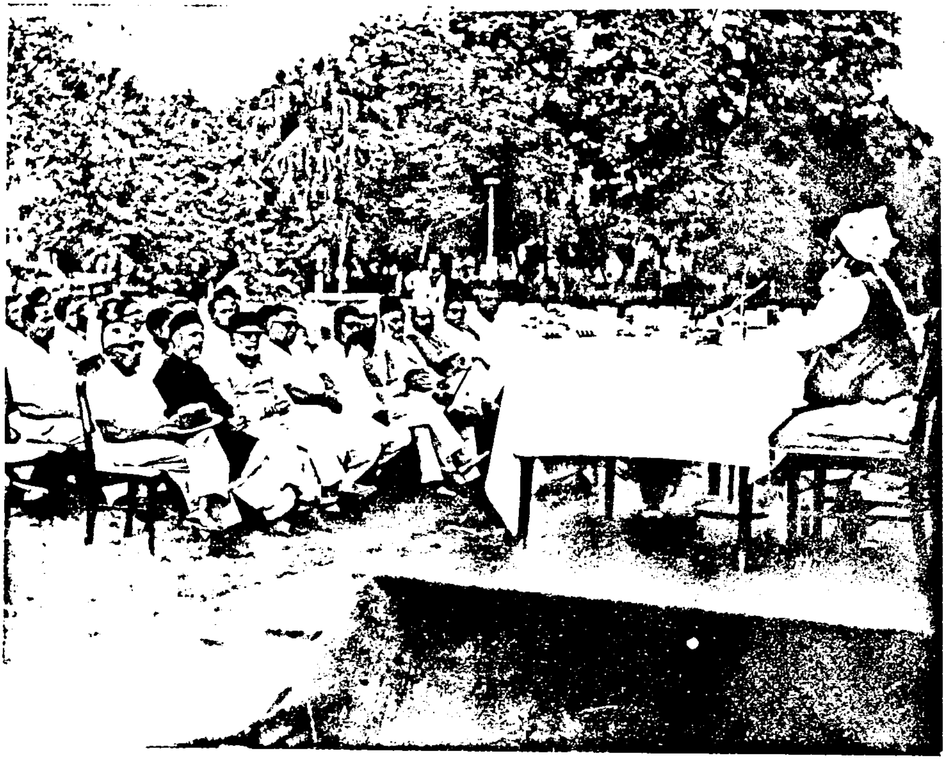
حالات دشوار ہیں اور ماحول ہمت شکن ہے لیکن میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ع

نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی

مَیں آپ کا بہت شکر گزار ہوں کہ آپ نے بڑے صبر کے ساتھ میری تقریر کو سُنا اور توجہ فرمائی۔

شامِ ہمدرد۔ کراچی

۱۰ اکتوبر ۱۹۶۳ شمسی



مولانا مفتی محمد شفیع

[شام ہمدرد لاہور ، ۳ اکتوبر ۱۹۶۳ شمسی]

حضرت مفتی محمدؒ شفیع

جنوری ۱۸۹۷ء شمسی

مفتیٔ پاکستان حضرت مولانا محمدؒ شفیع صاحب محترم کی ذاتِ گرامی سے کون واقف نہیں۔ قیامِ پاکستان کی جدوجہد اور تعمیر پاکستان کی کوششوں میں ان کا شمار صفِ اول میں ہوتا ہے۔ مذہبیات اور اسلامیات میں حضرت کے مقامِ بلند سے سب واقف ہیں۔ بلا شبہ یہ ہماری انتہائی خوش بختی ہے کہ حضرت مفتی صاحب آج اس وقت ہمارے درمیان ہیں اور آج "شامِ ہمدرد" میں ہمیں آپ کے خیالاتِ عالیہ سے مستفیض ہونے کا موقع مل رہا ہے۔

حضرت مفتی صاحب شعبان ۱۳۱۴ہجری مطابق جنوری ۱۸۹۷ش مرکز علومِ اسلامیہ دیوبند ضلع سہارنپور میں پیدا ہوئے، گویا دارالعلوم ہی میں آنکھ کھولی یہیں عام علوم و فنون کی تعلیم و تربیت پائی۔ طبِ یونانی کی تعلیم بھی پوری حاصل کی، یہیں درس و فتویٰ میں تصنیف و تالیف کی خدمات بچپن سے بڑھاپے تک انجام دیں۔ ۱۳۳۷ہجری (۱۹۱۹ش) میں تحصیلِ علوم سے فارغ ہو کر دارالعلوم میں منصبِ درس پر فائز ہوئے اور ادنیٰ سے اعلیٰ تک تمام علوم و فنون کی کتابیں بڑی کامیابی کے ساتھ زیرِ درس رہیں۔ اِس کے ساتھ تصنیف و تالیف، تقریر و تحریر نظم و نثر کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ بہت سی مفید کتابیں شائع بھی ہوئیں۔ ۱۳۴۹ہجری (۱۹۳۱ش) میں ارکان دارالعلوم نے دارالعلوم کے صدر مفتی کا منصب آپ کے سپرد کیا۔ دارالعلوم کو جو مرکزیت پورے عالمِ اسلام میں حاصل ہے اس کی اہمیت کے ساتھ یہاں فتویٰ کی خدمت کوئی معمولی کام نہ تھا۔ بڑے بڑے علما کے سوالات آتے اور اختلافی مسائل میں فیصلے کے طالب ہوتے تھے، مگر تائید ربانی سے یہ کام بھی بڑی کامیابی کے ساتھ انجام دیا۔

اِس کام میں بڑی کامیابی آپ کے شیخ مرشد حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی دامت برکاتہم کی مخصوص اعانت و توجہ سے ہوئی۔ مشکل مسائل میں ان کی طرف رجوع فرماتے تھے، یہاں تک کہ حضرت قدس سرہٗ بھی آپ کے فتاویٰ پر اعتماد فرماتے اور اہم مسائل میں ان کو شریکِ مشورہ فرماتے تھے۔ عائلی مسائل کے متعلق اہم کتاب "حیلہ ناجزہ" کی تصنیف میں حضرتؒ نے مفتی صاحب کو برابر شریک رکھا اور آخرِ کتاب میں اس کا ذکر بھی فرمایا۔ دوسرے اہم مسائل میں بھی مفتی صاحب کی تحریریں حضرتؒ نے امداد الفتاویٰ میں شامل فرمائیں۔

آخرِ عمر میں احکام القرآن کی تصنیف کی ضرورت محسوس ہوئی تو اس کام کا بھی ایک بڑا حصہ حضرت مفتی صاحب کو سپرد فرمایا، جو مفتی صاحب کی ایک اہم تصنیف (عربی زبان میں) ہے، مگر ابھی تک

اس کی اشاعت کا انتظام نہیں ہو سکا۔ یہاں یہ بات خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے کہ مفتی صاحب نے شروع میں شیخ العرب والعجم حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ کے دستِ حق پرست پر بیعت استرشاد کی تھی۔ ان کی وفات کے بعد ۱۳۴۶ ہجری سے حضرت حکیم الامۃ تھانوی قدس سرہٗ سے رجوع اور ان کی خدمت و صحبت سے استفادے کا سلسلہ جاری ہوا اور ۱۳۴۹ ہجری میں حکیم الامۃ قدس سرہٗ نے آپ کو اجازتِ بیعت عطا فرمائی۔ اِس طرح علوم ظاہرہ کی تکمیل دارالعلوم دیوبند میں اور تزکیۂ اخلاق و تصوّف کی تعلیم خانقاہ تھانہ بھون میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

دارالعلوم کراچی میں فتویٰ کے ساتھ حدیث کی اعلا کتابوں کا درس بھی جاری رہا۔ تقریباً چالیس ہزار فتاویٰ موصوف کے قلم سے نکل کر عالمِ اسلام میں پھیلے، جس کا ایک چھوٹا سا حصّہ کتابی صورت میں فتاویٰ دارالعلوم دیوبند کے نام سے آٹھ جلدوں میں شائع بھی ہو چکا ہے۔ ۱۳۶۲ ہجری (۱۹۴۳ ش) میں جب کہ مشترکہ ہندُستان میں تحریکِ پاکستان قوت سے اٹھی۔ اُس وقت اپنے اُستاد شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کے ساتھ دارالعلوم سے استعفادے کر پوری توجہ بنائے پاکستان کی تحریک میں صَرف کی۔ مستقل رسائل اور اخباری بیانات اور فتاویٰ کے علاوہ پورے ملک کا دورہ تحریکِ پاکستان کے لیے مسلمانوں کو آمادہ کرنے کے واسطے کیا۔ سابق صوبۂ سرحد کے ریفرنڈم اور پاکستان کی کامیابی میں بڑا دخل حضرت شیخ الاسلام علامہ عثمانیؒ اور مفتی صاحب کی کوششوں کا ہے، ورنہ اس صوبے کے بیشتر علما کانگریس کے حامی اور تقسیمِ ملک کے مخالف تھے۔ پاکستان بن جانے کے بعد کراچی کے علما اور معززین شہر نے اس کی ضرورت محسوس کی کہ دستورِ پاکستان کا ایک خاکہ خالص اسلامی بنیادوں پر مرتب ہو جائے تو اس کے لیے بہ مشورہ شیخ الاسلام مولانا عثمانیؒ حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ، ڈاکٹر حمید اللہ، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا مفتی محمد شفیع کے اسمائے گرامی تجویز ہوئے کہ ان کو اس کام کے لیے پاکستان بلایا جائے۔ اِسی تحریک پر مئی ۱۹۴۸ ش میں مفتی صاحب کراچی پہنچے اور پھر یہیں مستقل قیام کا ارادہ کیا۔ یہ دستوری خاکہ سب نے مل کر تیار کیا۔ پھر اسی سال دستور ساز اسمبلی نے کام شروع کیا تو اس میں ایک مشاورتی بورڈ علما کا مقرر کیا۔ اس بورڈ میں بھی مفتی صاحب ایک اہم رکن کی حیثیت سے آخر تک شامل رہے۔ حکومت کی طرف سے پہلا لا کمیشن بنا اور زکوٰۃ کمیٹی بنی، ان سب میں مفتی صاحب کی شرکت خاص اہمیت سے رہی۔

۱۳۷۰ ہجری (۱۹۵۱ ش) میں شہر کراچی میں ایک دارالعلوم کی بنیاد رکھی، جو اب ایک مستقل ادارے کی صورت میں چل رہا ہے، ایک وسط شہر محلہ نانک واڑہ میں، دوسرا شہر سے باہر کورنگی ٹاؤن میں مفتی صاحب اس دارالعلوم کے بانی بھی ہیں اور مجلسِ انتظامیہ کے صدر بھی۔ اس کے ساتھ فتاویٰ کی بھاری ذمّے داری اور کچھ سلسلۂ درس بھی جاری ہے۔ دارالعلوم کراچی میں جو فتاویٰ اب تک درجِ رجسٹر ہو چکے ہیں ان کی تعداد

ستر ہزار سے زائد ہے مستقل تصانیف اور مقالات اور زبانی تبلیغ و دعوت کا سلسلہ اس کے علاوہ ہے۔
دعا ہے کہ مسلمان ان کے علمی و عملی افادات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں۔

جناب محترم مفتی صاحب کی آج کی تقریر کا موضوع ہے "اختلافِ امت پر ایک نظر اور مسلمانوں کے لیے راہِ عمل"
اختلافِ رائے انسان کی افتادِ طبع کے تابع ہوتا ہے جس طرح انسانوں کے چہرے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں اسی طرح ان کے طبائع میں بھی اختلاف ہے۔ گویا اختلافِ رائے ایک فطری بات ہے اور فطرت نے کسی چیز کو بے فائدہ نہیں پیدا کیا ہے۔ داعیٔ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے اختلاف کو باعثِ رحمت قرار دیا۔ دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کے سارے فتنے اسی اختلاف کے جگائے ہوئے ہیں۔ یہی اختلاف جس کو رحمت کہا گیا ہے اگر بربنائے مخالفت ہو تو اتنی بڑی زحمت اور مصیبت بن جاتا ہے کہ بنی نوعِ انسان کے لیے اس سے بڑی مصیبت اور کوئی نہیں ہو سکتی ہے، لہٰذا معلوم ہوا کہ اختلاف اور مخالفت ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ خدا تعالیٰ نے اس عالم کو اختلاف ہی سے زینت دی ہے۔ اس عالم کا سارا حسن و جمال اختلاف کا رہینِ منت ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زیبائش اختلاف کا دوسرا نام ہے۔ یہی نہیں بلکہ غور کرنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عالم کی تخلیق اور کون و فساد کے سارے نظام کی بنا ہی اختلاف پر ہے۔ کائنات سرد و گرم، تر و خشک اور جذب و دفع کا ایک کھیل ہے اور یہ ایک دوسرے سے مختلف ہی نہیں، بلکہ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اگر اس اختلاف کی بنا توحید و تکوین پر ہو تو موجبِ تعمیر ہے، ورنہ موجبِ تخریب۔ مذہبِ اسلام توحید کا سب سے بڑا داعی ہے۔ اسلام کے ہر فکر و فعل میں خدا قدرِ مشترک یا قدرِ مطلق کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ کثرت میں وحدت کے مشاہدے کی تعلیم دیتا ہے۔ یہ ساری کثرت وحدت کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ اگر ہمارا اختلاف اس ہم آہنگی کا مظہر نہ ہو بلکہ اس سے منحرف ہو تو وہ اختلاف نہیں نفاق ہے۔ وہ اختلاف محمود ہے جس کا مقصد و منشا یکجہتی کو قائم رکھنا اور انحراف سے بچانا ہو، ورنہ مذموم۔ وہ اختلاف یقیناً باعثِ برکت و رحمت ہے جو انسانوں کو حق پر جمع کرے اور ناحق سے روکے۔ ایسا اختلاف درحقیقت اتفاق کا موجب ہے۔ جو شخص اس لیے اختلاف کرتا ہے کہ اپنی ناجائز خواہشات کی تکمیل کرے وہ دراصل اختلاف نہیں کرتا، مخالفت و انحراف کرتا ہے۔

اسلام نے باطل سے اختلاف کو بڑی اہمیت دی ہے اور خطرے کے وقت باطل سے اختلاف کو افضل الجہاد قرار دیا ہے۔ چنانچہ فرمایا کہ جابر حاکم کے سامنے سچ کہہ دینا سب سے بڑا جہاد ہے۔ اسلام نے دوسروں سے اختلاف پر ہی زور نہیں دیا ہے، بلکہ خود اپنے نفس کو بُری باتوں سے یعنی ایسی باتوں سے کہ جو خدا سے ہم آہنگی و اتحاد میں حائل ہوں، روکنے کو جہادِ اکبر کہا ہے۔ اس قسم کے مسائل پر سیر حاصل گفتگو کرنا حضرت مفتی صاحب محترم کا منصب ہے۔ حضرت ہی اپنے آج کے دل چسپ اور وقت کے لحاظ سے نہایت ضروری موضوع پر عالمانہ تبصرہ فرمانے کے اہل ہیں اور خصوصیت کے ساتھ اسلام کے داخلی اختلاف پر گفتگو کرنے کا حق قطعی طور پر حضرت مفتی صاحب قبلہ جیسے متبحر عالم کو ہی پہنچتا ہے۔

محمد سعید

اختلافاتِ اُمّت پر ایک نظر
اور
مسلمانوں کے لیے راہِ عمل

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی۔

اِس وقت میرے مقالے کا موضوع " اختلافِ امت پر ایک نظر" ہے۔ میں اس کو سیدی حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہ کے ایک ارشاد سے شروع کرتا ہوں، جو آپ نے مالٹا کی چار سالہ اسیری سے رہائی کے بعد دارالعلوم دیوبند میں علما کے ایک مجمع کے سامنے فرمایا تھا۔

جو لوگ حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے واقف ہیں وہ اس سے بھی بے خبر نہیں ہیں کہ ان کی یہ قید و بند عام سیاسی لیڈروں کی قید نہ تھی۔ جنگِ آزادی میں اِس درویش کی ساری تحریکات صرف رضائے حق سبحانہ' و تعالیٰ کے لیے' اُمّت کی صلاح و فلاح کے گرد گھومتی تھیں۔ مسافرت اور انتہائی بے کسی کے عالم میں گرفتاری کے وقت جملہ جو اُن کی زبانِ مبارک پر آیا تھا، اُن کے عزم اور مقصد کا پتا دیتا ہے۔ فرمایا" الحمدللہ بمصیبتے گرفتارم نہ بمعصیتے"۔ جیل کی تنہائیوں میں ایک روز بہت مغموم دیکھ کر بعض رفقا نے کچھ تسلی کے الفاظ کہنا چاہے تو فرمایا، " اِس تکلیف کا کیا غم ہے جو ایک دن ختم ہو جانے والی ہے، غم اس کا ہے کہ یہ تکلیف و محنت اللہ کے نزدیک قبول ہے یا نہیں"۔

مالٹا کی قید سے واپس آنے کے بعد ایک رات بعد نمازِ عشا دارالعلوم میں تشریف فرما تھے، علما کا بڑا مجمع سامنے تھا، اس وقت فرمایا" ہم نے تو مالٹا کی زندگی میں دو سبق سیکھے ہیں"۔ یہ الفاظ سُن کر سارا مجمع ہمہ تن گوش ہو گیا کہ اُستاذ العلما درویش نے اسّی سال علما کو درس دینے کے بعد آخر عمر

میں جو سبق سیکھے ہیں، وہ کیا ہیں۔ فرمایا،

"مَیں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پُوری دُنیا میں مسلمان دینی اور دُنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے۔ ایک اُن کا قرآن کو چھوڑ دینا، دوسرے آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی۔ اِس لیے مَیں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صَرف کر دُوں کہ قرآنِ کریم کو لفظاً اور معناً عام کیا جائے۔ بچّوں کے لیے لفظی تعلیم کے مکاتب بستی بستی میں قائم کیے جائیں۔ بڑوں کو عوامی درسِ قرآن کی صُورت میں اس کے معانی سے رُوشناس کرایا جائے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لیے آمادہ کیا جائے، اور مسلمانوں کے باہمی جنگ و جدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے۔"

نبّاضِ اُمّت نے مِلّتِ مرحومہ کے مرض کی جو تشخیص اور تجویز فرمائی تھی، باقی ایامِ زندگی میں ضعف و علالت اور ہجومِ مشاغل کے باوجود اس کے لیے سعیٔ پیہم فرمائی۔ بذاتِ خود درسِ قرآن شروع کرایا، جس میں تمام علمائے شہر اور حضرت مولانا حُسین احمد مدنی اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی جیسے علما بھی شریک ہوتے تھے اور عوام بھی۔ اس ناکارہ کو اس درس میں شرکت کا شرف حاصل رہا ہے، مگر اس واقعے کے بعد حضرتؒ کی عمر ہی گنتی کے چند ایام تھے۔ آں قدح بہ شکست وآں ساقی نماند!

آج بھی مسلمان جن بلاؤں میں مبتلا اور جن حوادث و آفات سے دوچار ہیں، اگر بصیرت سے کام لیا جائے تو ان کے سب سے بڑے سبب یہی دو ثابت ہوں گے —— قرآن کو چھوڑنا اور آپس میں لڑنا —— غور کیا جائے تو یہ آپس کی لڑائی بھی قرآن کو چھوڑنے کا ہی لازمی نتیجہ ہے۔ قرآن پر کسی درجے میں بھی عمل ہوتا تو خانہ جنگی یہاں تک نہ پہنچتی۔

اِختلافِ رائے کچھ مذموم نہیں اگر اپنی حدود کے اندر ہو۔ انسان کی فطرت میں اس کے پیدا کرنے والے نے عین حِکمت کے مطابق ایک مادّہ غصّہ اور مدافعت کا بھی رکھا ہے اور وہ انسان کی بقا و ارتقا کے لیے ضروری ہے، مگر یہ مادّہ دشمن کی مدافعت کے لیے رکھا گیا ہے۔ اگر اس کا رُخ دوسری طرف ہو جائے، خواہ اِس لیے کہ دشمن کے پہچاننے اور متعیّن کرنے میں غلطی ہو گئی ہو یا کسی دوسری وجہ سے، بہرحال جب اس کا رُخ بدلے گا تو یہ خود اپنی تباہی کا ذریعہ بنے گا۔ اسی لیے قرآنِ کریم نے مومن کے لیے پوری وضاحت کے ساتھ اس کا رُخ متعیّن فرما دیا۔

إِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوهُ عَدُوًّا "شیطان تمھارا دشمن ہے، اس کو ہمیشہ دشمن سمجھتے رہو۔" جس کا حاصل یہ ہے کہ مومن کے غصّے اور لڑائی کا مَصرفِ صحیح صرف شیطان اور شیطانی طاقتیں ہیں۔ جب اس کی جنگ کا رُخ اس طرف ہوتا ہے تو وہ جنگ قرآن کی اِصطلاح میں جہاد کہلاتی ہے، جو اعظمِ عبادات میں سے ہے۔ حدیث میں فرمایا ہے ذُرْوَةُ سَنَامِهِ الْجِهَادُ یعنی

اسلام میں سب سے اعلا کام جہاد ہے۔ لیکن اگر اس جنگ کا رُخ ذرا اس طرف سے ہٹا تو یہ جہاد کے بجائے فساد کہلاتی ہے، جس سے بچانے ہی کے لیے اللہ کے سارے رسول اور کتابیں آئی ہیں۔ شکل وصورت کے اعتبار سے جہاد اور فساد میں کوئی فرق نہیں ہوتا، وہ کانٹا جہاں سے یہ لائینیں بدلتی ہیں، صرف یہ ہے کہ اس کا رُخ شیطان اور شیطانی طاقتوں کی طرف ہے تو جہاد ورنہ فساد۔ دو قومی نظریہ، جس نے پاکستان بنوایا، اسی اجمال کی عملی تفصیل تھی کہ کلمہ اور اسلام کے ماننے والے ایک متحد قوم ہیں اور نہ ماننے والے دوسری قوم۔ ان کے جہاد کا رُخ اس طرف ہونا چاہیے۔ حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ نے جہاد کے فرض ہونے کی ایک حکمت یہ بھی بیان فرمائی کہ قہر وغضب اور مدافعت کا مادّہ، جو انسانی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے، جب جہاد کے ذریعے اپنا صحیح مصرف پالیتا ہے تو آپس کی خانہ جنگی اور فساد سے خود بہ خود نجات ہو جاتی ہے، ورنہ اس کی مثال ایسی ہوتی ہے کہ جس چھت میں بارش کا پانی نکلنے کا راستہ پرنالوں کے ذریعے نہ بنایا جائے تو پھر یہ پانی چھت کو توڑ کر اندر آتا ہے۔

آج اگر غور کیا جائے تو پورے عالَم اسلام پر یہی مثال صادق آتی ہے۔ شیطان اور شیطانی تعلیم، کفر والحاد، خدا اور رسول سے بغاوت، فحاشی وعیاشی سے طبیعتیں مانوس ہو رہی ہیں۔ ان کی نفرت دلوں سے نکل چکی ہے، اس پر کسی کو غصہ نہیں آتا، انسانی رواداری، اخلاق، مروّت کا سارا زور کفر والحاد اور ظلم کی حمایت میں صَرف ہوتا ہے۔ نفرت، بغاوت، عداوت کا میدان خود اپنے اعضاء جوارح کی طرف ہے۔ آپس میں ذرا ذرا سی بات پر جھگڑا لڑائی ہے۔ چھوٹا سا نقطۂ اختلاف ہو تو اس کو بڑھا کر پہاڑ بنا دیا جاتا ہے۔ اخبارات و رسائل کی غذا یہی بن کر رہ گئی ہے۔ دونوں طرف سے اپنی پوری توانائی اس طرح صَرف کی جاتی ہے کہ گویا جہاد ہو رہا ہے، دو متحارب طاقتیں لڑ رہی ہیں اور کوئی خدا کا بندہ ذرا اپنی طرف نظر کر کے نہیں دیکھتا ع ظالم جو بہہ رہا ہے وہ تیرا ہی گھر نہ ہو۔

سیاست ممالک سے لے کر خاندانی اور گھریلو معاملات تک سب میں اسی کا مظاہرہ ہے۔ جہاں دیکھو اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ کا سبق پڑھنے والے آپس میں گتھم گتھا ہیں۔ قرآن حکیم نے جہاں عفو و درگزر، حلم و بُردباری کی تعلیم کی تھی وہاں جنگ ہو رہی ہے اور جس محاذ پر جہاد کی دعوت تھی، وہ محاذ دشمنوں کی یلغار کے لیے خالی پڑا ہے۔ فَاِلَی اللّٰہِ الْمُشْتَکٰی وَاِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

اسمبلیوں، کونسلوں، میونسپل بورڈوں کی نشست، حکومت کے عہدے داروں اور ملازمتوں کی دوڑ، صنعت و تجارت میں مقابلہ اور کمپی ٹیشن، جائدادوں اور زمینداروں کی کش مکش، جہاں خالص اپنے حقوق کی جنگ ہے، جس کو چھوڑ بیٹھنا سب کے نزدیک ایثار اور اعلا اخلاق کا ثبوت ہے، وہاں کوئی ایک انچ اپنی جگہ سے سرکنے کو تیار نہیں۔ دین و مذہب کے نام پر کام کرنے والوں کی اوّل تو تعداد ہی کم ہے اور جو ہے وہ عموماً قرآن و سنّت کی بنیادی تعلیمات سے اغماض کر کے جزوی اور

فروعی مسائل میں الجھ کر رہ گئی ہے۔ چھوٹے سے چھوٹا مسئلہ معرکۂ جدال بنا ہوا ہے، جس کے پیچھے غیبت، جھوٹ، ایذائے مسلم، افترا و بہتان، تمسخر و استہزا جیسے متفق علیہ کبیرہ گناہوں کی بھی پروا نہیں کی جاتی۔ دین کے نام پر خدا کے گھروں میں جدال و قتال اور لڑائیاں ہیں۔ نوبت پولیس اور عدالتوں تک پہنچی ہوئی ہے۔

ان دین داروں کو خدا اور رسول پر استہزا کرنے والوں، شراب پینے والوں، سُود اور رشوت کھانے والوں سے وہ نفرت نہیں جو ان مسائل میں اختلاف رکھنے والوں سے ہے۔

کوئی خدا کا بندہ اس پر نظر نہیں کرتا کہ اس کے مثبت و منفی دونوں پہلوؤں میں کوئی بھی کسی کے نزدیک ایسا نہیں جس کے لیے مسلمانوں سے جنگ کرنا جائز ہو، جس کے لیے دوسروں کی غیبت و بہتان، تذلیل و تحقیر روا ہو۔

اصلاحِ حال کی ایک غلط کوشش: ہمارے نو تعلیم یافتہ روشن خیال مصلحین کی توجہ جب اِس باہمی اختلاف کے مہلک نتائج کی طرف جاتی ہے اور اس کے علاج کی فکر ہوتی ہے تو ان کے خیال میں ساری خرابیاں صرف ان اختلافات میں نظر آتی ہیں جو دین و مذہب کے نام پر سامنے آتے ہیں اور وہ صرف اسی اختلاف کو مٹانے کے لیے علاج سوچتے ہیں۔ وہ اس وقت ان سب لڑائیوں کو بھول جاتے ہیں جو خالص نفسانی اور ذاتی اغراض کے لیے لڑی جا رہی ہیں، جن کے لیے ایک دوسرے کی جان، آبرو اور مال سب کچھ حلال سمجھ لیا جاتا ہے، جس کے پیچھے پورے ملک میں باہمی منافرت کے سیلاب اُمنڈتے ہیں، مگر ان کو چوں کہ نئی تعلیم نے تہذیب و شرافت کا نام دے دیا ہے، اِس لیے نہ وہ قوم کے لیے کوئی مرض رہا نہ اس کا علاج سوچنے کی ضرورت رہی۔ اختلاف و لڑائی میں صرف مُلّا بدنام ہے، اسی کا علاج زیرِ غور رہتا ہے، حالاں کہ دین و مذہب کے نام پر جو اختلافات ہیں، اگر غور کیا جائے تو ان کی خرابی صرف حدُود سے تجاوز کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے، ورنہ وہ کوئی برادری کا نوتہ نہیں بن سکتے۔ وہ اپنے ذاتی حقوق نہیں، جنھیں ایثار کیا جا سکے، بلکہ قرآن و سنت کی تعبیر کے اختلافات ہیں، جن کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔

ہمارے بعض روشن خیال مصلحین نے سارا فساد انھیں اختلافات میں منحصر سمجھ کر اس کا یہ علاج تجویز کیا کہ فرقہ وارانہ اختلافات کو ہٹا کر سب کا ایک نیا اور مشترک مذہب بنا لیا جائے۔ پوری قوم کا وہی ایک مذہب ہو، تاکہ اختلاف کی بنیاد ہی ختم ہو جائے، مگر یہ بات مذہبی مسائل میں عقلاً صحیح ہے نہ عملاً ممکن۔ ہاں خالص دُنیوی معاملات، جن میں جھگڑا ذاتی حقوق ہی کا ہو، وہاں اپنے اپنے مطالبات کو نظر انداز کر کے ایسی صُلح کی جا سکتی ہے، اس لیے باہمی جنگ و جدل کا علاج یہ نہیں کہ اختلافِ رائے کو مٹا کر سب کو ایک نظریے کا پابند کر دیا جائے۔

روم کی عیسائی سلطنت کی طرف سے موقع پاکر حضرت معاویہؓ کو اپنے ساتھ ملانے اور ان کی مدد کرنے کا پیغام ملا تو حضرت معاویہؓ کا جواب یہ تھا کہ ہمارے اختلاف سے دھوکا نہ کھاؤ۔ اگر تم نے مسلمانوں کی طرف رُخ کیا تو علیؓ کے لشکر کا پہلا سپاہی جو تمہارے مقابلے کے لیے نکلے گا وہ معاویہ ہوگا۔ معلوم یہ ہوا کہ باہمی اختلاف جو منافقین کی گہری سازشوں سے تشدّد کا رُخ اختیار کرچکا تھا، اس میں بھی اسلام کے بنیادی حقائق کسی کی نظر سے اوجھل نہیں ہوئے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ تعبیرِ کتاب وسنت کے ماتحت اختلافِ رائے جو صحابہ وتابعین اور ائمۂ مجتہدین میں رہا ہے تو وہ بلاشبہ رحمت ہی ہے۔ اس کا کوئی پہلو نہ پہلے مسلمانوں کے لیے مضر ثابت ہوا اور نہ آج ہوسکتا ہے، بشرطیکہ وہ انھیں حدود کے اندر رہے جن میں ان حضرات نے رکھا تھا کہ ان کا اثر نماز، جماعت، امامت اور معاشرت کے کسی مُعاملے میں نہ پڑتا تھا۔

مذہب کے نام پر دوسرے اختلافات قرونِ اُولیٰ کے بعد بدعت وسنّت اور دوسرے عنوانات سے پَیدا ہوئے۔ بہت سے لوگوں نے قرآن وسنّت کی تعبیر میں اصولِ صحیحہ کو چھوڑ کر ذاتی رایوں کو امام بنالیا اور نئے نئے مسَائل پیدا کردیے۔ اختلافات بلاشبہ وہ تفریق وافتراق تھے جن سے قرآن وسنّت میں مسلمانوں کو ڈرایا گیا ہے، ان کے ختم یا کم کرنے کی کوشش بلاشبہ مفید تھی، مگر قرآن حکیم نے اس کا بھی ایک خاص طریق بتادیا ہے، جس کے ذریعے تفریق کی خلیج کم ہوتی چلی جائے، بڑھنے نہ پائے۔ یہ وہ اصولِ دعوت اِلی الخیر ہیں، جن میں سب سے پہلے حکمت وتدبیر سے اور پھر خیر خواہی وہمدردی اور نرم عنوان سے لوگوں کو قرآن وسنّت کے صحیح مفہوم کی طرف بُلانا ہے اور آخر میں مُجَادِلہ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ یعنی حجت و دلیل کے سَاتھ افہام وتفہیم کی کوشش ہے۔ افسوس ہے کہ آج کلّ عام اہلِ علم اور مصلحین نے ان اصولوں کو نظر انداز کردیا۔ صرف جدال میں اور وہ بھی غیر مشروع انداز سے مشغول ہوگئے کہ اپنے حریف کا استہزا اس کو زیر کرنے کے لیے جھوٹے سچّے، جائز ناجائز ہر طرح کے حربے استعمال کرنا اختیار کرلیا، جس کا لازمی نتیجہ جنگ وجدل اور جھگڑا فساد تھا۔

مذہب کے نام پر اختلافات کی خرابیوں کا وقتی علاج: آج جب کہ مسلمانوں کا تفرق اِنتہا کو پہنچا ہوا ہے۔ اپنی مزعومات کے خلاف کوئی کسی کی بات ماننے بلکہ سننے کے لیے بھی تیار نہیں، اور کوئی ایسی قوت نہیں کہ کسی فریق کو مجبور کرسکے۔ تو اس باہمی جنگ وجدال اور اس کے مُہلک اثرات سے اسلام اور مسلمانوں کو بچانے کا صرف ایک راستہ ہے کہ فرقوں اور جماعتوں کے ذمّے دار ذرا اس پر غور کریں کہ جن مسائل میں ہم جھگڑ رہے ہیں کیا وہی اسلام کے بنیادی مسائل ہیں جن کے لیے قرآن نازل ہوا؟ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے۔ آپ نے اپنی زندگی ان کے لیے وقف کردی اور ان کے پیچھے ہر طرح کی قربانیاں دیں یا بنیادی مسَائل اور قرآن اور اسلام کا اصلی مُطالبہ کچھ

اور ہے۔ جس ملک میں ایک طرف عیسائی مشنریاں اپنی پوری قوت اور دنیاوی چمک دمک کے ساتھ اس کو عیسائی ملک بنانے کے خواب دیکھ رہی ہیں۔ ایک طرف کھلے بندوں خدا اور رسول اور ان کی تعلیمات کا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔ ایک طرف قرآن اور اسلام کے نام پر وہ سب کچھ کیا جا رہا ہے جس کو دنیا سے مٹانے ہی کے لیے قرآن اور اسلام آیا تھا۔ اس جگہ صرف فروعی مسائل اور اُن کی تحقیق و تنقید اور ترویج کی کوشش میں اُلجھ کر اُن بنیادی مہمات سے غفلت برتنے والوں سے اگر اللہ تعالیٰ و رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ مطالبہ ہو کہ ہمارے دین پر یہ اُفتادیں پڑ رہی تھیں، تم نے اس کے لیے کیا کیا؟ تو ہمارا کیا جواب ہوگا؟ مجھے یقین ہے کہ کوئی فرقہ، کوئی جماعت جب ذرا اپنے وقتی جھگڑوں سے بلند ہو کر اس کو سوچے گی تو اس کو اپنی موجودہ مصروفیات پر ندامت ہوگی اور اس کی کوشش کا رُخ بدلے گا۔ اس کے نتیجے میں باہمی آویزش یقیناً کم ہوگی۔

میں اس وقت کسی کو یہ نہیں کہتا کہ وہ اپنے خیالات و مزعومات کو بدلیں۔ گزارش صرف اِتنی ہے کہ اپنی توانائی صرف کرنے کا صحیح محل تلاش کر کے اس پر لگادیں اور باہمی اختلافات کو صرف حلقۂ درس یا فتویٰ یا تحقیقی رسائل تک محدود کر دیں اور ان میں بھی لب و لہجہ قرآنی اصولِ دعوت کے مطابق عام رکھیں۔ فقرے کسنے اور دوسرے کی توہین کرنے کو زہر سمجھیں۔ ہمارے پبلک جلسے، اخبار، اشتہار بجائے باہمی آویزش کو ہوا دینے کے ——— اسلام کے بنیادی اور متفق علیہ مسائل پر لگ جائیں ——— تو پھر ہماری جنگ، جو فساد کی صورت اختیار کر چکی ہے، دوبارہ جہاد میں تبدیل ہو جائے گی اور اس کے نتیجے میں عوام کا رُخ بھی باہمی جنگ و جدل سے پھر کر دین کی صحیح خدمت کی طرف ہو جائے گا۔

عوام کا ایک مغالطہ اور اس کا حل: بہت سے حضرات مسائل میں علما کے اختلافات سے پریشان ہو کر پوچھا کرتے ہیں کہ ہم کدھر جائیں؟ اس کی تہہ میں یہ پوشیدہ ہوتا ہے کہ اب ہم کسی کی نہ سنیں، سب سے آزاد ہو کر جو سمجھ میں آئے، کیا کریں اور بظاہر ان کا یہ معصومانہ سوال حق بجانب نظر آتا ہے، لیکن ذرا غور فرمائیں تو ان کو اس کا جواب اپنے گرد و پیش کے معاملات میں خود ہی مل جائے گا۔ ایک صاحب بیمار ہوئے۔ حکیموں یا ڈاکٹروں کی رایوں میں تشخیص و تجویز کے بارے میں اختلاف ہو گیا تو وہ کیا کرتے ہیں۔ یہی نا کہ وہ ان حکیموں، ڈاکٹروں کی تعلیمی ڈگریاں معلوم کر کے یا پھر ان کے مطب میں علاج کرانے والے مریضوں سے یا دوسرے اہلِ تجربہ سے دریافت کر کے اپنے علاج کے لیے کسی ایک معالج کو متعین کر لیتے ہیں۔ اسی کی تشخیص و تجویز پر عمل کرتے ہیں، مگر دوسرے حکیموں، ڈاکٹروں کو بُرا بھلا کہتے نہیں پھرتے۔ یہاں کسی کا یہ خیال نہیں ہوتا کہ معالجوں میں اختلاف ہے تو سب کو چھوڑو، اپنی آزاد رائے سے جو چاہو کرو۔ کیا یہی طرزِ عمل علما کے اختلاف

کے وقت نہیں کر سکتے۔
ایک مثال اور لیجیے۔ آپ کو ایک مقدمہ عدالت میں دائر کرنا ہے۔ قانون جاننے والے وکلا سے مشورہ کیا۔ ان میں اختلاف رائے ہوا تو کوئی آدمی یہ تجویز نہیں کرتا کہ مقدمہ دائر کرنا ہی چھوڑ بیٹھے یا پھر کسی وکیل کی نہ سنے۔ خود اپنی رائے سے جو سمجھ میں آئے کرے۔ بلکہ ہوتا یہی ہے کہ مختلف طریقوں سے ہر شخص اتنی تحقیق کر لیتا ہے کہ ان میں کون سا وکیل اچھا جاننے والا اور قابلِ اعتماد ہے، اس کو اپنا وکیل بنا لیتا ہے اور دوسرے وکلا کو باوجود اختلاف کے دشمن نہیں سمجھتا، بُرا بھلا نہیں کہتا، اس سے لڑتا نہیں پھرتا۔
یہی فطری اور سہل اصُول اختلافِ علما کے وقت کیوں اختیار نہیں کیا جاتا؟ یہاں ایک بات یہ بھی سن لی جائے کہ بیماری اور مقدمے کے معاملات میں تو اگر آپ نے کسی غلط مُعالج یا غیر معتمد وکیل پر اعتماد کر کے اپنا مُعاملہ اس کے حوالے کر دیا تو اس کا جو نقصان پہنچنا ہے وہ آپ کو ضرور پہنچے گا، مگر علما کے اختلاف میں اس نقصان کا بھی خطرہ نہیں۔ حدیث میں ہے کہ کسی شخص نے اگر کسی عالم سے سوال کیا اور اس نے فتویٰ غلط دے دیا تو اس کا گناہ سوال کرنے والے پر نہیں، بلکہ فتویٰ دینے والے پر ہے۔ شرط یہ ہے کہ سوال اس شخص سے کیا گیا ہو، جس کا عالم ہونا آپ نے ایسی ہی تحقیق و جستجو کے ذریعے معلوم کیا ہو جو اچھے مُعالج اور اچھے وکیل کی تلاش میں آپ کیا کرتے ہیں۔ اپنی مقدور بھر صحیح عالم کی تلاش و جستجو کر کے آپ نے اس کے قول پر عمل کر لیا تو آپ اللہ کے نزدیک بَری ہو گئے۔ اگر اس نے غلط بھی بتا دیا ہے تو آپ پر اس کا کوئی نقصان یا الزام نہیں۔ ہاں یہ نہ ہونا چاہیے کہ ڈاکٹر کی تلاش میں تو آپ اس کا ایم۔ بی۔ بی۔ ایس ہونا بھی معلوم کریں اور یہ بھی کہ اس کے مطب میں کس طرح کے مریض زیادہ شفایاب ہوتے ہیں، مگر عالم کی تلاش میں صرف عمامے، کرتے اور ڈاڑھی کو یا زیادہ سے زیادہ جلسے میں کچھ بول لینے کو معیار بنا لیں۔ اگر آپ نے ایسا کیا تو آپ اپنی ذمّے داری سے بَری نہیں۔ اس نے جواب میں کوئی غلطی کی تو آپ بھی اس کے مجرم قرار پائیں گے۔
خلاصۂ کلام یہ ہے کہ آج مذہب کے نام پر جو جنگ و جدال کا بازار گرم ہے، اس کے دُو رکن ہیں:
ایک ہر فرقہ اور جماعت کے علما دوسرے وہ عوام جو اُن کے پیچھے چلنے والے ہیں۔
علما اگر اپنی تحقیق و تنقید میں قرآنی اصولِ دعوت کے مطابق دوسروں کی تنقیص و توہین سے پرہیز کرنے لگیں اور اسلام کے وہ بنیادی مسائل، جن میں کسی فرقے کو اختلاف نہیں اور اسلام اور مسلمانوں پر جو مصائب آج آ رہے ہیں وہ سب انھیں مسائل سے متعلق ہیں، اپنی کوششوں اور محنتوں کا رُخ اس طرف پھیر دیں۔ اِسی طرح عوام اپنی مقدور بھر پوری کوشش کر کے کسی صحیح عالم کا انتخاب کریں اور پھر اس کے بتائے ہوئے طریقے پر چلتے رہیں۔ دوسرے علما یا ان کے ماننے والوں سے

لڑتے نہ پھریں تو بتائیے کہ اس میں اشکال کیا ہے؟ سارے فرقے اور ان کے اختلافات بدستور رہتے ہوئے بھی یہ باہمی جنگ و جدل ختم ہوسکتا ہے، جس نے آج مسلمانوں کو کسی کام کا نہیں چھوڑا۔ صرف ذرا سی توجہ دینے اور دلانے اور طرزِ عمل بدلنے کی ضرورت ہے۔ کاش میری یہ آواز ان بزرگوں اور دوستوں تک پہنچے جو اِس راہ میں کچھ کام کرسکتے ہیں اور محض اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر اس ہمدردانہ دعوت کے لیے کھڑے ہوجائیں تو امّت کی بہت سی مشکلات حل ہوجائیں اور ہمارا پورا معاشرہ جن مہلک خرابیوں کے غار میں جاچکا ہے، ان سے نجات مل جائے۔

عام سیاسی اور شخصی جھگڑوں کا علاج: جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ مذہبی معاملات میں جس شخص نے کوئی خاص رُخ اختیار کر رکھا ہے، وہ اسی کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تلقین سمجھ کر اختیار کیے ہوئے ہے، خواہ وہ حقیقت کے اعتبار سے بالکل غلط ہی ہو مگر اس کا نظریہ کم از کم یہی ہے کہ وہ اللہ کا دین ہے۔ ان حالات میں اس کو ہمدردی اور نرمی سے اپنی جگہ انہام و تفہیم کی کوشش تو بجائے خود جاری رہنا چاہیے، لیکن جب تک اس کا نظریہ نہ بدلے اس کو یہ دعوت نہیں دی جاسکتی کہ تم ایثار کر کے اپنا نظریہ چھوڑ دو اور صلح کرلو۔ ان سے تو صرف یہ کہا جاسکتا ہے کہ اختلافِ رائے کو اپنی حدود کے اندر رکھیں اور انہام و تفہیم، قرآنی اصولِ حکمت، موعظت مجادلہ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ کو نظر انداز نہ کریں، مگر جن معاملات کا تعلق صرف شخصی اور ذاتی حقوق اور خواہشات سے ہے وہاں یہ معاملہ سہل ہے کہ جھگڑے سے بچنے کے لیے دوسرے کے واسطے اپنی جگہ چھوڑ دے، اپنے حق سے دست بردار ہوجائے اور جو شخص ایسا کرے دنیا میں بھی اس کی عزت کو چار چاند لگ جاتے ہیں اور جس مقصد کو چھوڑا ہے وہ دوسرے راستے سے حاصل ہوجاتا ہے اور آخرت میں تو اس کے لیے ایک عظیم الشان بشارت ہے، جس کا بدل پوری دنیا اور دنیا کی ساری حکومتیں اور ثروتیں بھی نہیں ہوسکتی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، "اَنَا زَعِیْمٌ بِبَیْتٍ فِیْ رَبَضِ الْجَنَّةِ لِمَنْ تَرَکَ الْمِرَاءَ وَهُوَ مُحِقٌّ"، (میں ضامن ہوں اس شخص کو وسطِ جنّت میں مکان دلانے کا جس نے حق پر ہونے کے باوجود جھگڑا چھوڑ دیا)۔

مَیں آخر میں پھر اپنے پہلے جملے کی طرف رجوع کرتا ہوں کہ ہماری ساری خرابیوں کی بنیاد قرآن کو چھوڑنا اور آپس میں لڑنا ہے اور یہ آپس کی لڑائیاں بھی درحقیقت قرآنی تعلیمات سے ناواقفیت یا غفلت ہی کا نتیجہ ہیں۔ گروہی تعصبات نے یہ حقائق نظروں سے اوجھل کر رکھے ہیں۔

دنیا میں صالحین کی اگرچہ قلت ضرور ہے، مگر وہ گم نہیں۔ افسوس ہے کہ ایسے صالحین کا سخت قحط ہے جو گرد و پیش کے چھوٹے چھوٹے دائروں سے ذرا سر نکال کر باہر دیکھیں اور کہ اسلام اور قرآن ان کو کس طرف بُلا رہا ہے اس کی صدا سُنیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین کے صحیح راستے پر چلنے کی توفیق کامل عطا فرمائیں۔ اَللّٰهُمَّ وَفِّقْنَا لِمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی مِنَ الْقَوْلِ وَالْفِعْلِ وَالْعَمَلِ وَالنِّیَّةِ. وَصَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِهٖ وَصَفْوَةِ رُسُلِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِیْن



ابوالاثر حفیظ جالندھری

حفیظ جالندھری

۱۴ جنوری ۱۹۰۰ شمسی

حضرت حفیظ جالندھری اردو کے بلند پایہ اور مقبول شاعر ہیں اور ان کی ادبی اور ملی خدمات نہایت قابلِ قدر ہیں۔ ان کی ہر دل عزیزی اور ان کے کلام کی مقبولیت کا اندازہ اِسی سے کیا جا سکتا ہے کہ ان کو فردوسیٔ اسلام، شاعرِ اسلام اور شاعرِ پاکستان کہا جاتا ہے۔

حفیظ صاحب ۱۴ جنوری ۱۹۰۰ شمسی کو جالندھر کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔ گھر کے مالی حالات ایسے نہ تھے کہ باقاعدہ تعلیم حاصل کرتے۔ ساتویں جماعت کے بعد اسکول کی صورت نہیں دیکھی اور فکرِ معاش میں مبتلا ہو گئے، لیکن طبیعت شروع ہی سے شاعرانہ پائی تھی، غمِ روزگار کے ساتھ ساتھ فکرِ سخن بھی شروع ہو گئی۔

اِک طرف فکرِ سخن تھی ، اک طرف فکرِ معاش

مولانا غلام قادر گرامی کے زیرِ سایہ ان کی علمی و فنی تربیت ہوئی اور ان کی نگرانی میں حفیظ صاحب کی شاعری کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ ۱۹۲۱ شمسی میں انھوں نے جالندھر سے ایک رسالہ "اعجاز" جاری کیا، جو چند ماہ سے زیادہ زندہ نہ رہ سکا۔ اس کے بعد وہ لاہور آ گئے اور مختلف رسالوں میں کام کر کے زندگی گزارتے رہے۔ ۱۹۱۷ شمسی میں پہلی شادی ہوئی۔ ۳۹ ش میں ایک انگریز خاتون سے دوسری اور ۱۹۵۵ ش میں تیسری شادی بیگم خورشید سے ہوئی۔ ۱۹۰۷ ش میں پہلا شعر کہا اور ۲۵ ش میں پہلا مجموعۂ کلام "نغمہ زار" شائع ہوا۔ ۲۸ ش میں شاہنامۂ اسلام کی جلد اور ۴۷ ش میں چوتھی اور آخری جلد شائع ہوئی۔

جناب حفیظ جالندھری ایک عظیم شاعر ہونے کے علاوہ ایک مشاق نثر نگار بھی ہیں۔ انھوں نے افسانے بھی لکھے اور بچوں کے لیے کہانیاں بھی۔ بچوں کے لیے ان کے گیت اور نظمیں تو بے حد مقبول ہیں۔ جنگ و آہنگ کے عنوان سے روزنامہ جنگ کراچی میں کچھ

عرصے تک ایک دل چسپ کالم بھی لکھتے رہے ہیں۔ حفیظ صاحب کی شاعری کی طرح ان کی نثر میں بھی تازگی اور توانائی ہوتی ہے اور میرے خیال میں یہ خصوصیات ان کے خلوص اور دلِ دردمند کی آئینہ دار ہیں۔ حفیظ صاحب کے کلام میں سادگی، سلاست، شوخی، شیرینی، شگفتگی، رَوانی اور رنگینی سبھی کچھ ہے۔ وہ اردو کی جدید شاعری کے معماروں میں سے ہیں۔

ایک انسان کی حیثیت سے بھی حفیظ صاحب بہت سی خوبیوں کے مالک ہیں، اُن کی شخصیت میں بڑی کشش اور بڑی لچک ہے۔ وہ بڑے اچھے دوست ہیں۔ ان کے مزاج میں سادگی اور مروّت ہے، لیکن وہ اتنے ہی صاف گو بھی ہیں اور کسی کو دھوکا نہیں دے سکتے۔ سادگی کے ساتھ کِفایت شعاری میں بھی طاق ہیں۔

جناب حفیظ جالندھری آج کل منظوم تاریخ پاکستان لکھ رہے ہیں، مجھے یقین ہے کہ شاہ نامۂ اسلام اور پاکستان کے قومی ترانہ کی طرح یہ بھی اِن کا ایک زندہ رہنے والا کارنامہ ہوگا۔

محمد سعید

ہمارے قومی اور اخلاقی کردار پر ہماری شاعری کا اثر

از جناب ابوالاثر حفیظ جالندھری

میری زندگی کے اس دَور میں لاہور کے احباب سے گفت وشنید کی جو عزت کسی نہ کسی بہانے مجھے مِلتی رہتی ہے، میں آپ سب سے محبّت کرنے والا اس کے سوا اور کیا کہوں گا کہ دوستو! اسے جاری رکھو کہ یہی صدقۂ جاریہ ہے۔

غنیمت جان لو مِل بیٹھنے کو
جُدائی کی گھڑی سر پہ کھڑی ہے

اِس مرتبہ میں ہمدرد کے فردِ وحید حکیم سعید اور ان کی فوجِ شفا موج کا شکر گزار ہوں۔ مجھے یہ دعوت ایک پیام رساں کی زبانی پنڈی میں ملی تھی تو میں نے اس اِنتخاب پر تعجب کیا تھا، کیوں کہ یہ دعوت جسٹس رحمان مدظلہ العالی کے ساتھ شام منانے کے بعد لا اینڈ آرڈر کی آنکھوں کے عین سامنے مرتبہ ومنصب کے قانون کی علانیہ خلاف ورزی ہے۔ حفیظؔ نہ قانون داں ہے، نہ قانوں گو، محض اُردو زبان کا پنجابی شاعر ہے۔ حفیظ نے پکڑے جانے کے قابل کوئی حرکت اُردو زبان کے معاملے میں بھی تو کبھی نہیں کی۔ لہٰذا یہ خیال آیا کہ یہ تو ہمدرد کی تشخیص وتفتیش ہے جو حکمت سے خالی نہیں ہوسکتی، لہٰذا ڈرنے کی فی الحال کوئی وجہ نہیں!

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مَیں نے زبانی سمن وصول ہوتے وقت شاعروں کی روایتی رسم کے مطابق لیت ولعل کی ادائیں نہیں دکھائیں۔ یہ دعوت حجّت کے بغیر قبول کرلی تھی۔ آپ سب شاہدانِ عادل ہیں۔ دیکھ لیجیے، لاہور ہی کے اندر حاضر ہوں صیغۂ غائب نہیں بن گیا۔

لاہور میرے لیے کیا ہے؟ شاید آج آپ اس کا اندازہ نہ کرسکیں۔ میں تو یہ جانتا ہوں کہ آپ جس

طرح خود لاہور میں رہنے پر مجبور ہیں۔ وہی طرزِ مجبوری مجھے لاہور سے دُور رکھتی چلی جا رہی ہے۔ میری جوانی اور ادھیڑ پن کے لاہور کی بات ہی کچھ اور تھی۔ وہ بات کیا تھی؟ وہ قلبی واردات کا معاملہ ہے! ورنہ بظاہر تو

وہی لاہور، ہے وہی در و بام وہی ہنگامۂ خواص و عوام
زلزلے، آگ، آندھیاں، سیلاب لائے تشریف، چل دیے ناکام
پھر ذرا سی شکست و ریخت کے بعد چل رہا ہے وہی قدیم نظام
ہاں ہماری ترقیٔ معکوس ہو گئی ہے بہت ہی تیز خرام
خامیاں پختہ ہوتی جاتی ہیں! دیرپا بنتے جاتے ہیں اسقام
گھٹ رہی ہے تسلّیٔ محکوم بڑھ رہی ہے تعلّیٔ حکّام
فرش کو عرش کی نہیں پروا پستیاں ہیں بہت بلند مقام

دیکھیے مَیں نثر سے نظم کی طرف ہجرت کر رہا ہوں۔ نظم میرے لیے آسان ہے، نثر مشکل! شاعر لوگ تن آسان ہوتے ہیں، اِس لیے پراگندہ مقالی کا قدم بھی ضبط کی طرف اٹھ جاتا ہے۔ معافی چاہتا ہوں اور اشارتاً اعتراف کیے لیتا ہوں کہ اردو "شعر بازی" کے جرم میں جالندھر سے نکال دیے جانے کے بعد لاہور ہی میری شعر سازی کی جولانی کا مرکز بنا رہا۔ انجمن حمایتِ اسلام کے جلسے میں چندہ جمع کراتے ہوئے میں نے ایک ٹیپ کے بند میں لاہور کے نقطے پر اپنی گردشِ پرکار کا اعتراف کیا تھا، یعنی جالندھری کہلائے جانے کے باوجود لاہوری ہو جانے کے بارے میں ایک شعر بھی تو کہا تھا:

جانے اِس خطۂ لاہور میں کیا خوبی ہے!
میری کشتی بھی تو راوی ہی میں آ ڈوبی ہے

لیکن راوی نے ابھی مجھے مزید مہلت دے رکھی ہے۔ اب واقعی جالندھری مہاجر ہونے کے بعد لاہور سے ایک مسلسل رَواں دَواں ہجرت ہے۔ لہٰذا آج کی دعوت قبول کرنے سے گریز اور شاعرانہ طرز کے لیت و لعل کرنے میں خطرہ تھا کہ مبادا شام جو آپ سخن فہم، سخن سنج دوستوں سے ملنے کا پیغام ہے، کسی اور مقام کی طرف ہجرت کر جائے۔ میرے لیے لاہور کے احباب سے ملاقات ع

کچھ بات ہی ایسی تھی کہ جھٹ مان گیا

مگر زبانی دعوت قبول کرتے وقت مطمئن تھا کہ میری یہ شام چند احباب اور قدر دانانِ زبان و بیان کو فقط شعر سُنانے تک ہی محدُود رہے گی۔ آپ کو بدستور محض شعر سے بُھاؤں گا اور یاد اللہ کہہ جاؤں گا۔ راولپنڈی پلٹ کر اتراؤں گا کہ ایک اور "کارے کردہ ام"

کوئی کچھ کہے، لاہور دوسرے مقامات کی نسبت آج بھی "کچھ اور" ہے۔ چند پُرانے اور چند در چند پرانے دوستوں کی جھلک لیے ہوئے نئے دوست مل ہی جاتے ہیں اور مَیں دل ہی دل میں کہہ اٹھتا ہوں کہ یا اللہ اگر مے کدۂ ہستی میں پھر ایک بار ؎

پُرانا دَور ہو جائے تو کیا ہو!
وہی لاہور ہو جائے تو کیا ہو!

اپنی روش پر راہ چلتا آپ لوگوں سے مل لیتا ہوں۔ آپ کے دلوں کا حال آپ جانیں، البتہ میں شکوہ سنج ہوں کہ ؎

مُلاقاتیں بھی ہوتی ہیں مُلاقاتوں کے بعد اکثر
وہ ہم کو بھول جاتے ہیں ہم ان کو یاد کرتے ہیں

خدارا مان "سکیے تو مان لیجیے کہ" ایک آہِ سرد ایک آہِ گرم" یہ ہے لاہور سے باہر میری زندگی۔! معلوم ہوتا ہے کہ لاہور میری صبح سے آنکھیں بند کر چکا ہے۔ اب یہاں میری "شامیں" منائی جا رہی ہیں، حالاں کہ میری شبِ حیات کی بھی صبح نمودار ہے۔

میری شاعری جلسوں، جلوسوں، مجلسوں اور مشاعروں سے گزری ہے۔ اب جب کہ وقتِ غروب قریب ہے، آج کی شام آپ کے حضور حاضر ہو جانے کے سلسلے میں مجھے ہمدرد سے اس حکمت کا گمان نہ تھا کہ شعر کے علاوہ بھی مجھے کچھ عرض کرنا ہوگا۔ شاید ساٹھ اور تین تریسٹھ برس کا نظر آنے کے باوجود اطبائے دہلی نے میرے نعرے ع

"ابھی تو میں جوان ہوں"

کی سُن گُن پالی ہے اور خدمتِ خلق کی دُھن میں مجھ سے بھری محفل کے اندر وہ نسخہ اگلوا لینا لازم جانا ہے، جس نے میرے جسم کو نحیف اور میری رُوح کو اب تک جوان رکھا ہے۔ ساتھ ہی مجھے بھی یہ لالچ تھا کہ "ذہنی جوانی" کی ہانک لگاتے چلے جانے کی وجہ سے جسمانی کھینچا تانی جو میرے نصیب میں ہے، اسے قائم و دائم رکھنے کا نسخہ بھی ہمدرد کے فہیم حکیم سعید سے معلوم کر لوں گا۔ اگر لاہور آکر بھی دہلی والے میرے دردمند بن جائیں تو شاید بہت سے مفرّحات اُردو شعر کے عوض مفت داشتن ہو جایا کریں گے، اِسی طرح جیسے دہلی میں رُونما ہوتے ہی مرحوم حکیم محمد احمد خاں اور حکیم بھُورے میاں (مرحوم) مجھے تفریح کے طور پر مفرّحات سے نواز دیا کرتے تھے۔ مفرّحات تو کیا بھُورے میاں کے ہاں سے تو مونگ کی بڑیاں بھی مجھے گھر بیٹھے لاہور میں اُن کی حیاتِ دُنیوی تک وصول ہوتی رہیں ؎

سال بھر سہہ کے بھوک کی کڑیاں   مجھ کو ملتی ہیں مونگ کی بڑیاں

آج کے بارے میں کہنا یہ تھا کہ شعر سُنانے کے لیے تو مَیں مستعد ہو گیا تھا، کیوں کہ اس سے "واہ واہ"

"سبحان اللہ"، کسی نہ کسی طرح ہتھیا ہی لیتا، مگر زبانی پیغام کے بعد جب تحریری دعوت نامہ ملا تو اس میں لکھا تھا کہ "ایک گراں قدر مقالے" سے بھی میں آپ کو لطف اندوز کروں گا۔
سچ کہتا ہوں، مجھے تو یہ ایک دھمکی سی نظر آئی۔ میرا دل بیٹھنے لگا۔ ہم شاعر لوگوں کا دل ذرا جلدی بیٹھ جاتا ہے لیکن ہم تعلّی کے ساتھ ذرا سی تسلّی دے کر اسے پھر اٹھا دیا کرتے ہیں۔ ہمدرد دواخانے والے لکھ لیں کہ یہ ہے میری جوانی کا راز۔ دیکھیے مَیں نے نسخہ آپ کو بتا دیا ہے۔ حکیم سعید چین سے واپس تشریف لے آئیں تو اُن کی خدمت میں میری طرف سے بطور نذرانہ پیش کریں۔ بس دُو مفردات تعلّی اور تسلّی —— !
خیر، مَیں نے اپنے دل کو سنبھالا اور خود بھی یہ سوچ کر سنبھالا لے لیا کہ گھڑ لُوں گا کوئی ایسا ویسا فسانہ افسانہ طرازی تو اَب عام ہے۔ ہر اَیرا غیرا افسانہ گھڑ لیتا ہے تو شاعر کے لیے کون سی بڑی بات ہے یا پھر دو چار لطیفوں میں آپ کو اُڑا دوں گا۔ کسی ترقی پسند سے اخبار میں بھی لکھوا دوں گا کہ ؎

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب

لیکن مشکل یہ آ گئی کہ میری شام منانے والوں کے نام ارسال فرمودہ دعوت ناموں کی ایک نقل بھی اس چٹھی کے ساتھ ہی چسپاں تھی۔ اس میں آپ کو "مژدہ" سُنا دیا گیا تھا کہ حفیظ جن "مقالے" سے آپ کو لطف اندوز کرنے والا ہے، اس کا عنوان ہے

"ہمارے قومی اور اخلاقی کردار پر ہماری شاعری کا اثر"

جلّ جلالہٗ ! یہ تو نفسیات کا اہم ترین مسئلہ ہے۔ اتنا اہم کہ اس پر تبصرہ اس ڈھلتی ہوئی شام کے مقام پر عیشِ دماغی کی تفریحی مجلسوں میں کیسے ممکن ہے ؟ اس موضوع پر تو سنجیدگی کے ساتھ بات چیت ہونی چاہیے۔ سب سے پہلے ہمارے قومی گھرانے کے ہر میاں بیوی یعنی "محترم غور صاحب" اور "محترمہ فکر" صاحبہ" تنہائی میں سر جوڑ کر بیٹھیں۔ اس کے بعد ان کے پڑوسی قلب و نظر ایک جگہ جمع ہوں اور غور و فکر کی اُلجھنیں سُلجھائیں، تاکہ قوم کے فرزندوں اور دُختروں کے کردار پر جو اثر ہماری شاعری کا موجود ہے یا جو آئندہ مطلوب ہے اس کا فیصلہ ہو جائے، کیوں کہ یہ فرزندان و دختران ہی تو اب قوم ہیں۔ کیا آپ دیکھ نہیں رہے ہیں کہ ہماری شاعری ان پر کس طرح اثر انداز ہے۔ کیا موجودہ کردار سے آپ کا پیٹ نہیں بھر گیا۔
آپ میرا مقالہ سننے کے لیے تشریف لائے ہیں تو لیجیے سنیے۔ مَیں نے ہر محفل میں آپ کو شعر ہی سُنائے ہیں اگرچہ میں اپنے اشعار میں مُبالغہ آرائی سے پرہیز ہی کرتا رہا ہوں، کیوں کہ میں اس کا اہل نہیں، لیکن شاعرانہ "جھوٹ مُوٹ" اور "سچ مچ" دونوں کے زیرِ اثر آپ شاعروں کو اگر دیوانہ نہیں سمجھتے تو فرزانہ بھی نہیں جانتے، تاہم مجھ پر کرم فرمائیے اور میری شاعرانہ زندگی میں پہلی مرتبہ مجھ سے

ایک عقل کی بات نثر کے لہجے ہی میں سُن لیجیے۔ بات کوئی اِتنی تلخ نہیں کہ آپ کو ناگوار گزرے!
یہ عقل کی بات محض "اِتنی سی ہے کہ مَیں تو محض شاعر ہوں اور اردو کا اہلِ زبان بھی نہیں۔ قومی کردار پر ہماری شاعری کے اثر کے پیچیدہ معاشری یا اخلاقی مسئلے کو مجھ ایسے شاعر سے طلب ہی نہ کریں تو بہتر ہے۔ ہماری شاعری تو ابھی تک زلفِ یار میں اُلجھی ہوئی ہے۔ وہ قومی کردار کے مسائل کو اور بھی اُلجھائے گی۔ میں شاعری اور اس کے تاثر کا نقاد کیسے بن سکتا ہوں۔ میں نے فرائڈ اور ژونگ وغیرہ کی "اینٹ ابجر" کتابیں رٹ کر نقادی کا ڈنکا بھی نہیں بجایا۔ دوسروں کا نام لے کر اپنی اُستادی کا سکہ بھی نہیں جمایا۔ اس قسم کی حرکات کو نقاد لوگ فلسفہ کہتے ہیں۔ میں فیلسوف نہیں ———!

شاعر جیسا کچھ بھی میں ہوں، ایک نظم میں (جو دورانِ سیاحتِ لندن مجھ پر وارد ہوئی تھی) فرائڈ اور ژونگ والوں کو میں نے بھری محفل میں بتا دیا تھا کہ ؎

شاعر ہوں مرا کام نہیں فلسفہ دانی کھلتی ہے مجھے ٹھوس نتائج کی گرانی
انسان کی تصویر نئی ہو کہ پرانی مطلوب مجھے حُسن ہوا اور حُسنِ معانی

اللہ کے بندوں سے مجھے بَیر نہیں ہے
یعنی مری دنیا میں کوئی غیر نہیں ہے

اب آپ ہی فرمائیے کہ شعر و شاعری کا اثر قوم اور قومی کردار پر دکھانے کے لیے ایک مقالہ آپ کے گوش گزار کرنے کی جسارت فرما کر اپنے "نقاد اُستادوں" سے مُفت کا بَیر کیوں خرید لوں؟ توبہ توبہ! اللہ نقادانِ فنِ شعر و ادب سے ہر شاعر کو اس کی زندگی میں تو محفوظ ہی رکھے۔ (آمین۔ ثم آمین)۔
ہماری شاعری کے قومی اور اخلاقی اقدار ہی کا مُعاملہ تو تھا کہ اکبر الہ آبادی اپنے وقت کے اُستاد نقادوں کی خدمت میں یہ شعر عرض کر کے اللہ کو پیارا ہو گیا تھا ؎

تم سے اُستادوں میں میری شاعری بے کار ہے
ساتھ سارنگی کا بُلبُل کے لیے دشوار ہے

البتہ اوپر جو مسدس کا سادہ سا بند میں نے پیش کیا ہے، اس کے پہلے دو مصرعے یعنی

شاعر ہوں مرا کام نہیں فلسفہ دانی
کھلتی ہے مجھے ٹھوس نتائج کی گرانی

ہی ہم شاعروں کے مزاج کی اُفتاد پر دال ہیں۔ شاعری کی بنیاد دراصل اگلے دو مصرعوں پر قائم تھی، یعنی "حُسنِ صورت" اور "حُسنِ معانی" اور یہی مشکل مسئلے ہیں۔ شاعر آسان پسند ہوتے ہیں۔ کردار کی بھونڈی سے بھونڈی صورت اگر کسی شاعر کو پسند آجائے یا کسی گھناؤنی اُپج کو

کو سمجھ لے تو وہ اُس کا نقیب بن کر اپنی شاعری کا ڈھنڈورا پیٹتا پھرتا ہے، کیوں کہ شاعر کے نزدیک

یہیں ختم ہے بحثِ معیارِ حُسن
جو دِل لے گیا دِل رُبا ہو گیا

لہٰذا تن درست و توانا حُسن، رُوح کو جلا دینے والے معانی کی حُسن کاری اور اس کے مقابل گھناؤنی اور سڑاند سے بھرپور تبلیغ بدکرداری دونوں ہماری قوم پر اثر انداز نظر آرہی ہے۔ سڑاند زیادہ ہے یا خوش بو؟ اس کا اندازہ آپ اس ہلچل سے کر سکتے ہیں، جو ہر گلی کوچے میں خراماں خراماں قوم کی لذت یا ذلت کا سامان پیدا اور ہویدا کرتی چلی جاتی ہے۔

اگر یہی بنیاد ایک مدّت سے ہماری شعر و شاعری رکھتی ہے اور ہمارے شعرائے باکمال نے انھی بنیادوں پر اپنے دیوان ہمارے قومی ایوان میں آہ و بکا یا واہ واہ کے لیے چھوڑ گئے ہوں تو میں ان بزرگوں کی رکھی ہوئی بنیادوں کو اکھاڑ پھینکنے کے لیے تو پیدا ہوا ہی نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ حالی، اکبر اور اقبال سے متاثر ہو کر مَیں نے خود بھی کچھ نئی بنیادیں رکھی ہیں۔ ان پر چھوٹی بڑی عمارتیں بھی کھڑی کی ہیں اور بھی چاہتا ہوں کہ سَو دُو سَو برس کے بعد مجھے بھی، مجھ پر بھی اعتراض کرنے والے بزرگ مان لیں تو کوئی حرج نہیں۔ شاید آنے والے دَور میں میاں غور صاحب اور بی فکر صاحبہ میرا تذکرہ بھی شاعری کے تاثرات کے بارے میں کیا کریں۔ اس ذکر سے مجھے وہ چیز حاصل ہونے کی توقع ہے جو مُردوں کو ثواب کے طور پر ہماری قوم پہنچاتی رہتی ہے۔ کیوں کہ مجھ ایسے نئی بنیادیں رکھنے والے شاعروں کے ؎

سخن کی قدر دانی زندگانی میں نہیں ہوتی
یہاں جب شمع بجھ لیتی ہے تب پروانہ آتا ہے

آج کے "مقالوی موضوع" کے بارے میں گزارش فقط یہ ہے کہ عربی کا ایک لفظ "شَعْر" شین بالفتح لیے ہوئے ہے۔ فتح ہمارے یہاں زَبَر کو کہتے ہیں۔ شَعْر کے معنی ہیں "بال"، خدا جانے کیوں شَعْر کو (جو شین بالکسر کے ساتھ ش۔ ع۔ ر سے متعلق ہے) "بال" سمجھنے لگے ہیں۔ زَبر زیر ہو کر رہ گئی اور شعر بے چارہ "بال" بن کر نقّادوں کے ہاتھ آگیا۔

مجھے یاد ہے، جب میں اسکول میں پڑھتا تھا، چھٹی جماعت کے مولوی صاحب نے ہمیں بتایا تھا کہ شعر بال کی مانند نفسیاتی باریکیوں کی مثال لچک دار اور ملائم ہونا چاہیے۔ اس بے چارے نے شِعْر کو بال نہیں کہا تھا لیکن شاید نقّادوں کے اُستادوں نے بھی مفہوم بتا رکھا ہو، کیوں کہ آج کل کی "کالجی نقّادی" بال کی کھال اتارنا ہی اُستادی اور سخن فہمی اور ادب کا فلسفہ بتاتی ہے اور مسلسل بتائے چلی جا رہی ہے کہ بال کی کھال اتارنے کے بعد جو نتیجہ سامنے آتا ہے، وہ بہت گراں قیمت ہوتا ہے۔ نقّاد اُستاد شعر و شاعری کے تاثرات کی پَروا نہیں کرتے۔ البتہ اتری ہوئی کھال کی

قیمت بڑھ کر موٹی موٹی کتابوں کی پکھالیں روز بروز جمع کی جا رہی ہیں۔ یہی موٹی موٹی کتابیں جن میں شعر کے مُنڈے ہوئے سروں کے بال گڈ مڈ ہوتے ہیں۔ اِنھی کا مطالعہ ادب کی عبادت قرار دیا جاتا ہے۔ انھیں کتابوں کے رنگ و رُوپ نے مجھے کبھی زمانے میں یہ کہنے پر مجبُور کر دیا تھا کہ ؎

نہ کر طوفاں زدوں کی شاعری پر تبصرہ پیارے
ترے تو پاؤں بھی نکلے نہیں دامانِ ساحل سے

بہر صورت بات مقالے کی ہے۔ مجھے خطرہ ہے کہ شاید ان ہی تاثرات کے تحت مجھے مدعو کرنے والے محترم ستم ظریفوں نے آج کی شام میرے مقالے کو "گراں قدر" بتایا ہے، بشرطیکہ میں مقالہ لکھ دُوں۔ لکھوں ہی نہیں بلکہ سُنا بھی دُوں!

مقالہ پڑھ کر سُنا دینا ــــــ واللہ داد دیتا ہوں۔ لینے کے دینے کے پڑ گئے ہیں۔ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ میرے پاس وصول شدہ داد کی "کھانچیاں" بھری رکھی ہیں۔ داد سے تنگ آکر مَیں نے یہ شعر بھی تو کہہ دیا تھا کہ ؎

مرے اشعار پر چُپ رہنے والے
ترے حِصّے میں آئی داد میری

الحمد للہ بات چُپ رہنے تک پہنچ گئی۔ تمہید اِتنی طولانی رام کہانی ؎

کہیں اُکتا نہ جائے دوستوں کی طبع فرزانہ

لیجیے قبول کیے لیتا ہوں کہ نظم چھوڑ کر مجھے نثر کی صورت میں بھی آج کچھ کہنا ہی پڑ گیا ہے، لیکن یاد رکھیے گا، جن معنوں میں آپ قال کو مقالہ کہتے ہیں، وہ یہ نہیں ہے۔ یہ تو قالِ حال ہے۔ اگر اسے مقال گردان لیں تو آپ جانیں۔ میں تو یہی کہوں گا کہ یہ حفیظ جالندھری کی گفتگو کا لہجہ ہے۔ حفیظ نے شعر و شاعری تو کی ہے۔ بُری یا بھلی کا فیصلہ مجھ پر واجب نہیں ہے۔ شاید آپ بھی فیصلہ کرنا پسند نہ کریں، کیوں کہ ایسا کرنا خطرے سے خالی نہیں۔ مَیں نے خود ہی تو کہا ہے ؎

یہ اَور دَور ہے اب اور کچھ نہ فرمائے
مگر حفیظ کو یہ بات کون سمجھائے

واللہ آج مجھے افسوس ہے کہ میں نے بال کی کھال کبھی نہیں کھینچی۔

شعر می گویم بہ از آبِ حیات
من نہ دانم فاعلاتن فاعلات

مقالے کی اصطلاح کے بارے میں یہاں اپنی برئیت کے لیے میں کسی کو الزام نہیں دوں گا۔ جُز ایں قدر کہ مقالہ از قسم مقالہ لکھنا کچھ پروفیسروں، عالموں اور فاضلوں ہی کا کام ہے، جس کو جب وہ پڑھ کر سُناتے ہیں تو اسی طرز کے پروفیسر، عالم اور فاضل سنتے سمجھتے بھی ہوں گے، اور چہ مگوئی بھی

فرماتے ہوں گے۔ خدا کی قسم مَیں نے کبھی بھول کر ایسی حرکت نہیں کی، البتہ ان ماہرین کے مقالے اُن ہی کی زبانِ مبارک سے سننے کے لیے بارہا پہنچ جانے کا الزام مجھ کو دیا جا سکتا ہے۔ مقالہ سننے کی وجہ میرے لیے یہ ہوا کرتی تھی کہ چوں کہ میں شاعری کے جنون میں ساتویں جماعت کا امتحان دیکر پاس ہو جانے کے خوف سے اپنا بستہ ایک تالاب میں ڈبو کر بھاگ نکلا تھا۔ نصابوں کی کتابوں سے سرمغزی خلجان تھی۔ میں نے اسکول سے نکل بہت کچھ پڑھ ڈالا۔ زیادہ تر کہانیاں، قصّے اور داغ و آمیر یا زند و مومن کے دیوان میرے مطالعے کے حصّے میں آئے اور مَیں نے بھی پہلے پہل غزل ہی کو تختۂ مشق بنایا۔ لیکن شعر و شاعری حالی، اکبر اور اقبال کے سبب قومی زندگی کے لیے اب واہی تباہی بکنے کا معاملہ نہیں رہا تھا، اِس لیے زبان و بیان ہی نہیں، مقصودِ حیات کے لیے منزل اور اس کی راہ جاننے پہچاننے کی ضرورت بھی محسُوس ہوئی۔ اب میرے سامنے اور میری آماجگاہ ماہرینِ علم و فن تھے، جو پھولوں اور پھلوں کا رس نچوڑ کر اپنے اندر ذخیرہ کر چکے تھے۔ میں نے سوچا کہ ان کی زبان اور ان کے بیان سے ایک آدھ گھونٹ اس رس کا شاید میرے بھی کام آئے۔ یقین فرمایئے اُن دنوں جہاں بھی مجھے پتا چلتا کہ خاص طور پر شعر و ادب اور مصوّری و موسیقی یعنی ہمہ قسم کے فنونِ لطیفہ پر مقالے کے سلسلے میں کچھ فرمایا جائے گا اور یہ ارشادات کتابی ماہرین کی تقریر و تحریر کا مجمُوعہ ہوں گے، میں بھی سَامعین کے "بیک بنچز" میں جا بیٹھتا، لیکن مجھے بسا اوقات یہ نظر آتا کہ شاعری پر مقالہ وہ عالم لوگ ارشاد فرما رہے ہیں جو نہ تو خود شاعر ہیں اور نہ شعر کو موزوں طریق سے پڑھ سکتے ہیں۔ مصوّری اور موسیقی پر رائے زنی وہ حضرات فرما رہے ہیں، جو نہ مصوّر ہیں نہ موسیقی داں محض "افسانوی رُستمانِ زماں" ہیں ؎

علمِ شے پر ہے جہلِ شے غالب
ہر اناڑی ہے اپنے فن کا امام

مَیں مدّتوں یہ مقالے سُنتا اور سَر دُھنتا رہا ہوں۔ اب بھی موقع ملے تو باز نہیں رہتا یعنی ان مقالوی مجلسوں میں اب بھی کبھی کبھار باریابی کا شرف مل ہی جاتا ہے۔ یہ ماہرینِ نقد و نظر اپنے مقالے مختلف قماش اور مذاق کے لوگوں کے سامنے پڑھ کر سُنانے کا شوق رکھتے ہیں۔ بسا اوقات میں بھی سَامعین میں بیٹھا نظر آیا کرتا ہوں۔ ان محفلوں میں میری خاموشی واقعی "معنی دارد" ہوتی ہے۔ یہاں بھی ایک شعر ہی سُنا دوں تو بہتر ہے، کیوں کہ یہی اصل موضوع ہے، یعنی شعر سے مزا آجاتا ہے مقالے کا یا لیسؔ و رطبِ شعر سبب قدرے قابل شنیدن بنا رہتا ہے۔ ایسی محفلوں میں خاموشی کا سبب میں نے اس شعر میں کہہ رکھا ہے ! ؎

مجلسِ وعظ میں خاموش جو دیکھا مجھ کو — چل دیا اُٹھ کے مری بات سمجھنے والا

مقالہ خوانی کی محفلوں میں اپنی قومی اُفتادِ طبع جو میں نے دیکھی ہے مجھے افسوس ہے کہ مَیں اس سلسلے میں آپ کی کچھ زیادہ مدد نہیں کر سکتا۔ میرا تجربہ کچھ حوصلہ افزا نہیں۔ مختصر یہ کہ واقعی مقالے میں مَیں کچھ سیکھنے جاتا ہوں، مگر میری اپنی بے مائگی الحمدللہ برقرار ہے۔ وہاں اکثر نظر آتا ہے کہ مقالے سننے والے چند افراد ہی اصلی معنوں میں کچھ جاننے کے شوقین ہوتے ہیں۔ باقی بُلائے ہوئے بھولے بھالے رونقِ محفل کے طور پر سامعین با تمکین کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ مشاعروں کی نسبت بہت قلیل التعداد یہ مجمع مقالہ خوانی کے ساتھ کوئی اور رخ لگانے ہی سے ہوتا ہے۔ پھر ہوتا یہ ہے کہ تھوڑی ہی دیر بعد ان میں سے بہت سے تو اُونگھتے پائے جاتے ہیں، اکثر جماہیاں لیتے ہیں، بعض کھانس کر فضا کو دِق آلود کرتے ہیں اور مقالہ نڈھال ہو کر رہ جاتا ہے۔ ایسی صورت میں اگر مجھ سے بہتر شاعر موجود ہو تو وہ، ورنہ مجھ بے چارے کو ماخوذ کر لیا جاتا ہے۔ میں تو بھلے مانسوں کی طرح مقالہ سننے اور اس میں سے بن بندھے موتی چُننے حاضر ہوا تھا۔ میری کمزوری یہ بھی تھی کہ دُوسروں کی طرح مجلس سے کِھسک بھی نہیں سکتا تھا۔ لہٰذا مجھے یا کسی اور شاعر کو موجودگی کا الزام جڑ کر پکڑ لیا جاتا ہے اور کسی صاحب کی مقالہ خوانی کے دوران ہی اعلان کر دیا جاتا ہے کہ "حضرت گھبرائیے نہیں، ذرا وہ حرکت جس کا نام "انتظار" ہے، فرمائیے۔ دیکھیے، فلاں صاحب تشریف رکھتے ہیں۔ کوئی اور نہیں تو حُسنِ اتفاق سے شاعرِ اسلام ابو الاثر حفیظ جالندھری بھی موجود ہیں۔ مقالے کے ختم ہونے پر وہ بھی اپنے کلام سے نوازیں گے — یہ سن کر میں تو دل ہی دل میں شہنشاہ ظفؔر دہلوی کا شعر پڑھنے لگتا ہوں ؎

ہم سے چوری کوئے زلفِ یار میں جاتے تھے یہ
حضرتِ دل اے ظفؔر اچھا ہوا پکڑے گئے

اِدھر انتظار کی یہ گت ہوتی ہے کہ شعر شاعری کے لیے گرم جوش ہو کر متوجّہ ہو جانے والوں کے سامنے کان دبائے یہ "انتظار" غراتا ہوا بھاگ جاتا ہے۔ اب صدرِ مجلس مقالے والے کے کان میں کچھ پھونک دیتے ہیں۔ مقالے کو مقطع پر لایا جاتا ہے۔ تالیاں بجتی ہیں۔ مجھ سے بہتر شاعر ہو تو وہ طمطراق سے، ورنہ چار و ناچار میں اٹھتا ہوں اور یادداشت کی گتھی سے جو کچھ ہاتھ آئے مقالوں کے بیچ کھیت شعر کی بھادوں برسانا شروع کر دیتا ہوں۔ بارہا تو ایسا گمان ہوتا ہے کہ یہ مقالہ خوانی لوگوں کو جمع کرنے کا بہانہ تھا۔ دراصل یہ بزم آرائی کسی شاعر کی ہی پذیرائی کے لیے تھی۔
آج کے موضوع کو اگر آپ بھول نہیں گئے تو ملاحظہ فرمائیے کہ مقالے کی مجلس میں شعر شاعری شروع ہوتے ہی اونگھنے والے بھی جاگ اٹھتے ہیں، جماہیاں بھی ہوا ہو جاتی ہیں اور وہ طالبانِ علم و فن جو کھانستے ہوئے مقالہ خوانی کے اثر سے دِق کے عارضے میں مبتلا ہونے کا بہانہ کر رہے

تھے، نعرۂ عاشقانہ لگانے لگتے ہیں، بلکہ وہ مقالہ فہم جو چپکے سے مجلس سے باہر نکل گئے تھے اور دوسروں کو بھی باہر آنے کے لیے اشاروں سے ورغلا رہے تھے وہ سب بھیڑ بھڑ کا بن کر پلٹ آتے ہیں اور شاعر پر واہ واہ یا آہ آہ کے اولے برسنے لگتے ہیں۔ یہ کیا صورتِ حال ہے؟ مقالے کے میدان میں شاعری کا چوگان۔ آخر یہ کیا بات ہے؟ ع

بات یہ ہے کہ بات کچھ بھی نہیں

مقالہ علمی معاملہ ہے لیکن شاعروں نے واہ واہ اور آہ آہ کی ایک ایسی فضا مدتوں سے قوم کے پڑھے لکھے ذہنوں کے لیے بھی قائم کر رکھی ہے کہ کسی سنجیدہ اور علمی موضوع پر کان دھرنا گویا جیتے جی مرنا بن چکا ہے۔ چوں کہ مقالے پر واہ واہ کا دستور نہیں ہے، سامعین کو چپ سادھنا پڑتی ہے، چپ رہنا حیوانِ ناطق کے شرف کو ضائع کرنے کی بات ہے، اس لیے اب جو شاعری شروع ہو گئی تو گویا چپ چاند سے چھٹی مل گئی۔ اب قوم کے اخلاقی کردار کی اصل صورت آئینہ ہوتی ہے۔ مکرر فرمائیے! سبحان اللہ! کیا مصرعہ کہہ دیا آپ نے! آپ ہی کا حصہ ہے! اس طرز کی تحسین سے ایوان گونج اٹھتا ہے۔ شاعر صاحبان یا میں اس داد سے جھولیاں بھر لیتے ہیں۔ دوسروں کا تذکرہ کیوں کروں، میں خود "ایک اور ایک اور" کے جوابِ باصواب سے تھک ہار کر آخر کار جھکتا ہوں، سلام کرتا ہوں، پھر رفوچکر ہو جاتا ہوں۔ سچ ہی تو کہا ہے ؎

اے حفیظ آہ آہ پر آخر !

کیا کہیں دوست واہ وا کے سوا

یہ جو کچھ میں نے عرض کیا ہے دوستو! عزیزو! بزرگو! خوردو! غالباً آپ نے اس امید میں سن لیا ہے کہ یہ شاید زیرِ موضوع مقالہ کی شگفتگی کے گرم مسالے کی تمہید ہے، مگر میں کہتا ہوں کہ جو کچھ مجھے آج کے موضوع پر کہنا تھا، کہہ چکا۔ آپ ہی سے پوچھتا ہوں کہ اگر مقالوں کی صورتِ حال یہی ہے تو خود ہی فرمائیے کہ آپ ابھی اور کیا چاہتے ہیں؟

جو کچھ میں کہہ چکا ہوں اگر اس میں نصف کے قریب بھی مبالغۂ شاعرانہ سے خالی ہے تو ہماری قومی اور اخلاقی زندگی پر ہماری شاعری کا بہت ہی برا اور بہت ہی بڑا اثر پڑا ہے ایسا ہی اثر ہمارا کردار بنا ہوا ہے۔ ہم کسی سنجیدہ بات پر غور کرنے اور اس کا فیصلہ فرمانے سے عاری ہو چکے ہوئے ہیں۔ کیا میری اس سادہ سی گزارش نے ہماری شاعری کے اثر کا ایک بہت ہی اہم گوشہ آپ کے سامنے بے نقاب نہیں کر دیا؟

ہم شاعر لوگ۔ ہماری بات صاحبانِ علم وفضل ذرا کم ہی مانا کرتے ہیں۔ خیر، مانیے یا نہ مانیے میں تو اپنے محدود علم اور غیر محدود یقین کی بنا پر کہتا ہوں کہ ہماری قوم کے ذہن اور کردار پر ہماری

شاعری نے ایک مدّت سے جو سکہ جما رکھا ہے، اس نے کثیر التعداد افراد، کروڑوں عوام النّاس اور لاکھوں "خواص النّاس" کے لیے سنجیدگی کے ساتھ غور و فکر سے کام لینے اور کسی قابلِ عمل فیصلے پر پہنچنے کی ذہنی راہیں قطعاً بند کر رکھی ہیں۔ وہ راہیں جن پر چل کر حوصلہ مند قومیں ترقیوں کے میدان میں آگے بڑھتی ہیں، بلندیوں پر چڑھتی ہیں اور سرفراز نظر آتی ہیں۔

شاید حکیم الامّت علامہ اقبال کی بات میری ہفوات سے زیادہ آپ کے لیے قابلِ قبول ہو۔ فرماتے ہیں ؎

جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں انھیں مذاقِ سخن نہیں ہے

یاد رکھیے کہ علامہ "مذاقِ سخن" کی مذمت نہیں کر رہے ہیں۔ مذاقِ سخن کسی قوم میں نہ ہونا کوئی اچھی بات بھی نہیں لیکن مذاقِ سخن کا ہے کے لیے؟ آگے بڑھنے کے لیے یا کسی مقام پر جم کر مٹّی کا ڈھیر ہو جانے کے لیے؟ مذاقِ سخن کے بارے میں ہم عام شاعر لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ ع

انساں نہیں ہے جس کو مذاقِ سخن نہیں

لیکن مذاقِ سخن خوش مذاقی بھی ہو سکتی ہے اور بد مذاقی بھی۔ دونوں اپنا اپنا اثر رکھتی ہیں۔ بد مذاقی بڑھائی جائے تو قوم بد مذاق یعنی بداخلاق ہو جائے گی۔ خوش مذاقی خوش کرداری کا نام ہے۔ اِس سے کام لیا جائے تو قوم اپنے کردار کی خوبیوں سے شہرۂ آفاق بن جائے گی۔

میں سمجھتا ہوں کہ علامہ کا مقصود اُن قوموں کی "بے مذاقی" ہے، جو محض "مادّی ترقی" کے درپے ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ وہ قومیں جو کچھ کام کرتی نظر آ رہی ہیں اور پاکیزہ مذاق نہیں رکھتیں، ان کا کردار نوعِ انسان کی تباہی کے سامان پیدا کر رہا ہے۔ اس کے مقابلے میں ہمارے یہاں سب لوگ، جس کو مذاقِ سخن سمجھتے ہیں اور جس سے ہمارے بہت سے شاعر کام لے چکے ہیں اور لے رہے ہیں، اسی ناقابلِ رشک اور بے پناہ مذاقِ سخن نے قوم کے ملّی مقاصد سے روگردانی کر رکھی ہے۔

اگر شاعر لوگ اپنے مذاقِ سخن کے حُسن و قبح کو ملحوظ رکھتے ہوئے مِلّت سے وابستگی قائم رکھتے تو ہماری قوم اس سے بہت فائدہ اٹھاتی۔ اپنے قدم ترقیٔ دارین کی راہوں پر آگے بڑھاتی، عین اسی طرح جیسے عربوں نے مذاقِ سخن کے ساتھ ساتھ ساری دنیائے انسانیت کی بھلائی ملحوظ رکھی تھی اور وہ کارنامے کر دکھائے تھے، جن کے لیے ہم ترس رہے ہیں۔

اب بھی اگر ہم شاعر لوگ سیدھی راہ پر آجائیں تو شاید بگڑی ہوئی سنور جائے۔ اس سے آگے کچھ اور کہنا اپنے شاعر بھائیوں کی طرف سے ملامت کا ہدف بننے کا سامان ہوگا۔ میرا ایمان یہ ہے کہ انسان کے وجود کے اندر خیال اور احساس کی صورت میں جو کچھ رکھ دیا گیا ہے، اس کے غلط استعمال سے شر اور صحیح استعمال سے خیر ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

کیا آپ سب اس بات کو نہیں جانتے کہ شاعر جذباتی ہوتا ہے اور شاعری جذبات ہی کے اظہار

کا نام ہے؟ جذبات کیا ہیں؟ اِنسانی مشین کے اندر پَیدا ہونے والی توانائی۔ اس کو خواہشات کی "بھاپ" بھی کہہ سکتے ہیں یا بجلی کی رَو کہہ لیجیے۔ اور بھی زیادہ ترقی پسندی منظور ہو تو ایٹم کی توانائی سے موسوم فرمائیے۔ بات ایک ہی ہے۔

جذبات کوئی بُری چیز نہیں ہیں۔ دنیا میں کوئی بھی چیز میرے اللہ نے بُری یا بُرائی کے لیے پَیدا نہیں فرمائی۔ جذبات بھاپ ہوں، بجلی ہوں یا ایٹمی توانائی، اُن سے کوئی مفید کام لینا ہی مقصُود ہے۔ کِسی مشین کو کسی رُخ پر چلانے کے لیے بھاپ، بجلی یا ایٹمی توانائی سے کام لینے سے پہلے منزلِ مقصُود کا تعین اور اس منزل تک پہنچنے کے بعد کے نتائج کو ملحوظ رکھا جانا ضروری ہے! اگر متعینہ منزل نہیں تو یہ کلین، یہ مشینیں، یہ موٹر کاریں، یہ انجن ایک دوسرے سے ٹکرا جائیں گے اور فسادِ عظیم پیدا کریں گے۔

اگر ہماری شاعری جذبات کی رَو سے بھری ہوئی کَل ہے، اگر کوئی ایٹم بم ہے تو اُسے کہاں، کیوں اور کس طرح اِستعمال کرنا چاہیے، یہ جان لینا شاعر کا فرض ہے، ورنہ بقول اکبرؔ ؎

رقیبوں نے بہت غزلیں پڑھیں اور دُرفشانی کی
مَیں اشک آنکھوں میں بھر لایا۔ بلاغت اس کو کہتے ہیں

اگر بھاپوں، بجلیوں اور توانائیوں کی طاقت سے انسان انسانوں کو تباہ کرنے ہی پر مستعد رہے تو آپ اس بھاپ، اِس توانائی، اس بجلی کو تو بُرا نہیں کہہ سکتے۔ آپ ان قوتوں کے بُرے استعمال کو بُرا کہیں گے، وہ اِستعمال جو کائنات میں شر اور فساد پیدا کرتا ہے، لیکن اگر ان ہی خداداد قوتوں کو انسان انسان کی بہتری کے لیے کام میں لائے، جس سے انسانی معاشرے میں طمانیت پَیدا ہو جائے تو یہی کارِ خیر ہے۔ اپنے پَیدا کردہ "شر" خدا کی عطا فرمودہ نعمت کے غلط استعمال کے نتائج ہیں اور صحیح استعمال سے خیر ہماری تدبیروں کی تقدیریں ہیں۔

آپ پوچھتے ہیں کہ ہمارے قومی اور اخلاقی کردار پر ہماری شاعری کا اثر کیا ہے؟ میرا جواب یہ ہے کہ ہمارے قومی معاشرے میں نعرے بازی کے طور پر جو کچھ ہو چکا ہے اور کچھ مدت سے ہو رہا ہے، یہ ہماری شاعری ہی تو ہے۔ ہماری بے شمار حرکات ہمارے شاعرانہ جذبات ہی کے زیرِ اثر ہیں اور اسی لیے ہماری قومی اور اخلاقی کردار" حرکاتِ مذبوحی" کے سوا اور کچھ نہیں ہیں۔ قوم پر شاعروں نے جذباتی نفسانی بھوت سوار کر رکھا ہے اور یہی ہمارا کردار بن گیا ہے۔ شاعروں کا طبقہ اپنی ڈفلی اپنا راگ الاپتا چلا جا رہا ہے۔ اپنے اپنے ماحول کے اندر ان ہی جذبات کو ترقی دیتا نظر آتا ہے، جس سے شاعر کو" واہ واہ" ملے۔ یہ" واہ واہ" تفریحِ طبع کے عوض ملتی ہے۔ بھانڈ مہنگے ہیں، شاعر سستے ہیں۔ آج شاعری کے مشاعرے بدنظمی کے لیے خواہشات کی جولانی

کے رستے ہیں، جس پر چل کر خود شاعر بھی اپنا جی بہلاتا ہے اور "منم منم" کہتا ہوا اِتراتا ہے۔ شاعر کون ہے ؟ قوم کا ایک فرد ہی تو ہے نا! قوم بھی کچھ قابلِ تحسین امور انجام دیے بغیر "منم منم" کہنا اپنے شاعروں ہی سے سیکھ چکی ہے!

لیکن سارا الزام شاعر ہی پر دھرنا مناسب نہیں۔ وہ تو خود معاشرے کا آئینہ ہے۔ شاعر اپنے ماحول کے بہت سے جذبات اخذ فرما کر اپنی ذات کے جذبات سے ہم آہنگ کر لیتا ہے، پھر اُسے بڑھاتا ہے، ترقی دیتا ہے، جسم بخشتا ہے، لباس الفاظ پہناتا ہے، اپنی تخلیق کے بتوں کو دیکھتا، دکھاتا ہے اور پھولا نہیں سماتا، لیکن کم جانتا ہے کہ ان رنگا رنگ کے جذبات کے ذخیرے کو استعمال میں لاتے ہوئے کہیں نفسیات کا شر تو تخلیق نہیں کر رہا۔ وہ ان جذبات کو اپنی اُپج کے لباس میں ایک مجسّم آواز بنا دیتا ہے۔ یہ آوازیں لاکھوں ہزاروں ہیں، کیوں کہ ہماری قوم میں لاکھوں ہزاروں شاعر ہیں۔ یہ مجسّم آوازیں کانوں یا آنکھوں کے ذریعے سے قوم کے اکثر افراد کے جذبات میں کہیں قدرے زیادہ اور کہیں قدرے کم ہیجان پیدا کرتی ہیں اور اس ہیجان کے طوفان کو بڑھاتی ہیں۔ قوم کے افراد میں جذبات تو یوں بھی جمع ہوتے ہی رہتے ہیں، لیکن وہ جذبات کی صورت گری کی صلاحیت نہیں رکھتے، لہٰذا شاعر کے الفاظ کو شاعر کے جذبات کے آئینے میں غیر شاعر لوگ اپنی ہی خواہشوں کی مَن موہنی صورتیں دیکھتے ہیں اور بقول غالبؔ کہنے لگتے ہیں کہ ؎

دیکھیے گفتار کی خوبی کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

تھوڑی دیر پہلے مَیں نے عرض کیا تھا نا کہ ہمارے قومی اور اخلاقی کردار پر ہماری شاعری کے اثر کا معاملہ بہت سنجیدگی کا ہے۔ میں اسے ہنس ہنس کر جو طفلانہ طرز سے بیان کر رہا ہوں اس سے مقصود صرف یہ ہے کہ میری آج کی شام آپ کو وہ نہ کر دے جسے میں نے ترقی پسندی یافتہ لوگوں کی زبان سے سُنا ہے۔ لفظ انگریزی کا ہے، اس کے اصل معنی نہ جانے کیا ہیں لیکن میں نے مقالہ سننے والے اچھے خاصے جوان جہان پڑھے لکھے لوگوں کے منھ سے سُنا ہے کہ "یار ہم تو بور ہو گئے"۔ "یہ بور" ہو جانا شاید کوئی اچھی بات نہیں، اس لیے مَیں نہیں چاہتا کہ محض میری گزارش کی شنوائی پر مجبور رہ کر مجھ سے رخصت ہوتے وقت اپنے لیے "بور" ہونے کا احساس یا اعلان فرماتے ہوئے جائیں۔ سنجیدہ اور قابلِ عمل باتوں سے آپ بور ہو جانے کے عادی تو بہر حال ہیں۔ آپ میں سے شاید کچھ ایسے بھی ہوں جو ممکن ہے اس تقریب کے صدر کی زبان سے میرے بارے میں فردوسِ اسلام سنتے ہی بور ہو گئے ہوں۔

اِس لیے آپ لوگوں میں سے وہ جن کو خطرہ نہ ہو کہ شاعر زدہ لوگ "واہ" کہیں گے یا آہ بھریں گے۔ وہ کسی اور مقام پر بیٹھ کر سوچیں، ایک دوسرے کی رائے کا جائزہ لیں، پھر کسی متفقہ فیصلے کا

اعلان کریں، تاکہ وہ مقتدر اصحاب جو قوم کے درد مند ہیں۔ ہم شاعر لوگوں کو بھی ذرا سمجھائیں کہ اپنی قوم کے نفسانی جذبات کے ساتھ کھیلنے کے بجائے کچھ بہتر طریقہ تخلیقِ شعر اختیار فرمائیں تو اُن کی شاعری واقعی بہتوں کا بھلا کرے گی! ساتھ ہی قوم کو بھی محض جذباتی طور پر رنگ رنگ کے جذبات سے متاثر ہونے کی خوش مذاقی سے منع یا متنبہ فرمائیں لیکن یہ ایسی آسان بات نہیں۔ کاش ہم میں مشکل کام سرانجام کرنے کی تمنّا پیدا ہو جائے۔

رہ گیا مَیں حفیظ جالندھری! میں آپ کی اس سلسلے میں کیا مدد کروں۔ مجھ پر جو اثر تھا میں نے کوشش کی کہ اس اثر کو حالی، اکبر، اقبال کے اثر میں رنگ دُوں۔ مَیں خود محض شاعر ہوں۔ ہر شاعر اپنے اپنے آپ کو آفتاب سمجھتا ہے اور چوں کہ ؎

سخن وَرانِ وطن سب ہیں آفتابِ کمال
تو کیوں کہوں کہ میں ذرہ ہوں آفتاب نہیں

لیکن شاعر ذرّہ ہو یا آفتاب، بہت متاثر کرنے والا وجود ہے۔ شاعروں کی خدمت میں آپ میں سے کوئی عرض کر سکتا ہو تو ان کو بتایئے کہ حضور والا! جذبات کی صورت گری سے بھانت بھانت کے صنم ہی صنم نہ تراشیں، جن کو دیکھ دیکھ کر قوم و ملت کے افراد ہر قدم پر ایک نئی گھڑنت کے آگے پجاری بن کر ماتھا ٹیکتے ٹیکتے اور آہیں بھرتے بھرتے راہوں میں لیٹ جائیں اور زمین و آسمان کے درمیان جان بحق نظر آئیں۔

ظاہر ہے کہ جدّ وجہد سے بچ کر لیٹ جانے اور سو کر خرّاٹے لینے میں بڑی راحت ملتی ہے۔ اس راحت کے بارے میں ایک شاعر ہی کا قول عرض کرتا ہوں ؎

بقدرِ یک سکوں راحت بود بنگر تفاوت را
دویدن، رفتن، اِستادن نشستن، خفتن و مُردن

قوم کو تفریح ہی تفریح کے طور پر سکون و راحت عطا فرماتے ہوئے ہماری شاعری کا اثر ساری قوم پر اب یہ ہے کہ ہماری قوم حد سے زیادہ راحت طلب بن چکی ہے۔ راحت اور سکون کے اصل معانی آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔

مَیں یہ سمجھتا ہوں کہ جب کسی مقصد کے لیے جدّ وجہد انسان کو دوڑاتی ہے تو دوڑنے والے کو اگر یک سکون راحت لینے کی بات سجھائی جائے تو دوڑنے کے بجائے آہستہ آہستہ چلنا شروع کر دیتا ہے۔ یہ آہستہ خرامی راحت نظر آتی ہے۔ پھر راحت کی طلب اور بڑھتی ہے جو چلتے چلتے ایک مقام پر ٹھیرا دیتی ہے۔ چلنے والے کھڑے ہو جاتے ہیں، کیوں کہ کھڑے ہوتے، ٹھیر جانے میں راحت ہے۔ کھڑے رہنے کے بعد بیٹھنا راحت ہے۔ بیٹھنے کے بعد موت —— راحت ہی راحت ——!

تمہ یعنی یہاں میرا مقالہ بھی ختم ہو گیا ہے۔ اگر ہماری شاعری ہمیں راحت کے یہ مراحل طے کرا چکی ہے تو اِنا للہ، ورنہ سنبھلیے!

ہماری قوم پر اور ہمارے کردار پر ہماری شاعری کا اثر ہے میں نے سرسری طور پر مقدمہ پیش کر دیا ہے، اس کا فیصلہ آپ کے ذمّے ہے۔ عدالت آپ ہیں۔ میں تو شاعر ہوں اور خوش ہوں کہ ؎

پَری رُخوں کی زباں سے کلام سُن کے مرا
بہت سے لوگ مری شکل دیکھنے آئے

شامِ ہمدرد۔ لاہور
۷۔ نومبر ۱۹۶۴ شمسی

اے۔ کے۔ بروہی

۱۹۱۵ شمسی

جناب اے۔ کے۔ بروہی صاحب کو پاکستان کے دانش وروں میں ایک نمایاں مقام حاصل ہے اور ایک ممتاز قانون داں کی حیثیت سے آپ ملک و بیرونِ ملک اپنی خداداد صلاحیتوں اور قانونی بصیرت کا لوہا منوا چکے ہیں۔
جناب بروہی صاحب ۱۹۱۵ شمسی میں گڑھی یاسین ضلع سکھر میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۷ش میں ڈی۔ جے۔ سندھ کالج سے درجۂ اوّل میں اعزاز کے ساتھ بی۔ اے پاس کیا اور پورے صوبۂ سندھ میں اوّل رہے۔ ۳۹ش میں ایم۔ اے اور ایل۔ ایل۔ بی کے امتحانات میں کامیابی حاصل کی۔ ۴۱ش میں وکالت کا آغاز کیا۔ ۵۱ش میں سندھ کے ایڈوکیٹ جنرل کے عہدے پر فائز کیے گئے۔ ۵۰ش میں اقوامِ متحدہ کی معاشی و سماجی کونسل میں پاکستانی وفد کے رکن کی حیثیت سے شرکت کی اور ۵۱ش میں (SANTIAGE) سنٹیج (چلی) میں اسی کونسل میں قائدِ وفد رہے۔ ۵۱-۱۹۵۳ش کے راولپنڈی سازش کے مقدمے میں حکومت کے خصوصی وکیل رہے۔ ۱۹۵۳ش میں مرکزی وزیر کی حیثیت سے حکومت میں شامل کیے گئے اور اکتوبر ۵۴ش تک وزیرِ قانون کی حیثیت سے ملک کی خدمت کرتے رہے۔ وہ ہندستان میں پاکستان کے سفیر بھی رہ چکے ہیں۔
جناب بروہی صاحب اعلا درجے کے قانون داں ہونے کے ساتھ ساتھ ایک صاحبِ نظر انسان ہیں۔ آپ کا مطالعہ نہایت وسیع ہے اور خیالات سلجھے ہوئے ہیں۔ جدید علوم و افکار پر ماہرانہ نظر کے باوجود آپ کا دل و دماغ مسلمان ہے۔ عہدِ جدید کی محیّر العقول مادّی

اور سائنسی ترقیوں اور فکری انقلاب کے باوصف جناب بروہی صاحب اسلام کی حقانیت اور اسلامی نظام کی افادیت پر یقین رکھتے ہیں اور آج کی بے چین دُنیا کے دکھوں کا مداوا اسلام کے متوازن اور فطری نظامِ زندگی میں پنہاں سمجھتے ہیں۔
بروہی صاحب ایک پائے کے مصنّف بھی ہیں اور قانون، فلسفہ، تاریخ اور مذہب کے موضوعات پر بہت سے فکر انگیز مقالات لکھ چکے ہیں۔ ان کے منتخب مضامین کا ایک مجموعہ بھی اشاعت پذیر ہو چکا ہے۔

محمد سعید

دَورِ حاضر
کی
رفتارِ تاریخ

از جناب اے۔ کے۔ بروہی، کراچی

دوستو! ـــــــ مجھ سے جس وقت آج کی تقریر کا عنوان دریافت کیا گیا تھا، اُس وقت مجھے اس کا بالکل خیال نہیں آیا کہ آپ کو بھیجے جانے والے رقعوں میں مجھے ایک قانون داں کی حیثیت سے متعارف کیا جائے گا۔ میرا تو بس یہی خیال تھا کہ قانون کے دائرے کے باہر، مجھے جس موضوع سے گہری دل چسپی ہے اس کے مختلف مسائل پر اپنے خیالات آپ کے سامنے پیش کر دُوں۔

لڑکپن ہی سے مجھے جس چیز نے مسحور کر رکھا ہے وہ انسانی تاریخ کے اسرار اور تاریخی واقعات و حوادث کی رفتار کے مختلف انداز اور ان کی باقاعدہ تکرار کی اہمیت ہے۔ مجھے اس بات کا پتہ چلا کہ تاریخ کی امواج میں جو مدّ و جزر ہوتا ہے اس میں موسیقی کی تال کی سی کیفیت ہے۔ یہ محسوس ہوتا ہے کہ مدّ و جزر کا یہ دَور کسی خاص قانونِ فطرت کے مطابق عمل پذیر ہوتا ہے۔ اس کی چال میں آوارگی نہیں ہے۔ لیکن یہ امور تحقیق طلب ہیں کہ اس کی تکرار میں جو تال کی سی کیفیت ہے، وہ کیا ہے۔ اس کی اس مستقل تکرار کی خصوصیت کیا ہے اور اس قانونِ فطرت کے کیا خواص ہیں جس کے مطابق تاریخی حوادث باقاعدہ تکرار کے ساتھ ظہور میں آتے رہتے ہیں۔ یہ وہ امور ہیں جن کا مکمل جواب اس دنیا کے رہنے والوں میں شاید ہی کوئی دے سکے۔ افسوس کہ مفکّر کی زندگی میں ایسے کتنے ہی

سوال درپیش ہوتے ہیں جن کا کوئی معقول جواب نہیں ملتا۔
اس وقت تو میں دورِ حاضر کی انسانی تاریخ کے ایک دو ہی پہلوؤں کو اپنے نقطۂ نظر سے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ممکن ہے کہ آخر میں انسانی تاریخ کی عام رفتار کی فلسفیانہ تحلیل پیش کرنے کا وقت بھی مل جائے۔
میرے خیال میں شاید وہ مشہور جرمن تصوری فلسفی ہیگل ہی ہے جس نے یہ کہا تھا کہ
—— تاریخ سے ہمیں یہی ایک سبق ملتا ہے کہ ہم تاریخ سے کچھ نہیں سیکھ سکتے
—— اور پھر دورِ حاضر کے ایک اطالوی فلسفی بینی ڈٹو کروچے نے تاریخ کی یہ تعریف کی ہے کہ تاریخ انسانی آزادی کی کہانی ہے —— اس فلسفی نے یہ محسوس کیا کہ تاریخ کے اس طویل دور میں رُوحِ انسانی کے نشوونما کی ایک شہادت مضمر ہے۔ گویا انسانیت کی رُوح اپنے آپے میں آرہی ہے۔ بہت سے تاریخ کے فلسفیوں نے اس موضوع پر بحث کی ہے کہ فطرتِ انسانی کے دیرپا اور مستقل عناصر ہی انسانی ترقی کے نغمے میں بلند آہنگ سُر رہے ہیں۔ اس کے برخلاف دوسرے مفکروں کی یہ رائے ہے کہ تاریخ میں اس قسم کی کسی چیز کا پتہ نہیں چلتا۔ تاریخ میں تو صرف اتنا ہی نظر آتا ہے کہ ایک اتفاقی حادثہ وارد ہوتا جاتا ہے۔ ان حادثات کو قانونِ اتفاقات اِس طرح رونما کرتا ہے کہ آئندہ کے متعلق کوئی پیش قیاسی کرنا ممکن ہی نہیں ہے، لیکن بعض اور مفکر ابتدا میں یقین ظاہر کرتے ہیں کہ انسانی تاریخ کی رفتار بالکل طے شدہ چیز ہے۔ ان کا یہ خیال ہے کہ ہم جو کچھ تاریخی ترقیاں دیکھ رہے ہیں، ان کو اسی طرح رُونما ہونا تھا۔ وہ تاریخی سلسلۂ علل کے اٹل ہونے کے عقیدے کی تائید کرتے ہیں۔ اس نقطے پر میں بعد میں تفصیلی نظر ڈالوں گا۔ مثال کے طور پر اتنا کہنا کافی ہوگا کہ اشتراکیت کے ماننے والے "تاریخ کی جبریت" کے فلسفے پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ انسان کا "انفرادی ارادہ" ان مادّی طاقتوں کی پیداوار ہے، جو اس کے ماحول پر عمل کر رہے ہیں اور یہ کہ "شعورِ انسانی" کوئی مستقل بالذّات چیز نہیں ہے۔ اس کے متعلق ان کا مفروضہ یہ ہے کہ وہ (یعنی شعورِ انسانی) بھی جدلیّت کی ایک پیداوار ہے، جو انسان کے مادّی ماحول میں کام کرتی نظر آتی ہے۔
ساری تاریخ اگر احتیاج کے اِسی آہنی قانون کے تابع ہے تو انسانی فرد کے کردار کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔ اگر انسانی تاریخ کی رفتار کو کسی ایسے اٹل قانون کے حوالے کر دیا جائے جو ایک طرح کی فولادی مضبوطی کے ساتھ اس پر پورا قابو رکھتا ہے تو پھر انسان

کا آزاد ارادہ کہاں باقی رہتا ہے ؟ کیا کسی بھی عہد کا کوئی آدمی اپنے آپ کو تاریخ کی جبرّیت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا کر اپنے آپ سے یہ کہہ سکتا ہے کہ میں تاریخ کی رفتار کو بدل نہیں سکتا، میری حیثیت تو طوفان میں ایک پتّے کی سی ہے۔ کیا واقعی انسان طوفان میں ایک پتّے کی طرح بے اختیار ہے؟ اس نقطۂ نظر سے کم از کم پتّے کے لیے تو طوفان ہی اقتدار رکھنے والی طاقت ہے۔ اس صورت میں کہ جب طوفان ہنگامہ برپا کر رہا ہو، پتّے کا کیا حشر ہوگا؟ اس کے معنی یہ ہوئے کہ انسان اگرچہ تاریخ کی رفتار پر اثر ڈالنے والا نظر آتا ہے، مگر درحقیقت کائنات کے اس وسیع سمندر میں اس کی حیثیت ایک حقیر بلبلے سے زیادہ نہیں۔ شاید آپ کو یاد ہو کہ ٹالسٹائی کا عظیم الشان ناول "جنگ وامن" اسی خیال پر ختم ہوتا ہے۔ جب ہم انسانی تاریخ کے معنی اور مقصد کو سمجھنے لگیں تو اس مسئلے کے تمام پہلوؤں کو حل کرنا ممکن نہیں ہے۔ ہم تو بس اتنا ہی کر سکتے ہیں کہ اس کے ایک یا دو پہلوؤں پر ہی اپنی پوری توجہ مرکوز کر دیں۔

اگر میں آپ کو تاریخِ جدید کا مطالعہ کرنے والا سمجھ کر آپ سے یہ سوال کروں کہ ہمارے موجودہ زمانے کی سب سے نمایاں اور فیصلہ کن خصوصیت کیا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو یہ جواب دینے میں کوئی تامل نہیں ہوگا کہ وہ مغربی استعماریت کے خلاف بغاوت ہے —— یہ ایسی بغاوت ہے جس کے اثرات تمام دنیا پر چھا گئے ہیں اور جس نے مغربی شہنشاہیت کو اتنا ہلا دیا ہے کہ وہ جڑ سے اکھڑ چکی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے زمانے کی یہ خلافِ استعماریت بغاوت کس طرح برپا ہوئی ؟ ہم دیکھتے ہیں کہ اس بغاوت کا آغاز ١٩١٠ء کے لگ بھگ ہوا، اور ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد اس کی رفتار میں بڑی سرعت پیدا ہو گئی، لیکن استعماریت کے خلاف یہ بغاوت پیدا کیوں کر ہوئی ؟ اس کو وجود میں لانے کے لیے کون سی طاقتیں کام کر رہی تھیں ؟ کیا یہ ایک آدمی کا کام ہے ؟ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ چین میں سن یات سن، ترکی میں اتاترک، ہندوستان میں گاندھی نہرو اور قائدِ اعظم اور دنیا کے دوسرے مقبوضہ ممالک میں اسی قسم کے افراد نے قابض شہنشاہیت پسندوں کے خلاف بغاوت کرنے میں اپنی اپنی قوموں کی قیادت کی۔ لیکن پھر بھی یہ سوال باقی رہتا ہے کہ کیا یہ افراد خود بخود ہی ان بغاوتوں کے اسباب بن گئے تھے یا وہ اپنے زمانے کے حالات کی پیداوار تھے کہ ان قوموں کے کروڑوں انسانوں کی تمناؤں کے مظہر بن جائیں ؟ بہرحال استعماریت کے خلاف بغاوت پیدا ہونے کے

اسباب خواہ کچھ ہی ہوں، اس سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تاریخ کی عام رفتار بڑی بڑی سلطنتوں کے ڈھا دینے کی جانب رہی ہے اور کسی نہ کسی طرح استعمار کا دور عملاً ختم ہو چکا ہے، جو پھر واپس نہیں آئے گا۔ انسان کا انسان پر استبداد جو شہنشاہیت کی طاقت کے بل بوتے پر تھا، ختم ہو چکا ہے۔ تاریک براعظم افریقہ بھی ترقی کی راہ پر چل پڑا ہے۔ براعظم ایشیا کی استعماری سلطنتوں کا خاتمہ ہو چکا ہے ——— یہ سارے واقعات عصرِ حاضر کے تاریخی واقعات ہیں۔ مغربی ملکوں کی استعماری لہریں جو ہر سمت پھیل چکی تھیں، اب اس تیزی سے واپس جانے میں مصروف ہیں کہ اگر ان ملکوں کے باشندوں کے سامنے یہ موضوع چھیڑا جائے تو اپنی شرمساری کا اظہار کرتے ہیں۔ اب تاریخ جدید نے ہر رنگ کی استعماریت کا مرثیہ پڑھ دیا ہے۔ بیسویں صدی کی سب سے ممتاز اور نمایاں خصوصیت یہی چیز ہے۔

کیا بیسویں صدی کے وسط میں ایک مرکزی مقام پر کھڑے ہو کر کوئی شخص تاریخ جدید کے اس منظر کو پیشِ نظر رکھ کر کوئی پیش قیاسی کر سکتا ہے کہ آئندہ پچاس سال میں تاریخِ انسانی کی ممتاز خصوصیت کیا رہے گی؟ کیا کوئی مورخ اس سوال کا کوئی جواب یقین کے ساتھ دے سکتا ہے؟ آپ کا کئی سال کی لمبی مدت تک انسانی تاریخ کی رفتار پر غور و فکر کرنے اور تاریخ نویس بننے سے کیا فائدہ اگر آپ ہمیں یہ نہ بتا سکیں کہ آپ کے خیال میں مستقبل قریب میں انسان کی تقدیر پر اثر ڈالنے والی ایسی کون سی اہم ترقیاں رونما ہونے والی ہیں؟

جب مشہور مورخ آرنلڈ ٹوئن بی سے ٹھیک یہی سوال کیا گیا تھا تو جواب دیا کہ اس کے اپنے خیال میں آئندہ پچاس سالہ رفتارِ تاریخ کی سب سے ممتاز سب سے اہم اور فیصلہ کن خصوصیت (اسی کے اپنے الفاظ میں) "جوابی اشعاع" ہوگی جس کو محکوم قومیں اپنے مغربی آقاؤں کی طرف مسترد کر دیں گی۔ بالفاظِ دیگر تاریخ کی وہ لہر جس نے نوعِ انسانی کے ایک تہائی حصے کو محکوم بنا رکھا تھا اور انھیں دو سو برس سے زیادہ مدت تک سیاسی غلامی کا شکار بنایا تھا، اب پلٹ گئی ہے اور وقت آنے پر ایک ردِ عمل پیدا کرے گی۔ وہ ردِ عمل جس طریقے سے واقع ہوگا، اس کو ٹوئن بی "جوابی اشعاع" کا نام دیتا ہے۔ یہ جوابی اشعاع سابقہ محکوم قوموں کی طرف سے یورپی معاشرے اور یورپی ثقافت کو ایک تحفہ ہوگا۔ جب یہ جوابی اشعاع اپنی پوری طاقت سے برسرِ عمل ہوگی تو ایک متحدہ نقطۂ نظر پیدا ہو جائے گا، جس کے بموجب انسان کی عالمی اقتدار کی جستجو ہی آئندہ تاریخ کا قانون بن جائے گی۔ ٹوئن بی کا خیال ہے کہ

وہ جوابی اشعاع انسانی تجربے کی اخلاقی اور رُوحانی شکلیں اختیار کرے گی جو جدید مغربی دُنیا کی مادّہ پرستانہ تہذیب کے لیے مسلسل قابلِ حصُول ہوگی ——— ظاہر ہے کہ جدید مغربی دنیا کی اصطلاح میں امریکا بھی داخل ہے۔ اس کے خیال میں اس جدلیت کی شہادت ظہور میں آچکی ہے۔ مثال کے طور پر، اشتراکیت کے وجود میں آنے ہی کو لیجیے، جو حقیقت میں ایک طرح کی مغربی بدعت ہے۔ اشتراکیت کوئی مشرقی پیداوار نہیں ہے۔ خواہ اس پر عمل کرنے والے سوویت روس میں ہوں یا جدید چین میں۔ لیکن ایک عقیدے اور فلسفے کی حیثیت سے اشتراکیت سُوویت روس یا جدید چین میں پیدا نہیں ہوئی اشتراکیت دساور کا فالتو مال ہے۔ یہ وہ ضرورت کا زائد مال ہے، جس کو مغرب نے ان ملکوں کو برآمد کیا ہے۔ بنیادی طور پر یہ ایک مغربی عقیدہ ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ اس کے موجد کارل مارکس اور اینگلز ہیں۔ یہی لوگ تاریخ کی مادّی تفسیر کے فلسفے کے معمار ہیں اشتراکیت کا دعویٰ کرنے والے ملکوں میں اِن کی تصنیفات آسمانی کتابوں کی طرح پڑھی جاتی ہیں۔ اب یہ بات اچھی طرح ظاہر ہو چکی ہے کہ مغربی ممالک کے لیے اشتراکیت غیر مغربی ممالک کا ایک مبارزت نامہ ہے۔ مشرق اور مغرب کے مابین جو مکالمہ ہے وہ درحقیقت تاریخی اشتراکیت اور آزاد دنیا کے فلسفے کے مابین ایک مکالمہ ہے ——— آزاد دنیا کا فلسفہ فرد کی قدر اور وقار کی اہمیت پر زور دیتا ہے لیکن اس کے مقابلے میں اشتراکیت کے فلسفے میں وحدتِ خیال کی عسکریت کے عقیدے ہیں۔ میں یہ نکتہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ اشتراکیت کو وہ ہتھیار سمجھنا چاہیے جس سے مشرق مغرب کا مقابلہ کرنا چاہتا ہے، لیکن یہ ہتھیار خود مغرب ہی کا تیار کردہ ہے۔ مغربی مفکروں نے اپنی فکر سے اس کو ڈھالا ہے۔ اس کا بنیادی عقیدہ اور عمل ایک بالکل جُداگانہ چیز ہے۔ اس نظریے کی پیدائش وسطی انیسویں صدی کے رھائین لینڈ کے قلب و رُوح کے اندر ہوئی۔ اس کے بعد یہ عقیدہ فرانس میں اور مشرقی یورپ میں پھیل گیا۔ اس کا اثر یورپ کے معاشری، سیاسی اداروں میں معاشرتی فلاح اور مزدور تحریکوں کی صورت میں ظاہر ہو رہا ہے۔ اسی طرح دُنیا کے بعض دوسرے حصّوں میں بھی اس نظریے کی متوازی ترقی جاری ہے۔ لینن اور اسٹالن نے اس نظریے کو جس خاص شکل میں مکمل کیا یا ماوزے تنگ نے حالیہ زمانے میں چین میں زرعی انقلاب برپا کرنے کے لیے اس کو جس طرح استعمال کیا ہر صورت میں یہ نظریہ وہ طاقت بن گیا ہے جس نے دنیا کے معاشرے میں مشرق اور مغرب کے مابین ایک خطرناک تنازعہ پیدا کر دیا ہے۔ یہ سب کچھ کیونکر ہوا؟ یہ سوال انسانی نشوونما کے ایک عجیب و غریب پہلو سے تعلق رکھتا ہے۔ اس

کے چند خاص واقعات کی طرف مَیں آپ کی توجّہ مبذول کرانا چاہتا ہوں:-

تاریخ کا یہ ایک قانون نظر آتا ہے کہ کسی قوم کی ثقافت کا علامتی کردار ہمیشہ ایک غیر منقسم وحدت ہوتا ہے۔ یہ ایسی چیز نہیں جس کو اجزا میں تقسیم کیا جا سکے۔ اگر کوئی خاص ثقافت انسانی ترقی کے مخصوص پہلو پیدا کرتی ہے اور وہ پہلو کسی دوسری ثقافت کی قوم کو پسند آتے ہیں اور وہ اپنی پسند کے ان ہی مخصوص پہلوؤں کو اختیار کرنا چاہتی ہے تو ثقافتی تصادم کے قانون کے بموجب اس قوم کو لازمی طور پر اس خاص ثقافت کے پورے ڈھانچے ہی کو قبول کرنا پڑے گا۔ یہ بات اس مقولے سے اچھی طرح واضح ہوتی ہے کہ ـــــــ یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ کتّے کو تو رکھنا چاہیں لیکن اس کی دُم کو نہ رکھیں۔ یہ مانا کہ کتّے کو پسند کرنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ آپ اس کی دُم کو بھی پسند کریں۔ دُم کو آپ کتنا ہی ناپسند کریں، لیکن آپ کتّے کو پاس بلائیں گے تو دُم بھی چلی آئے گی! کسی خاص ثقافت کے مختلف اجزا کا بھی یہی حال ہے۔ اس سے بعض خاص نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ آپ اس خاص ثقافت کے کسی خاص جزو کو قبول کر کے دوسرے اجزا کو مسترد نہیں کر سکتے۔ ٹوئن بی نے اپنی کتاب ــــــ "دنیا اور مغرب" (ورلڈ اینڈ دی ویسٹ) میں اسی اصول کا حوالہ دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ۱۸۳۹ کے لگ بھگ مصر کی اوّلین بحری فوج محمد علی پاشا نے تیار کی، جو اس زمانے میں مصر کے گورنر جنرل تھے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ اُس زمانے میں نپولین کی جنگوں کی یاد تازہ تھی اور ہر جگہ اس کو محسوس کیا جا رہا تھا کہ سمندر میں نپولین نے برطانیہ کی بحری طاقت سے شکست کھائی تھی۔ اس کے شکست کھانے کی وجہ یہ تھی کہ برطانیہ کی بحری طاقت فرانس کی طاقت سے بدرجہا بہتر تھی۔ غرض محمد علی پاشا نے بھی یہ اچھی طرح محسوس کر لیا تھا کہ مشرقِ وسطیٰ کی سیاسیات میں مصر اس وقت تک ایک طاقتور ملک نہیں بن سکتا جب تک کہ اس کی بحری فوج طاقتور نہ ہو۔ طاقتور بحریہ تعمیر کرنے کے لیے سائنسی معلومات اور ہنرمندانہ تکنیک لازمی چیزیں تھیں۔ لیکن مصر میں ان چیزوں کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اس لیے مصر کے لیے ایک طاقتور بحریہ کا تعمیر کرنا ناممکن تھا۔ محمّد علی پاشا نے اس شعبے کے غیر ملکی ماہرینِ فن کی خدمات حاصل کرنے کے لیے اِشتہار دیا۔ یہ اشتہار یورپ کے مختلف ملکوں میں شائع ہوا۔ اس پر فرانس، انگلستان، جرمنی اور دوسرے مغربی ممالک کے نوجوان انجنیروں نے درخواستیں بھیجیں۔ یہ لوگ انٹرویو کے لیے مصر بلائے گئے۔ انٹرویو میں ان امیدوار ماہرین نے اپنی ملازمت کے لیے یہ شرط پیش

کی کہ وہ اپنے گھر والوں کو اس وقت تک نہیں لاسکتے جب تک کہ علاج مُعالجے کے لیے اپنے ساتھ ڈاکٹروں کو بھی نہ لائیں، کیونکہ وہ اپنے بیوی بچّوں کو مصر کے مُعالجوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتے۔ محمد علی پاشا کو یہ شرط ماننے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔ غرض اس طرح یورپ کے ڈاکٹر بھی مصر آگئے اور ان سب کے لیے شہر اسکندریہ میں ان کی پہلی نو آبادی قائم ہوگئی۔ ان یورپی انجینیروں کی تعداد اتنی زیادہ نہیں تھی کہ ان کے بال بچّوں کے علاج مُعالجے میں ڈاکٹروں کا سارا وقت صرف ہوتا، اس لیے انھوں نے ۱۸۳۹ میں اسکندریہ میں پہلا بحری ہسپتال قائم کیا۔ یورپی ماہروں کے گھروں میں جو خانگی ملازم تھے انھوں نے عجیب تماشا دیکھا۔ جب کبھی کسی عورت کے وضع حمل کا وقت آتا تو اس کو اس ہسپتال میں مفت داخلہ مل جاتا اور وہاں یہ حیرت ناک بات مشاہدے میں آتی کہ اس عورت کی زچگی بلا کسی تکلیف کے نہایت آسانی سے ہوجاتی۔ یہ بات انیسویں صدی میں یورپ کی جدید طبّی تحقیقات اور نئی معلومات کی وجہ سے ممکن ہوگئی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ مصر کا اپنا ایک طبّی نظام موجود تھا، لیکن وہ نظامِ طب زچگیوں میں یہ حیرت ناک کارنامہ انجام نہیں دے سکتا تھا۔ غرض اس بات کی شہرت پھیلتی گئی۔ اور پھر ہر مصری کو اس یورپی زچگی خانے سے فائدہ اٹھانے کا شوق پیدا ہوا۔ مصر میں مغربی طب کی ایسی ساکھ قائم ہوگئی کہ خوش حال گھرانوں کے لوگ اپنے بچّوں کو مغربی طب کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے یورپ بھیجنے پر تیار ہوگئے۔ اس زمانے کی طرح طرح کی کہانیاں مشہور ہیں۔ محمّد علی پاشا کی ایک بیوی بیمار ہوئیں تو پردے کی سخت پابندی کی وجہ سے اس بیمار خاتون کو پردے میں چُھپا کر صرف اس کا ہاتھ پردے سے باہر نکالا گیا تھا، تاکہ ڈاکٹر نبض دیکھ سکے۔ اس کے علاوہ مصر کے بہت سے مال دار خاندانوں کی خواتین طرح طرح کے حیلوں بہانوں سے خفیہ طور پر "الگزانڈرین میٹرنٹی ہاسپٹل" میں وضع حمل کے لیے داخل ہوا کرتی تھیں۔ مصر کے جو طالبِ علم یورپ گئے وہ صرف طبّی ڈگریاں ہی نہیں بلکہ یورپی بیویاں بھی ساتھ لیتے آئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مشرق کے تمام ملکوں میں مغربی تہذیب کو قبول کرنے والا سب سے پہلا مُلک مصر تھا۔ مورّخین اس کا سبب محمّد علی پاشا کی اس معصوم خواہش کو قرار دیتے ہیں کہ وہ اپنے ملک میں ایک بحری فوج تیار کرنا چاہتا تھا۔ مذکورۂ بالا واقعہ میں نے ٹوئن بی کی کتاب کے ایک باب "سائی کالوجی آف اینکونٹرس" PSYCHOLOGY OF ENCOUNTERS سے نقل کیا ہے۔ اِس کہانی سے

مصنف نے جو اخلاقی نتیجہ اخذ کیا ہے، اس کو اُسی کے الفاظ میں پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے:

"اس کہانی سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ جب ثقافتوں کا تصادم ہوتا ہے تو کس تیزی کے ساتھ ایک چیز دوسری چیز کی طرف لے جاتی ہے اور یہ عمل کس طرح ایک انقلاب تک پہنچا سکتا ہے۔ یہ بات متعلقہ لوگوں کی چشم دید ہے کہ مسلمان خواتین روایتاً اپنے خاندان والوں کے سوا ہر شخص سے سخت پردہ کرتی تھیں۔ پردے کی سختی کا یہ حال تھا کہ اٹھارویں صدی میں سلطان ترکی کی محبوب ترین بیوی اتنی سخت بیمار پڑی کہ اس کی زندگی ہی خطرے میں پڑ گئی۔ اسلامی آداب صرف اس حد تک اجازت دیتے تھے کہ ایک مغربی ڈاکٹر اس خاتون کے بستر کے اطراف سختی کے ساتھ کھنچے ہوئے پردوں کے باہر صرف ہاتھ کی نبض دیکھ سکتا تھا۔ یہ انتہائی حد تھی جہاں تک کہ ایک مغربی ڈاکٹر ایک ایسی مریضہ تک پہنچ سکتا تھا جس کی جان ایک خود مختار سلطان کو نہایت عزیز تھی۔ اس زمانے میں سلطان کی ساری مطلق العنانی بھی اسلام کے روایتی آدابِ معاشرت کو توڑنے کی ہمت نہیں کر سکتی تھی، خواہ وہ ایک چہیتی بیگم کی زندگی اور موت ہی کا معاملہ کیوں نہ ہو اور اب انھی لوگوں کی زندگی میں جنھوں نے پردے کی اس قسم کی سختی کا مشاہدہ کیا تھا۔ مسلمان خواتین ایک غیر ملکی کارخانۂ اسلحہ سازی کی حدود میں ایک کافر مغربی ماہر امراضِ نسواں کی خدمات حاصل کرنے کے لیے بڑی دلیری کے ساتھ داخل ہوتی ہیں۔ مردوں اور عورتوں کے معاشرتی تعلقات کے سلسلے میں اسلام کے روایتی تصوراتِ عفت کی یہ شکست صرف اتنی سی بات کا نتیجہ ہے کہ مصر کے پاشا نے مغربی طرز کا ایک بحریہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ معاشرتی نتیجہ نہ تو پہلے سے سوچا بچارا گیا تھا اور نہ پہلی نظر میں اس کی طرف کوئی خیال ہی کیا جا سکتا تھا، لیکن ایک تکنیکی سبب نے انسان کی نصف مدتِ عمر سے بھی کم تر مدت کے

اندر یہ نتیجہ برآمد کیا۔"

اگر محمد علی پاشا کو بحریہ قائم کرنے کی خواہش نہ پیدا ہوتی تو مجھے یقین ہے کہ یہ "ناخوش گوار" نتائج جو اس معصوم خواہش کی تکمیل کے سلسلے میں پیدا ہوئے، ہرگز پیدا نہ ہوتے۔ہم اس کا اندازہ کرسکتے ہیں کہ مغربی ثقافت کا سارا نظام اور اس کی کرداری خصوصیات مصر کی سرزمین میں جڑ نہ پکڑ سکتیں۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی ثقافت کی کرداری خصوصیات خود بخود چلی آتی ہیں۔اسی قسم کے کسی مفروضے کی بنا پر ہم تاریخ میں ثقافتوں کے تصادم اور ان کی باہمی اثر پذیری کے قواعد کی تشریح کرسکتے ہیں، مثلاً اسی طرح روس کے شہنشاہ پیٹر اعظم کے زمانے میں روس نے مغربی ٹکنالوجی کو قبول کیا۔اس شہنشاہ کے پیشِ نظر مغربی ممالک کے فوجی خطرے کا موثر انداز میں مقابلہ کرنا تھا۔پیٹر اعظم نے یہ محسوس کیا کہ جنگ میں کامیابی اور فتح کا کچھ نہ کچھ تعلق فوجی طاقت سے ہے اور پھر یہ کہ فوجی طاقت کا کچھ نہ کچھ تعلق سائنسی اور تکنیکی معلومات سے ہے۔پیٹر اعظم نے اس کو اچھی طرح محسوس کرلیا کہ قومی ترقی میں سائنسی طرزِ حیات کی مدد کے متعلق خواہ کچھ ہی کہا جائے مگر یہ بات یقینی ہے کہ وہ ہماری صنعتی طاقت کو بہت بڑھا دیتی ہے اور کم از کم اس امر میں کوئی شبہ ہی نہیں ہے کہ جب تک ہمارا معاشرہ سائنسی اور صنعتی بنیادوں پر کھڑا نہیں ہوگا، اس وقت تک ہم ایسی طاقتور فوجیں تیار نہیں کرسکتے کہ وہ ہمارے دشمنوں کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرسکیں۔

میرا خیال ہے کہ اسی قسم کے خیالات پر اشتراکیت کا عقیدہ قائم ہے۔یہ عقیدہ جدید دنیا میں قومی اہمیت اور عظمت کے مسائل کو حل کرنے کے لیے سائنس سے کام لینے کی ضرورت پر زور دیتا ہے۔نظریۂ اشتراکیت قومی بنیادوں کو مضبوط بنانے کے لیے استعمال کیا جاتا رہا ہے۔آپ جانتے ہیں کہ کسی زمانے میں روس "مقدس روس" کہا جاتا تھا۔یورپ کے تمام ملکوں کو عیسائیت رومہ سے ملی تھی لیکن روس کی عیسائیت قسطنطنیہ سے درآمد کی گئی تھی، اس لیے روس پر یونانی آرتھوڈاکس چرچ کا اقتدار تھا۔اشتراکی انقلاب سے پہلے کا روس درحقیقت ایک توہم پرست روس تھا۔بہرحال یہ روس جو "مقدس" اور "توہم پرست" تھا، زندگی کا سائنسی نقطۂ نظر قبول کرنے کے بعد پچاس سال کے اندر اندر دنیا کی ایک عظیم طاقت بن گیا۔جب روس والوں کے سامنے رھائن لینڈ (جرمنی) سے درآمد کیا ہوا اشتراکیت کا عقیدہ پیش کیا گیا تو انھوں نے اس کو مغرب کا مقابلہ کرنے کا ایک

ہتھیار سمجھ کر قبول کر لیا اور اسی عقیدے کے تحت انھوں نے اپنے اجتماعی وجود کو منظم کرنا شروع کیا۔ میں نے یہ مثال تاریخ میں ثقافتوں کی باہمی اثر پذیری کو نمایاں کرنے کے لیے پیش کی ہے۔ اگر آپ زمین کی سطح پر رہ کر دیکھیں تو آپ کو وہ ثقافتی مکالمہ نظر آجائے گا جو تاریخ میں جاری ہے۔ لیکن اگر آپ کسی بلند سطح سے دیکھیں تو محسوس ہوگا کہ تاریخ ایک ایسی بلند عمارت ہے جس کی کئی منزلیں ہیں۔ اس صورت میں آپ تاریخی حادثات کو نہ صرف زمین کی سطح سے دیکھ سکتے ہیں، بلکہ آپ اس کی پہلی منزل کا حال بھی جان سکتے ہیں، مگر یہ ضرور ہوگا کہ بلند سطح سے دیکھنے پر بالکل دوسرا ہی منظر نظر آئے گا۔ اس کے متعلق اس بحث کو ختم کرنے سے پہلے چند خیالات پیش کرنا چاہتا ہوں:

سب سے پہلے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "اشتراکیت کے فلسفے" اور "مذہب کے فلسفے" میں بنیادی فرق کیا ہے۔ مذہبی فلسفے سے میرا مطلب زندگی کے متعلق مذہب کی بنیادی باتوں سے ہے، یعنی حضرت موسیٰ کی تعلیمات جو یہودی مذہب میں متشکل ہیں، یا حضرت عیسیٰ کی تعلیمات جو عیسائیت میں نمایاں ہیں، یا حضرت محمدؐ پیغمبرِ اسلام کی تعلیمات جو اسلام میں موجود ہیں۔ اگرچہ میں یہ مانتا ہوں ان مذاہب میں بہت سے اختلافات ہیں لیکن صرف اشتراکیت سے مقابلہ کرنے کے لیے ہم ان تینوں مذاہب کو ایک گروہ میں شامل کر سکتے ہیں، کیونکہ ان تینوں میں ایک بنیادی خصوصیت مشترک ہے اور وہی خصوصیت اشتراکیت میں موجود نہ ہونے کی وجہ سے بہت نمایاں ہے۔ میں یہ عرض کروں گا کہ اگر آپ ان تین مذہبی نظاموں کے مرکزی نقطے کو اپنے ذہن میں نہیں رکھیں گے تو جدید دنیا میں اس کی طاقتِ گیرائی کا اندازہ لگانے میں آسانی نہیں ہوگی۔ میرے خیال میں یہ کہنا بالکل حق بجانب ہوگا کہ ان تین ابراہیمی مذاہب کے بموجب انسانی تاریخ میں ایک ماورائے تاریخ حوالہ بھی موجود ہے۔ یہ وحدانیت پرست مذاہب خدائی طاقت کو تاریخ کا حقیقی قانون ساز گردانتے ہیں۔ اس سبب سے ان مذاہب کے نزدیک اسی خدائی طاقت کے سامنے انسان کو آخری جواب دہی کرنی ہے۔ یہ الٰہی طاقت اس اعتبار سے شخصی ہے کہ آپ اس سے ربط قائم کر سکتے ہیں۔ آپ معبد میں اس کی عبادت کر سکتے ہیں، اور چونکہ آپ اسی کے خلق کردہ ہیں اس لیے آپ اس کا قرب حاصل کر سکتے ہیں۔ تاریخ سے آپ کا تعلق اور آپ کی ذمے داری راست اور بنیادی نہیں ہے، بلکہ وہ ذمّے داری اس واقعے کے ساتھ منسلک ہے کہ خدائے تعالےٰ کا وجود جس کی تخلیق "زمان" کی تابع ہے، مقتدرِ اعلا ہے۔ اس نے اپنے قانون کے ذریعے سے اپنی مخلوق کو حکم دیا ہے کہ وہ دنیا میں سلطنتِ الٰہیہ

قائم کرے۔ بنی اسرائیل (جو حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں "خدا کی برگزیدہ قوم" تھے) یا عیسائی اور خود مسلمان بھی یہ یقینِ کلی رکھتے ہیں کہ حکمِ الٰہی کی متابعت میں انسان ہی کی کوششوں سے دنیا میں سلطنتِ الٰہیہ قائم ہوگی۔ وہ خدائی سلطنت "اسی دنیا" میں اور "اسی وقت" قائم ہونی ہے۔ بالفاظِ دیگر ان تینوں مذاہب میں وہ چیز مشترک ہے جس کو میں "ماورائے تاریخ حوالہ" کہتا ہوں۔ ان مذاہب کے الہامات ایک ایسے سرچشمے سے وصول ہوتے ہیں جو تاریخ کے پرے، اس سے ماورا ہے۔ اگر تاریخ ان قوتوں کا نتیجہ ہے، جن کو ہم دنیا میں عمل کرتے دیکھتے ہیں، تب ایک معنی میں وہ خدائی رہنمائی جس سے تاریخ کی حالت کو بدلا جا سکتا ہے بلکہ جس سے تاریخ بنائی جا سکتی ہے، ایک ایسے منبع سے حاصل ہوتی ہے جو تاریخ کے دائرے کے باہر یعنی اس سے ماورا ہے۔ اگر آپ اشتراکیت کو بغور ملاحظہ فرمائیں تو معلوم ہوگا کہ وہ ان تینوں مذاہب سے صرف ایک بنیادی خصوصیت میں مختلف ہے —— وہ اختلاف یہ ہے کہ وہ ایسے ماورائے تاریخ حوالے کی موجودگی کا انکار کرتی ہے۔ اس کے برخلاف وہ اس بات پر اعتقاد رکھتی ہے کہ انسان کا مقدر یہی ہے کہ وہ اس دنیا کی تکمیل کرے اور اس دنیا کو شریف انسانوں کے رہنے کے قابل جگہ بنا دے۔ انسان کے ذمّے اس دنیا کو ترقی دینا ہے۔ اس کی شکل بدلنا ہے۔ خدا کی اس بنجر زمین کو سرسبز بنانا ہے، لیکن اشتراکیت انسان کے اس فرض کے ادا کرنے کی تشریح میں ماورائے تاریخ محرک سے رجوع نہیں کرتی، بلکہ خود تاریخ کی قوتوں سے رجوع کرتی ہے۔ اشتراکیت کے ماننے والے تاریخ کے پرے نہیں جاتے۔ آپ جدید اشتراکیت کی تمام مستند کتابیں شروع سے آخر تک پڑھ جائیے لیکن ان میں آپ کو کہیں اس کا حوالہ نہیں ملے گا کہ دنیا میں انسان کی جدّوجہد کوئی علوی مطالب بھی رکھتی ہے۔ ان کا یہ اعتقاد ہے کہ تاریخ نے انسان کی تشکیل کی ہے۔ انسان کو تو بس تاریخ کی قربان گاہ ہی پر قربانیاں چڑھانی اور عبادت کرنی چاہیے۔ اشتراکیت کے لیے تاریخ کے باہر کوئی چیز نہیں ہے۔ تاریخ کے پرے کوئی جگہ ہی نہیں ہے، جہاں وہ جا سکے۔

آئیے اشتراکیت کے اس دعوے کا ذرا تفصیل کے ساتھ جائزہ لیں۔ مارکسی خیال کے مطابق تاریخ کی صرف مادّہ پرستانہ تعبیر ہی کی جا سکتی ہے۔ بالفاظِ دیگر تاریخ کی کش مکش کو صرف مادّہ اور اس کی حرکت کی اصطلاحوں ہی میں سمجھا جا سکتا ہے یا انھیں کے الفاظ میں، تاریخ خالص معاشی مقولوں سے رجوع کر کے ہی سمجھائی جا سکتی

ہے، مثلاً ریاست، عواملِ پیدا وار کی ملکیت اور پیداوار کی تقسیم کے طریقے
مادہ اور حرکت ہی تبدیلیوں کے اوزار ہیں جن سے تاریخی ترقیات کو سمجھایا جا سکتا ہے۔ حقیقت میں انسان آزادی کے ساتھ غور و فکر کر ہی نہیں سکتا —— حقیقت میں وہ جو کچھ غور و فکر کرتا ہے وہ تاریخ کے اس پہلو یا ماحول کا نتیجہ ہے، جس میں وہ رہتا سہتا ہے اور عمل کرتا ہے۔ وہ خود کچھ نہیں سوچتا بلکہ اس کے اندر تاریخ سوچتی ہے۔ وہ خود بھی مادّی طاقتوں کے کھیل کی ایک ذیلی پیداوار ہے۔ ایک باشعور ہستی ہونے کے لحاظ سے انسان کا کوئی وجود نہیں۔ وہ جو کچھ ہے وہ ایک "وسیع مرکب" ہے، جو رفتارِ تاریخ کی رَو میں محنت کشوں کی آمریت میں ظہور کر سکتا ہے۔ موجودہ معاشرے کو آخر کار ایک غیر طبقاتی معاشرے کی صورت میں ڈھل جانا ہے۔ یہ وہ صورتِ حال ہوگی جس میں اونچا نیچا کوئی طبقہ نہیں ہوگا، بلکہ صرف انسانی اخوّت ہوگی۔ لیکن اگر آپ مارکس یا اینگلز سے یہ سوال کریں کہ —— تاریخ کو میں کیوں بناؤں؟ تو آپ کو اس کا کوئی تشفی بخش جواب نہیں ملے گا، کیونکہ ان کے ہاں ایسی کوئی تشریح موجود نہیں ہے جو آپ کو تاریخ کے دائرے سے باہر لے جائے لیکن اگر آپ کسی عیسائی یا یہودی یا مسلمان سے یہ سوال کریں کہ وہ تاریخ کا مقصد پورا کرنے کے لیے اپنی جان کیوں ضائع کرتا ہے تو وہ یہ تشفی بخش جواب دے گا کہ یہاں جان دینے کے بعد وہ ایک دائمی حیات کا انعام پالے گا۔ ان مذاہب والوں کے پاس کسی ایسی آنے والی چیز کا حوالہ موجود ہے —— جو وقت و زمان کے پرے ہے، ابدی ہے، اور ہمیشہ قائم رہنے والی ہے۔ اس کے ہاں تاریخ سے پرے ایک محرک ہمیشہ سے موجود ہے لیکن اشتراکیت کے ماننے والوں کے ہاں ایسی کوئی تشریح موجود نہیں۔ اس امر کی ایک ٹھوس مثال یہ ہو سکتی ہے: فرض کیجیے کہ ۱۹۱۷ میں آپ نے لینن کو اس وقت جا پکڑا کہ جب وہ زارِ روس کے اقتدار کو ڈھا دینے کی سازش کر رہا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ وہ یہ چاہتا تھا کہ زارِ روس کے پہرہ داروں کو گرفتار کر کے زار کا اقتدار بہ جبر چھین لے۔ ایسے زمانے میں کہ جب وہ اس کوشش میں لگا ہوا تھا۔ آپ نے لینن سے کہا —— "دیکھو تمھارے پیغمبر کارل مارکس کے خیال کے مطابق جو مقصد تم حاصل کرنا چاہتے ہو وہ بہر صورت ناگزیر ہے۔ کیا دنیا ایک غیر طبقاتی معاشرے کی طرف کھنچی نہیں جا رہی ہے۔ سرمایہ داری کا خاتمہ ناگزیر ہے، کیونکہ کارل مارکس کی کتابِ مقدس کی رو سے اس کے اس انجام کے لیے تاریخ کی بنیادی طاقتیں اپنا عمل کر رہی ہیں —— یعنی قدرِ زائد (سرپلس ویلیو) کا نظریہ۔ دولت مند اور زیادہ

دولت مند بنتے جارہے ہیں۔ غریب اور زیادہ غریب ہوتے جارہے ہیں۔ یہ ناگزیر بات ہے کہ غریب طبقے متحد ہو کر بورژوا طبقے کے ہاتھوں سے اقتدار چھین ہی لیں گے۔ لینن صاحب! کارل مارکس کے نظریے کے مطابق آپ خود کچھ نہیں ہیں، آپ تو صرف ایک ذیلی پیداوار ہیں ——— آپ اپنی کچھ اصلیت سمجھتے ہیں، مگر آپ کی کوئی اصلیت ہی نہیں ہے، آپ جو کچھ ہیں صرف اس وجہ سے ہیں کہ تاریخی عناصر نے آپ کے نقطۂ نظر کی یہ شکل تیار کر دی ہے ——— اس لیے اگر آپ کا وجود نہ رہے تو آپ کی کوئی چیز بھی باقی نہ رہے گی۔ انقلاب ایک خود کار حادثہ ہے، وہ اپنی رفتار خود ہی جاری رکھے گا۔ اس لیے آپ کس لیے یہ زحمت کر رہے ہیں؟ فرض کیجیے کہ اگر زارِ روس کے پہرہ داروں نے آپ کو پکڑ لیا تو آپ کو گولی مار دیں گے اور آپ کے تمام عزیزوں کو ہلاک کر ڈالیں گے۔ ان سب باتوں کے علاوہ آپ اس چیز کو وجود میں لانے کی کوشش ہی کیوں کر رہے ہیں کہ جب وہ چیز خود بخود وجود میں آنے والی ہے، اس لیے کہ انسانی تاریخ کا پورا سفر ایک آہنی قانون کے تحت ہے اور وہ قانون مادّے اور اس کی حرکت کی جدلیت ہے۔ آپ پھانسی کے پھندے میں اپنی گردن کیوں پھنسا رہے ہیں؟"

لینن آپ کے ان سوالوں پر اپنے عمل کی کوئی معقول توجیہہ قطعی پیش نہیں کر سکے گا۔ لینن یا کوئی بھی اشتراکی جو تاریخ کی مادہ پرستانہ تعبیر پر اعتقاد رکھتا ہے، اس کی توجیہہ نہیں کر سکتا کہ وہ ایک غیر طبقاتی معاشرہ قائم کرنے کے لیے جو قربانیاں دے رہا ہے تو کیوں دے رہا ہے۔ اگر وہ جواب دے گا تو غالباً یہی جواب دے گا کہ اب دنیا کو بدل دینا میرا فرض ہے۔ اچھا ٹھیک ہے، لیکن اگر اس جواب پر یہ سوال کیا جائے کہ دنیا کو بدل دینا تم کیوں چاہتے ہو، دنیا کو بدل دینے والے تم کون ہوتے ہو؟ یہ سوال اس بنا پر کیا جا سکتا ہے کہ تاریخ کی مادہ پرستانہ تعبیر کے مطابق انسان کوئی چیز نہیں، جو کچھ ہے مادہ ہے اور تاریخ کا مقدر تو بہر صورت اسی صورتِ حال کی طرف حرکت کرنا ہے، جس کو تم وجود میں لانا چاہتے ہو ——— ان سوالات کا کوئی جواب ممکن نہیں ہے۔

اگر دنیا میں انسانی نسل کی تکمیل کا کام جو افراد کی قربانیوں کا طلب گار ہے، خود انسان ہی انجام دے، کیا اس صورت میں اس کو ان چیزوں سے جدا ہونا نہیں پڑے گا جن کو وہ عام طور پر عزیز رکھتا ہے؟ اشتراکیوں کے برخلاف ہم لوگوں کو جو الوہیت پر ایمان رکھتے ہیں، منشائے خداوندی کے مطابق تاریخ کی تعمیر کرنی ہے۔ یہ اِس لیے کہ آخر کار ہم سب کو اس کے سامنے جواب دہی کرنی ہے ——— ہمارے دلوں کے نہاں خانوں میں کوئی ایسی دائمی

چیز موجود ہے جس کو موت فنا نہیں کر سکتی۔
انسان کی یہی وہ کڑی ہے، جو اس کو الوہیت سے وابستہ کرتی ہے، جس کی تصدیق عالمی مذاہب نے کی ہے۔ یہی ہمیں منشائے خداوندی کا تابع بناتی ہے۔ یہ اطاعت ہم پر یہ فرض عائد کرتی ہے کہ تاریخ کی خاطر جامِ شہادت نوش کر لیں۔ صاحبِ ایمان ہونے کی حیثیت سے اگر ہم چاہیں تو اپنی جانیں دے سکتے ہیں، دنیا میں اپنی موجودہ حیثیت کو قربان کر سکتے ہیں تاکہ مستقبل میں رونما ہونے والے واقعات کا راستہ بہتر اور مفید تر ہو سکے۔ یہ خیالات ہمارے دل میں اس لیے پیدا ہوتے ہیں کہ مذہبی مفروضہ تاریخ کی جو تعبیر کرتا ہے وہ ہمیں تاریخ کے پرے لے جاتا ہے۔ اس لیے وہ تاریخ کی حدود سے آگے نہیں جا سکتے۔ بالفاظِ دیگر وہ لوگ جو اپنی دنیوی جدوجہد میں کوئی ماورائے تاریخ محرک نہیں رکھتے، وہ اس مخصوص سوال کی کوئی تشفی بخش توجیہہ نہیں پیش کر سکتے کہ ہم تاریخ کے حالیہ دَور میں کس غرض سے ایسی قربانیاں دیں جس سے ہمیں تو کوئی فائدہ نہ ہو لیکن آئندہ نسلوں کے مرد اور عورتیں اس کا لطف اٹھائیں۔
میرے خیال میں اشتراکیت اور مذہبی نظریہ حیات کے مابین یہی چیز خطِ فاصل ہے۔ مذہبی نظریۂ حیات انسانی فرد کے تقدّس و احترام پر زور دیتا ہے اور کہتا ہے کہ ایک خاص معنیٰ میں ہر فرد اپنی ایک انفرادیت رکھتا ہے، اس لیے وہ جواب دہ ہے۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ ایک فرد جو کام انجام دیتا ہے دوسرا فرد وہ کام انجام نہیں دے سکتا، اس لیے کہ اس کی انفرادیت کا تقاضا یہی ہے۔ مذہبی نظریۂ حیات یہ بھی تعلیم دیتا ہے کہ اس عالمِ اسباب میں بعض مقامات ایسے بھی ہیں جہاں فرد کا بدل نہیں مل سکتا۔ تاریخ کی مادّہ پرستانہ تعبیر کے ماننے والے ان باتوں کو قطعی قبول نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک تمام انسان قابلِ بدل ہیں۔ ایک انسان کی جگہ دوسرا انسان لے سکتا ہے۔ گویا یہ انسان نہ ہوئے فرنیچر ہوئے! جس طرح ایک میز کے بجائے دوسری میز یا ایک کرسی کے بجائے دوسری کرسی استعمال کی جا سکتی ہے۔ اس نقطۂ نظر کے مضمرات بہت دُور رس ہیں۔ فرض کیجیے کہ کسی اشتراکی ملک میں چور بازاری جاری ہے۔ اس ملک کا وزیر چور بازاری کرنے والوں کی تخویف کے لیے کوئی نظیر قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اس کو کوئی اخلاقی اصول مانع نہیں۔ وہ سات آٹھ بے گناہ آدمیوں کو گرفتار کر لیتا ہے اور ان کے خلاف جھوٹے الزامات کی تشہیر کر کے کہ وہ چور بازاری کے جرم میں پکڑے گئے ہیں، کھلے میدان میں انھیں گولی مار دیتا ہے۔ اس کارروائی پر اس کا ضمیر کوئی ملامت

نہیں کرتا۔ ہو سکتا ہے کہ لوگ ان مجرموں کو جانتے ہوں کہ انھوں نے کبھی چور بازاری نہیں کی، لیکن سزا دینے والا وزیر یہی کہے گا، "مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔ مجھے تو ایک وسیع مسئلے کو طے کرنا ہے۔ میں تو عوام کے ایک بہت بڑے طبقے کو تعلیم دینا چاہتا ہوں۔ انھیں تعلیم دینے کی یہی ایک صورت تھی کہ ان کے سامنے ایک عبرت ناک نظیر پیش کی جائے کہ چور بازاری کرنے والوں کو غیر معمولی سزا دی جائے گی"۔ اس مثال سے یہ بات واضح کرنا مقصود ہے کہ تاریخ کی مادّہ پرستانہ تعبیر فرد کی اس انفرادیت کو تسلیم نہیں کرتی، جس کی رُو سے وہ بے بدل قرار پاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہی وہ خطِ فاصل ہے جو زندگی کے مذہبی نقطۂ نظر رکھنے والوں کو ان لوگوں سے جُدا کر دیتا ہے جو زندگی کو مذہبی نقطۂ نظر سے نہیں دیکھتے۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ مذکورۂ بالا امتیاز اصولاً انسانی طرزِ عمل کے فلسفیانہ مضمرات ہی سے ممکن ہو سکتا ہے۔ دونوں فریق دنیا کو سرسبز بنانا چاہتے ہیں۔ اشتراکی عقیدہ والے بھی یہی چاہتے ہیں کہ یہ دُنیا لہلہاتا باغ بن جائے۔ وہ چاہتے ہیں کہ خاکی زمین کو ہرا بھرا بنادیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اس دُنیا کے وسائل سے ٹھیک طور پر کام لیا جائے اور معاشرتی انصاف کے اصولوں پر ان سے سب کو فائدہ اٹھانے کا موقع دیا جائے۔ زندگی کا مذہبی نقطۂ نظر بھی انھیں مقاصد پر اصرار کرتا ہے۔ لیکن یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اشتراکیت کے ماننے والے اس نظام نامے پر کیوں اصرار کرتے ہیں اور انھیں مقاصد پر مذہب کے ماننے والے بھی کیوں اصرار کرتے ہیں۔ اس "کیوں" کے سوال ہی پر دونوں کا شدید اختلاف ہے۔

بطور جملہ معترضہ مجھے یہاں دو باتیں بیان کرنی ہیں تاکہ کوئی غلط فہمی نہ پیدا ہو: یورپ میں اشتراکیت کا ظہور مذہبی طرزِ زندگی کی رسُوماتی اور نمائشی تعبیر کے ردِّ عمل کے طور پر ہوا۔ اس دَور کے عیسائی پادریوں کا گروہ اپنے آپ کو عوام الناس کی روحوں کا تنہا اجارہ دار سمجھنے لگا تھا۔ مذہب گویا ایک قسم کی بس سروس سمجھا جانے لگا تھا، جس میں لوگوں کی روحوں کو بٹھا کر جنّت تک پہنچایا جاتا ہو۔ اِس بس کے چلانے والے پیٹ بھرے تنومند پادری تھے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ساری کارروائی اس مقصد سے کی جاتی تھی کہ ایسی صورتِ حال پیدا کر دی جائے جس میں زندگی کی تمام نعمتیں پادریوں کی جیبوں میں داخل ہوتی جائیں۔ برنرڈ شا نے کسی قدر طنز کے ساتھ پادری کے متعلق یہ کہا ہے ——— "اوہو، یہ وہی آدمی ہے، جو ہمیشہ آسمان پر پوریاں دکھاتا ہے اور جب تم سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھنے میں مصروف ہو جاتے ہو تو وہ تمھاری جیبیں کترنے لگتا ہے، اِس لیے کہ اس وقت تمھاری توجہ اپنی جیب سے ہٹی رہتی ہے" ———

انیسویں صدی کے درمیانی زمانے کے انسان کو اس تاریخی صورتِ حال کی پیدا کردہ گرجائیت، کا سامنا تھا اور اشتراکیت اس کا جواب تھی۔ یہ سچ ہے کہ اشتراکیت کا استعمال معاشرتی انصاف کے مطالبے کے پس منظر ہی میں سمجھا جا سکتا ہے۔ اس میں مجھے مطلق شبہ نہیں ہے کہ کارل مارکس مذہب کے علم بَرداروں کے ہتھکنڈے دیکھ کر اپنے دل کی گہرائیوں میں کڑھتا رہا ہوگا۔ اس نے کئی مرتبہ مذہب کو عوام النّاس کی افیون قرار دیا ہے۔ مذہب انسانوں کی تباہ حالت کو بدل کر بہتر بنانے کے لیے استعمال نہیں کیا جا رہا تھا بلکہ اس سے لوگوں کے دلوں کو تسلی دینے کا کام لیا جا رہا تھا۔ مسکین اور روندے ہوئے انسانوں سے کہا جاتا تھا کہ وہ اپنے دکھ درد کو کچھ اور بَرداشت کر لیں، کیونکہ جلد اور بہت جلد آسمانی سلطنت قائم ہونے والی ہے جس میں ان کے لیے اعلا مقامات محفوظ ہیں۔ تاریخی اعتبار سے اشتراکیت کی کامیابی اس دُنیا سے بڑی مناسبت رکھتی، جس میں اس نے اپنے عمل کا آغاز کیا۔ اگر آپ اس قسم کی دُنیا کی تحلیل کریں، جس میں کارل مارکس نے زندگی بسر کی تو آپ کو تعجب ہوگا کہ اس کے زمانے کے پادریوں کے گروہ نے مذہب کو کس حد تک ذلیل کر دیا تھا۔ اس وقت صرف یہی ایک صورت تھی کہ مذہبی مفروضات کو یکسر رد کر دیا جائے، کیونکہ اگر آپ نے ایک مرتبہ ان مذہبی مفروضات کو قبول کر لیا جو گرجاؤں میں پیش کیے جاتے تھے تو پادری فوراً ہی لوگوں کی رُوحوں کے مسلّمہ محافظ بن جاتے تھے۔ اس کے لیے صرف یہی ایک عملِ جراحی تھا کہ خود مذہبی مفروضات ہی سے انکار کر دیا جائے اور انسان کی پوری توجّہ کو دُنیوی امور کی طرف مرکوز کر دیا جائے۔

میرے خیال میں اسی قسم کی ایک چیز ہندستان میں بھی واقع ہو چکی ہے۔ میں مہاتما بدھ کو ہندستان کی قدیم تاریخ میں ایک طرح کا کارل مارکس یا ایک قسم کا مارٹن لوتھر سمجھتا ہوں۔ مہاتما بدھ نے بھی اپنے زمانے کے پجاریوں کی رسومات اور ظاہرداریوں کے اعمال کے خلاف احتجاج کیا تھا۔ اس نے بھی ہمارے مسلّمہ انداز کے مذہبی مفروضے کو ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ مہاتما بدھ نے فرد کی اصلیت سے بھی انکار کر دیا تھا۔ اس نے خدا کے وجود سے بھی انکار کیا تھا۔ اس کو صرف اس کی فکر تھی کہ انسان کی زندگی کا نچوڑ صرف دکھ درد ہے۔ اس نے اِن دکھوں سے نجات حاصل کرنے کا طریقہ دریافت کیا کہ دُنیا کو ترک کر دیا جائے۔ اس پر اعتراض کرنے کے لیے اس زمانے کے پجاریوں کا بھیجا ہوا ایک شخص آیا اور حسبِ معمول الٰہیاتی سوالات کرنے لگا ——— کیا آپ خدا کے وجود کو مانتے ہیں؟ کیا آپ یہ جانتے ہیں کہ دُنیا کب سے شروع ہوئی؟ کیا آپ جانتے ہیں کہ یہ کبھی

نہ کبھی ختم ہو جائے گی؟"

ان تمام سوالوں کے جواب میں بُدھ نے کہا"میں ان سوالوں کے جواب دینے کا دعوا نہیں کرتا۔ میں یہاں بے معنی الٰہیاتی سوالوں کا جواب دینے نہیں آیا ہوں۔ میں تو یہ دیکھتا ہوں کہ تم دکھوں کے پہیے کے نیچے آگئے ہو، میرے پاس تمھارا علاج موجود ہے۔ تم ایسے طبیب کو کیا کہو گے جس کے پاس ایک ایسا آدمی لایا گیا جس کی پیٹھ میں ایک تیر دھنسا ہوا تھا جس کی وجہ سے وہ سخت درد میں مبتلا تھا۔ طبیب نے اس کی پیٹھ سے تیر نکالنے کے بجائے اس سے یہ سوالات کرنے شروع کیے ــــ "یہ تیر تم کو کس نے مارا؟ یہ تمھاری پیٹھ میں کتنا گہرا اتر گیا ہے؟ کیا اس سے تمھیں سخت درد ہو رہا ہے؟ فرض کرو کہ وہ طبیب اس قسم کے فلسفیانہ سوالات کرنے لگے تو تم اس طبیب کے متعلق کیا رائے قائم کرو گے؟ میں ایک طبیب ہوں، ایسے سوالات کا جواب نہیں دیتا۔ میں صرف تمھیں دکھوں سے نجات دینے کے لیے یہاں آیا ہوں۔" بُدھ کا اپنے زمانے کے خلاف جو ردِ عمل نظر آتا ہے وہی ردِ عمل مجھے ایک دوسرے انداز میں انیسویں صدی کے نصف آخر میں بھی نظر آتا ہے۔

اس نقطۂ نظر کی تاریخی بنیاد کیا ہے؟ اس کا مستقبل کیا ہے؟ اس کی رفتار کس قسم کی ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ مادّے کی آخری فتح جو اشتراکیت کا مطمحِ نظر ہے، اس حد تک پہنچ جائے گی جس سے آگے بڑھنے کی گنجائش ہی نہیں رہے گی۔ وہاں پہنچ کر انسان کو یہ سوال کیے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ ــــ "یہ سب کچھ کس لیے؟" یہ فرض کر کے کہ ہم سب کے کھانے کے لیے کافی غذا ہو، پہننے کے لیے کپڑے ہوں، رہنے کے لیے آرام دہ مکانات ہوں اور اگر آپ چاہیں تو بڑی بڑی امریکی کاریں بھی ہوں ــــ ہر ایک کے ہاں ٹیلے فون ہو، ٹیلے وژن ہو، غرض جدید تہذیب سے آپ کو جو کچھ مادّی آرام مل سکتے ہوں، وہ سب موجود ہوں ــــ یہ بھی فرض کرتے ہوئے کہ ہر پاکستانی بلکہ ایشیا میں رہنے والے ہر ایشیائی اور افریقہ میں رہنے والے ہر حبشی کو اتنا تموّل حاصل ہو، جس سے وہ اپنی پسند کی غذا، اپنی پسند کے کپڑے وغیرہ خرید سکتا ہو ــــ تب میں سمجھتا ہوں کہ نوعِ انسان اپنی ان تمام جسمانی خواہشوں کی تکمیل کے بعد اپنے آپ سے یہ کہے گی کہ آخر کار انسانی تاریخ میں انسان کے سنہری دور کا آغاز ہو ہی گیا۔ آپ یہ سوچیں گے کہ جب یہ ساری باتیں تکمیل پا چکیں گی تو انسان کے وجود کا مسئلہ ہی خاتمے پر پہنچ جائے گا۔ کیا آپ یہ خیال کرتے ہیں کہ انسان کو اپنی تکمیل کا احساس ہو جائے گا اور وہ اپنے آپ کو ایسی حالت میں پائے گا جس میں وہ اپنے آپ سے

کہہ سکے گا کہ میری تمام صلاحیتیں اور اندرونی امکانات پھول پھل چکے ہیں اور اب ایک طرح کی پُرمسرت زندگی مل چکی ہے، جس کا میں ہمیشہ لطف اٹھاتا رہوں گا؟

یہ تمام باتیں مجھے ان کوہ پیماؤں کی یاد دلاتی ہیں جو بلند پہاڑوں پر چڑھنے کی مہم سر کرتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ وہ "کے۔ ٹو" کی چوٹی پر چڑھنے کے لیے جس کی بلندی سطح بحر سے اٹھائیس ہزار فیٹ بیان کی جاتی ہے، سوئزرلینڈ سے پاکستان آتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ پہاڑوں پر چڑھنا آسان کام نہیں ہے۔ کوہ پیما لوگ پہاڑ پر چڑھنے کے لیے ٹیمیں بناتے ہیں۔ وہ سائنسی آلات کی خرید پر اور سفر پر اپنا سارا روپیہ صَرف کر دیتے ہیں، اپنے وصیّت نامے لکھ دیتے ہیں اور اپنے عزیز اقربا کو ہمیشہ کے لیے خدا حافظ کہہ دیتے ہیں، کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ شاید زندہ نہ رہ سکیں۔ کوہ پیمائی حقیقت میں ایک خطرناک مہم ہے۔ اگر ایک قدم بھی غلط پڑ گیا تو آدمی تحت الثریٰ کو پہنچ جائے۔ غرض اس طرح وہ یہاں آتے ہیں اور تمام مصائب کو برداشت کر لینے کے بعد اگر ان میں سے کوئی شخص پہاڑ کی چوٹی تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تب وہ کیا کرتا ہے؟ کیا وہ وہاں قیام کرتا ہے؟ کیا وہ کہتا ہے کہ "یہاں میں ایک مکان بناؤں گا؟" کیا وہ یہ کہتا ہے کہ "میں اس خاص جگہ مستقل سکونت اختیار کروں گا، کیونکہ یہاں کوئی شخص میرے اس حق پر اعتراض نہیں کر سکتا۔ میں جب تک چاہوں یہاں ٹھیر سکتا ہوں؟" کیا وہ واقعی وہاں رہنے کے لیے کوئی دم ٹھیرتا بھی ہے؟ نہیں، وہ وہاں صرف اپنے ملک کا جھنڈا گاڑ دیتا ہے اور جھنڈا گاڑتے ہی اسی لمحہ واپس ہوتا ہے، کیوں کہ اس کا امکان ہے کہ موسمی حالات یک دم بدل جائیں اور اس کا واپس آنا خطرناک بن جائے، بلکہ واپس ہی نہ ہو سکے۔ ایک طرف تو اس کی دیوانہ وار خواہش کا یہ حال ہے کہ اپنا سب کچھ برباد کر کے اپنی جان تک کو خطرے میں ڈال دیتا ہے۔ وہ یہاں صرف اس مقصد سے آیا تھا کہ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ جائے، لیکن جب وہ واقعی اس چوٹی پر جا پہنچتا ہے تو دیکھتا ہے کہ اس کے پھیپھڑے وہاں کی ہوا میں سانس لینے کے قابل نہیں ہیں۔ وہاں حرارت کے حالات ایسے نہیں ہیں جو اس کی زندگی کے لیے سازگار ہوں۔ ان امور کی وجہ سے اس کا پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ جانا اس کی زندگی کے لیے ایک خطرہ بن جاتا ہے۔ اس کے بدن میں خون کے دوران کی حالت معمول کے مطابق نہیں رہتی، کیوں کہ وہ ایسی ہلکی ہَوا کی فضا میں پہنچ گیا ہے جہاں اوکسیجن کا کافی مقدار میں ملنا ممکن نہیں۔

میری گزارش یہ ہے کہ تمام مادّہ پرستانہ فلسفوں کی عملاً ایسی ہی حالت ہے۔ اس دنیا میں ہمیں زندگی کی بہت سی نعمتیں حاصل ہیں لیکن پھر بھی ہم ملول، بیزار اور غم زدہ ہیں۔ اِس عہد میں اس

قدیم مقولے کا مطلب اچھی طرح سمجھ میں آتا ہے کہ ـــــ "انسان صرف روٹی ہی سے زندہ نہیں رہتا"۔ یہ یاد رہے کہ اس مادّہ پرستانہ تہذیب میں مَیں صرف اشتراکیت ہی کو نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ممالکِ متحدہ امریکا کی سرمایہ داری کو بھی شامل کرتا ہوں، کیونکہ یہ ملک بھی اسی مادّہ پرستانہ تہذیب کا عَلَم بَردار ہے۔ جب آپ ان کے اخبار یا رسالے پڑھتے ہیں یا ان سے گفتگو کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی آخری منزلِ مقصود بھی لوگوں کا معیارِ زندگی بلند کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں ـــــ یعنی کئی کئی موٹر کاریں اور ٹیلی وژن سَیٹ رکھنا، زندگی کی اچھی اچھی چیزیں حاصل کرنا یا اس پُرانے مقولے کے مطابق "مزے کرنا" ہے۔ وہ اس سے بلند تر کوئی چیز نہیں سمجھتے۔ اشتراکیت اور نام نہاد "آزاد دُنیا" کا حقیقی فرق بنیادی معنوں میں صرف مادّہ پرستانہ منازل کی طرف ان دونوں کی دوڑ کی رفتار میں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اشتراکیت مادّہ پرستانہ مقاصد کی طرف کسی قدر سرعت کے ساتھ قدم بڑھا رہی ہے اور اشتراکیت کے ماننے والے اپنے مقاصد کے بیان کرنے میں کسی قدر زیادہ صاف گو ہیں۔ اس کے برخلاف ان مقاصد کی طرف "آزاد دنیا" والوں کا اقدام ایک لحاظ سے پُر فریب ہے، کیوں کہ ایک طرف تو وہ فرد کی انفرادیت کی تصدیق کرتے ہیں کہ وہ احکامِ خداوندی کے مطابق ہے۔ وہ مذہبی طرزِ حیات پر عقیدہ رکھتے ہیں۔ وہ خاندان کے تقدّس کو مانتے ہیں لیکن جب امتحان کا وقت آتا ہے تو ہم جانتے ہیں کہ وہ کدھر جائیں گے۔ وہ ٹھیک اسی سَمت میں جاتے ہیں جس طرف اشتراکی جا رہے ہیں۔ اِس لیے اس بحث کی حد تک اشتراکی اور سرمایہ دار میں کوئی فرق نہیں۔ میرے ذہن میں تو یہ لوگ یا تو طاقت کے دیوتا ڈالر کا تعاقب کر رہے ہیں یا کامیابی کی اس دیوی کا جس کی مورتی کتیا کی شکل کی ہے۔

ان لوگوں کے متعلق میرا خیال ہے کہ جب وہ اپنے آخری منزلِ مقصود پر پہنچ جائیں گے تب وہی ناگزیر سوال کریں گے ـــــ "اب کیا؟" "یہاں سے ہم کہاں جائیں؟" موجودہ دُنیا میں کیا آجکل یہ بات واقعی ظہور میں نہیں آ رہی ہے؟ دنیا کے ان تمام ملکوں میں جہاں کا معیارِ زندگی سب سے بلند ہو چکا ہے، ایک نیا دیو منہ چھُپائے گشت کر رہا ہے۔ اس دیو کا نام ہے "اکتاہٹ"۔ یورپ کا ہر وہ شخص جو دولت مند ہے اور زندگی کی عمدہ چیزوں سے جی بھر کر لطف اٹھا چکا ہے، اب "اکتاہٹ" کا مریض ہو چکا ہے۔ ایسے لوگ درحقیقت یہ نہیں جانتے کہ اپنے آپ کو کیا کریں۔ یورپ کے ملک سویڈن کا معیارِ زندگی سب ملکوں سے بلند

ہے اور سویڈن ہی میں خودکشیوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے!

میں چاہتا ہوں کہ آپ ان دونوں چیزوں کے تعلق پر غور کریں۔ انسان کے اندر کوئی ایسی چیز بھی موجود ہے جو اس کی حیاتیاتی خواہشوں کے پرے اور ان کی پہنچ کے باہر ہے۔ بہ حیاتیاتی ضروریات جو بھوک اور جنسی خواہش کی صورت میں نمودار ہوتی ہیں وہ صرف اس کی زندگی کی دہلیز ہیں۔ اُس کی زندگی اس دہلیز کو پار کرنے کے بعد شروع ہوتی ہے۔ خبر نہیں جدید دنیا کے انسان کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ مادّی چیزوں کے تعاقب ہی کو اپنے وجود کا آغاز اور انجام سمجھتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کی شخصی ترقی، اس کے پھیلاؤ اور پھولنے پھلنے کے تمام خفیہ امکانات کا دروازہ اس کے لیے بند ہو چکا ہے۔

ایک لحاظ سے مشرقی انسانوں کی نام نہاد رُوحانی پروازیں اور "فقیر" کا منفی طرزِ حیات جو ترکِ دنیا کا اعتقاد رکھتا ہے، یہ بھی غلط ہے کیونکہ تم کس چیز کو ترک کر سکتے ہو؟ خدا ہر جگہ موجود ہے: تم کسی چیز کو جائز طور پر کس طرح ترک کر سکتے ہو، جب کہ خدا ہر جگہ موجود ہے۔ خدا جس طرح آسمان پر ہے، زمین پر بھی ہے۔ خدا طلوعِ آفتاب میں ہے، خدا غروبِ آفتاب میں ہے، وہ انسانی تعلقات میں بھی ایسا ہی ہے جیسا کہ انسانی مصیبتوں میں نظر آتا ہے۔ ہمیں دنیا کو تسلیم ہی کرنا پڑے گا، لیکن یہ دوسرے عالم کی باتیں جو قدیم زمانے کے ایک خاص قسم کے مذہبی فلسفے نے مستقل طور پر وارد کی ہیں، ایسی ہیں جن سے ایک خاص صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے۔ اس صورتِ حال سے آدمی کو گزرنا پڑا ہے۔ زندگی کی مادّی چیزوں کو حاصل کرنے کے لیے یورپ کو وہ راستہ اختیار کرنا پڑا جس پر وہ اب چل رہا ہے۔ مجھے اس میں ذرّہ برابر شک نہیں ہے کہ زندگی کی مادّی اشیا پر فتوحات حاصل کرنے میں اشتراکیت یورپی کردار کے تیر کا پیکان بن چکی ہے۔

رُوحانی طرزِ حیات پر حقیقی طور پر سب سے اوّل ایمان لانے والے وہ لوگ ہوں گے جو مادّی ترقی کی چوٹی پر پہنچ کر یہ دیکھیں گے کہ وہاں وہ ٹھیر نہیں سکتے، تب وہ دوسرے امکانات کی تلاش شروع کریں گے۔ روحانیت کی نئی دنیا ایسی صورتِ حال کا انتظار کر رہی ہے۔

اب میں آخری دو ایک نکتے پیش کر کے اس عام بحث کو ختم کرنا چاہتا ہوں تاکہ آپ پر وہ بات واضح ہو جائے جس کو بیان کرنے کی میں نے کوشش کی ہے۔ انسان دو ہی وضع کے ہیں: ایک وہ گروہ جو بنیادی طور پر خدا کا اعتقاد رکھتا ہے اور دوسرا وہ گروہ جو خدا کے وجود کو نہیں مانتا۔ یہاں میں اعتقاد کا صرف زبانی اظہار کرنے والوں کو شامل نہیں کر رہا

ہوں۔ میں ان لوگوں کا بھی ذکر نہیں کر رہا ہوں جو طوطے کی طرح کلمہ پڑھتے رہتے ہیں۔ میں ایمان کے متعلق لفظی گفتگو اور اس کے زبانی اقرار کا بھی ذکر نہیں کر رہا ہوں، بلکہ میرا مطلب ان لوگوں سے ہے جو سچائی اور خلوص کے ساتھ دل سے خدا پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ غرض دنیا میں دو ہی قسم کے لوگ ہیں: ایک وہ جو خدا کو مانتے ہیں اور دوسرے وہ جو خدا کو نہیں مانتے۔

وہ لوگ جن کا خدا پر اعتقاد ہے، اِس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ زندگی کی موجودہ شکل کو رفعت اختیار کر کے اُلوہی ابعاد حاصل کرنا ہے۔ ان لوگوں کے دلوں میں کوئی ایسی کیفیت موجود ہے، جس کی وجہ سے وہ موجودہ زندگی سے پوری طرح مطمئن نہیں رہ سکتے۔ اس سے ان کی پوری طرح تشفی نہیں ہو سکتی کہ تقرب کا سلسلہ جاری ہے۔ بلندی کی طرف قدم بڑھ رہے ہیں، اُلوہیت کی بعید منزلِ مقصود کی طرف حرکت جاری ہے۔ حالاتِ موجودہ پر قناعت کرنا موت ہے، تاریخ کی خلاف ورزی ہے، لیکن اگر آپ کے اندر رُوحانی بے اطمینانی ہے تو کم از کم اس کا امکان تو ہے کہ زندگی کے لیے ایک اور سمت دریافت ہو جائے گی۔ تب آپ اپنی موجودہ زندگی کو ایک ارفع زندگی کی راہیں تلاش کرنے کا وسیلہ قرار دیں گے۔ آپ کی ترقی کے بلند تر پہلو صرف ان دو حیاتیاتی اِشتہاؤں کی (جن کا اوپر ذکر آچکا ہے) تکمیل کی جانب ہی نہیں ہیں، بلکہ وہ آپ کی رُوحانی ضروریات کی تکمیل کی جانب ہیں —— یعنی آپ کی اخلاقی طاقت برداشت، آپ کی عقلی خود آگاہی، آپ کے جذبۂ جستجو اور اہم چیزوں کے حصُول کے لیے آپ کی تمنائیں —— بالفاظِ دیگر آپ کا سفر ایک جُداگانہ سمت میں ہوگا اور آپ حیاتیاتی جذبات اور خیالات کی حد بندیوں سے نکل کر بلند تر ہوتے جائیں گے۔

دوسری قسم کے لوگ کسی نہ کسی طرح یہ سمجھتے ہیں کہ وہ جن چیزوں کے لیے زندہ ہیں، وہی اصلی اور حقیقی ہیں۔ وہ اِنھی چیزوں کے اضافے کے طلب گار ہیں جو پہلے سے ان کے ہاں موجود ہیں۔ بالفاظِ دیگر، اگرچہ وہ بھی ترقی کے خواہاں ہیں لیکن جس سمت میں ترقی کر رہے ہیں وہ رُوحانی سمت نہیں ہے بلکہ جو سمت ان کے پیشِ نظر ہے وہ حیاتیاتی ضروریات کی تکمیل کی سمت ہے، یعنی وہ جن چیزوں کو اچھا سمجھتے ہیں، انھیں زیادہ سے زیادہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ گویا کہ ان کے مقصد کا رُجحان کمیت کی طرف ہے، کیفیت کی طرف نہیں —— نوعِ انسانی کی یہ قسم تاریخ کی غلام ہے —— صاحبِ اعتقاد ہی تاریخ کا آقا ہے۔

(فاضل مقرر کی نظرِ ثانی کے بعد انگریزی سے ترجمہ کیا گیا)

شامِ ہمدرد۔ کراچی
دسمبر ۱۹۶۳ شمسی



چودھری نذیر احمد خان

[شام ہمدرد لاہور ، ۵ دسمبر ۱۹۶۳ شمسی]

چوہدری نذیر احمد خاں

۱۳ر ستمبر ۱۸۹۶ء

جناب محترم چوہدری نذیر احمد خاں صاحب ہمارے ملک ہی کے نہیں بلکہ دنیا کے ممتاز ماہرینِ قانون میں سے ہیں اور اپنی مختلف النوع خدمات کی بنا پر پاکستان کی اجتماعی زندگی میں اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں۔

جناب چوہدری صاحب ۱۳ر ستمبر ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے۔ پنجاب یونی ورسٹی سے بی۔ ایس سی اور ایل۔ ایل۔ بی کی اسناد حاصل کیں اور ۱۹۲۱ء سے منٹگمری میں وکالت شروع کی۔ ۱۹۴۲ء میں حکومتِ پنجاب کے وفد برائے فوجی مراکزِ ہند کے رکن بنے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل اور ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی کے رکن بھی رہے۔ آپ نے جنگِ آزادی کے دوران میں انگریزی حکومت کی جانب سے ملے ہوئے تمام خطابات و اعزازات واپس کر دیے۔ تحریکِ آزادی میں حصّہ لینے کے جرم میں حکومت نے چوہدری صاحب کی زمینیں ضبط کر لیں اور آپ کو جیل بھیج دیا، لیکن رہائی کے بعد آپ نے اور بھی سرگرمی اور تن دہی کے ساتھ مسلم لیگ کی قیادت میں آزادی کے لیے جدّ و جہد شروع کر دی۔ آپ کو پنجاب صوبائی مسلم لیگ کی مجلسِ منتظمہ کا رکن منتخب کیا گیا۔ ۴۷ء میں ریزرو بنک آف انڈیا کے ڈائرکٹر مقرر کیے گئے۔

آزادی کے بعد آپ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے رکن نامزد کیے گئے۔ ۴۸ء میں پاکستان اسٹرلنگ بیلنس ڈیلیگیشن اور پاکستان کامن ویلتھ پارلیمنٹری وفد کے رکن کی حیثیت سے

لندن گئے۔ ۱۹۴۹ش میں پاکستان کے وزیرِ صنعت بنائے گئے۔ ۵۲ش میں آسٹریلیا میں پاکستان کے ہائی کمشنر نامزد کیے گئے، لیکن آپ نے اندرونِ ملک رہ کر ہی خدمت کو ترجیح دی اور اعلا عدالتوں میں وکالت فرمانے لگے۔ ۵۴ش میں آپ پنجاب ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کے صدر اور پاکستان بار ایسوسی ایشن کے بانی صدر منتخب ہوئے۔ جولائی ۵۹ش سے اکتوبر ۶۱ش تک آپ نے اٹارنی جنرل پاکستان کی حیثیت سے اہم خدمات انجام دیں۔

ستمبر ۶۵ش میں "عالمی امن بذریعے قانون کانفرنس" (واشنگٹن) نے چوہدری صاحب کو "دنیا کا ممتاز قانون داں" قرار دیا۔ آج کل آپ "محبانِ عالمِ اسلامی" کے بانی صدر ہیں اور اسلامی ممالک کے اتحاد کے لیے گراں خدمات انجام دے رہے ہیں۔

محمد سعید

دولتِ مشترکہ ممالکِ اسلامیہ کے قیام کا امکان

چودھری نذیر احمد خاں، سابق وزیرِ صنعت پاکستان و اٹارنی جنرل پاکستان

اِتحاد بین المسلمین کی بنیاد اُس دن رکھی گئی جب اللہ تعالیٰ نے قرآنِ حکیم کے ذریعے مسلمانوں کو یہ بشارت دی کہ سب مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں" اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ (سورہ الحجرات حٰم ۲۶) یہ ایک ایسی برادری کی بنیاد تھی، جس کا تصوّر اس سے پہلے کبھی نہ پیش کیا گیا تھا۔ اسلام سے پہلے قومیں، خاندان، قبیلہ، رنگ ونسل سے بنتی تھیں۔ آج یکساں زبان، رسم و رواج یا باہمی دنیاوی مقام پر رکھ کر بنتی ہے، لیکن یہ اِسلام کی خصوصیت ہے کہ اس نے بنی نوع انسان کی شاخیں اور قبیلے تو تسلیم کیے تاکہ آپس میں پہچان ہو سکے لیکن یہ کڑی شرط لگادی کہ زیادہ عزّت والا تم میں سے اللہ کے نزدیک وہ ہے جو تم میں سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ (الحجرات حٰم ۲۶)۔ گویا کہ اسلامی مِلّت کی بنیادی قدریں دوسری قوموں سے بالکل مختلف ہیں۔ ایمان اور پرہیزگاری سے ملّتِ اسلامیہ استوار ہوتی ہے اور انھی بنیادوں پر اس کی برادری قائم ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اِسلام میں رنگ ونسل نہ قوم و درجہ و دولت وثروت کو اعزاز واکرام کا معیار تصوّر نہیں کیا گیا۔ مقصود اسلام کا یہ تھا کہ ایک ایسی جماعت قائم کی جائے، ایک ایسی مِلّت کی بنا ڈالی جائے، جس میں کالے گورے کی تمیز نہ ہو۔ عجمی عربی کی تفریق نہ ہو۔ شرقی غربی میں تفاوت نہ ہو۔ تمام خاندانی، نسلی، قومی اِمتیازات ختم کر دیے جائیں۔ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہو۔ ایک حدیث شریف کے مطابق فرمایا گیا " مومن ایک دوسرے کے ساتھ اِس طرح پیوستہ ہیں جس طرح ایک عمارت کے مختلف حصّے ہوتے ہوں۔ ایک دوسرے کا سہارا ہے اور ہر حصّہ دوسرے کو مضبوط کرتا ہے۔"

فرنگی سیاست نے موجودہ قومیت کا تصوّر پیش کر کے دُنیا کو ایک خطرہ میں ڈال دیا ہے

حالاں کہ وہ ملّتِ اسلامیہ کے بنیادی عقیدوں کے سَراسر منافی ہے۔ ہم نہایت افسوس سے یہ دیکھ رہے ہیں کہ خود مسلمان ملکوں میں بھی قومیت کا یہ نیا تصوّر ان کو " انما المومنین اخوۃ" کے تصوّر سے دُور لیے جا رہا ہے۔

ابتدائے اسلام میں ملّتِ اسلامیہ کی یہی عملی وحدت تھی، وحدت گفتار، وحدت کردار، جس نے اُن کو البنیان المرصوص " (الصف) کی طرح ایک عظیم حقیقت بنا دیا اور اسی جذبے سے سرشار مجاہدوں نے اس وقت کی دُنیا میں ایک کونے سے دوسرے کونے تک اِسلام کا بول بالا کرکے ایک عالم کو حیرت میں ڈال دیا۔ یہ حیرت جلد ہی مخالفت کی صورت اِختیار کر گئی، جس کا اظہار جنگِ صلیبی سے لے کر آج تک ہم دیکھ رہے ہیں۔ فرنگ نے (جو مسلمانوں کو اپنا سب سے بڑا اور موثر حریف سمجھتا تھا)، ہر زمانے میں اور ہر ڈھب سے دنیائے اسلام کی وحدت پارہ پارہ کرنے کا کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا۔

ادھر مسلمان اپنی برادری اور اپنے اتحاد کو کم زور بناتے گئے۔ اپنی صحیح تعلیم بھول کر اپنے اصلی مقام کو چھوڑ گئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خارجی ریشہ دوانیوں اور اندرونی کم زوریوں نے اُن کو نڈھال کر کے رکھ دیا۔

یہ ایک دردناک داستان ہے، جس پر ہر اسلامی ملک کے اہلِ فکر نے آنسو بہائے ؎

نوحہ گر بلبل ہوا شیراز کا بغداد پر
داغ رویا خون کے آنسو جہاں آباد پر

آسماں نے دولتِ غرناطہ جب برباد کی
ابن بدروں کے دلِ ناشاد نے فریاد کی

اسلام کی کھوئی ہوئی عظمت کے ان مرثیہ خوانوں نے (جن میں ہمارے ہاں حالی، شبلی، اکبر الٰہ آبادی اور اقبال خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں)، عوام کے دل میں سطوتِ رفتہ دوبارہ حاصل کرنے کی تڑپ پیدا کر دی بعض صحیح قسم کے رہنماؤں نے تسبیح کے گرتے ہوئے دانوں کو ایک بار پھر پرونے کی کوشش کی لیکن ہماری شومئی قسمت کہ باوجود اِن کوششوں کے (اور باوجود بار بار کے چرکوں کے) بھی ہم ٹس سے مَس نہ ہوئے، بلکہ رفتہ رفتہ پستی کا احساس بھی دلوں سے زائل ہو گیا۔

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

اِس گرتی ہوئی حالت کو سنبھالنے کی ایک مجاہدانہ کوشش حضرت سیّد جمال الدّین افغانیؒ نے انیسویں صدی کے نصف آخر میں شروع کی۔ انھوں نے ایران، ترکیہ، مصر، ہندوستان میں استقلالِ

وطن کی ہر تحریک کو آگے بڑھانے کی کوشش کی۔ عالمی اتحادِ اسلامی کی تجویزیں سوچیں لیکن افسوس کہ ان میں سے ایک بھی تو کام یاب نہ ہوسکی۔

پہلی عالم گیر جنگ نے (جو کہ تھی تو فرنگ کی باہمی رقابتوں کا نتیجہ لیکن جس کو ختم ہوتے ہی کئی ناپاک مقاصد کے لیے استعمال کیا گیا) مسلمانوں کے مراکز کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا۔ خلافت کو جڑ سے اکھیڑ کر پھینک دیا۔ ترک و عرب کے درمیان ایک مستقل مخالفت کا بیج بو دیا۔ مشرقِ وسطیٰ کی اسلامی حکومتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے بالکل بے اثر بنا دیا، یا خود اپنے اثر میں لے لیا اور بالآخر اسرائیل کا چھرا عالمِ عرب کی پیٹھ میں گھونپ کر اپنی دغابازی اور بدعہدی پر مُہر ثبت کر دی۔ اس طرح دنیائے اسلام کے مضبوط ترین حصّے مغلوب و مفلوج کر دیے گئے اور ان اسلامیوں پر وہ مظالم روا رکھے گئے جن کی یاد سے اب بھی دل تڑپ اٹھتے ہیں۔

آپ میں سے بعض بزرگوں کو شبلی کی وہ نظم جو "الہلال" میں شائع ہوتے ہی بحق سرکارِ انگلشیہ ضبط ہوگئی تھی، یاد ہوگی:-

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک
چراغِ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک
حرم کی سمت بھی صید افگنوں کی جب نگاہیں ہیں
تو پھر سمجھو کہ مرغانِ حرم کا آشیاں کب تک
یہ مانا تم کو شکوہ ہے فلک سے خشک سالی کا
ہم اپنے خوں سے سینچیں گے تمھاری کھیتیاں کب تک
یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے
ہماری گردنوں پر ہوگا ان کا امتحاں کب تک
کہاں تک لوگے ہم سے انتقامِ فتحِ ایوبی
دکھاؤ گے ہمیں جنگِ صلیبی کا سماں کب تک

لیکن ستم بالائے ستم یہ کہ ہم خود اپنے شکاریوں کو ہمیشہ مشکور کرتے رہے ہیں ہم نے ہی اُن کے شوقِ شکار کو اُن کے لیے ایک دل چسپ مشغلہ بنا دیا۔ ؏

سادگی مسلم کی دیکھ، اوروں کی عیّاری بھی دیکھ

فرنگی سیاست کی بہت حد تک کام یابی کا راز ہماری اپنی نادانی اور عاقبت نا اندیشی ہے۔ اکبرؔ الٰہ آبادی کی پھبتی بھی تو اسی حقیقت کو واضح کرتی ہے ؏

بحمداللہ غربی پیٹ میں، مَیں خوب پچتا ہوں

حضرات! مَیں اس لمبی چوڑی تمہید کے لیے معافی چاہتا ہوں لیکن میرا پہلا عذر تو یہ ہے کہ پس منظر کو واضح کیے بغیر میری معروضات تشنۂ وضاحت نہ رہ جائیں۔ دوسرا یہ کہ جب "نالے" کو پابندِ "نے" نہیں کیا گیا اور فریاد کی کوئی "لے" مقرر نہیں کی گئی تو دل کے رونے پر وقت کی کوئی قدغن کیوں لگائی جائے؟

بہرصورت آج کی مجلس مرثیہ خوانی کے لیے منعقد نہیں کی گئی، بلکہ دَورِ حاضرہ کی ایک اہم ترین ضرورت یعنی "دولتِ مشترکہ ممالکِ اسلامیہ" کے قیام کے امکان کا جائزہ لینا ہے۔ اِس لیے مَیں صرف اِتنا عرض کرنے کے بعد کہ مسلمانوں کے ساتھ جو کھیل پہلے کھیلا جاتا تھا وہ اب بھی بہ شکلِ دیگر کھیلا جا رہا ہے، صرف "نئے دام لائے پُرانے شکاری" کا فرق ہے۔ پہلے فرنگی وعظ "دہانِ توپ" سے دیا جاتا تھا تو اب "زبانِ ڈالر" سے ہے۔ گویا شراب وہی ہے صرف صراحی بدلی گئی ہے۔ ورنہ حقیقتِ حال اب بھی یہی ہے کہ ؎

آگے انکل[1] سام، پیچھے جان[2] بل دونوں سوار
ایشیا میں کھیلتے پھرتے ہیں قوموں کا شکار

لیکن گزشتہ بیس سال کے عرصے میں دنیا کی سیاسی حالت میں انقلابی تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔ دُوسری عالمی جنگ کے بعد دنیا کے چپّے چپّے پر آزادی کی تحریکیں اٹھیں۔ پاکستان قائم ہوا۔ انڈونیشیا نے ڈچ سامراج سے ۳۰۰ سال بعد نجات حاصل کرلی۔ ملایا آزاد ہوگیا۔ شام و لبنان کے عوام نے فرانسیسی استعمار کو ختم کردیا۔ اردن کو کامل آزادی مل گئی۔ عراق نے برطانیہ کے ساتھ اپنے معاہدے کو منسوخ کرکے برطانوی فوج کو انخلا پر مجبور کردیا۔ مصر میں انقلاب آیا اور دو تین سال میں ہی برطانوی عساکر کو نہرِ سویز کے علاقے سے نکلنا پڑا۔ لیبیا نے اِٹلی کے اقتدار کو ختم کردیا۔ تونس اور مراقش آزاد ہوئے۔ الجزائر کے مجاہدین ایک خونیں غسل کرکے عروسِ آزادی سے ہم کنار ہوگئے اور حال ہی میں کئی افریقی ملک بھی آزاد ہوئے یا ہونے والے ہیں۔

آج مسلمانوں کی آبادی بفضلِ خدا ساٹھ کروڑ کے لگ بھگ ہے، جو دُنیا کی کل آبادی کا پانچواں حصّہ ہے، یعنی دنیا کا ہر پانچواں باشندہ مسلمان ہے۔ آزاد مسلم ملکوں کی تعداد جن میں مسلمانوں کی آبادی پچاس فی صد سے متجاوز ہے، تین درجن کے قریب ہے، جو خطّۂ ارضی کے چھوٹے حصّے پر قابض ہیں۔ اقوامِ متحدہ میں مسلم ممالک تعداد کے لحاظ سے قریبًا ایک تہائی یعنی ۱۱۱ میں سے ۳۳۔ ظاہر ہے کہ اگر ان میں آپس کا اتحاد ہو اور مشترک اغراض ہوں تو دُنیا کی اہم ترین بین الاقوامی تنظیم میں

۱۔ انکل سام UNCLE SAM بمعنی امریکی
۲۔ جان بل JOHNBULL بمعنی انگریز

ایک خاص مقام حاصل کر سکتے ہیں۔

جو اصحاب مسلم ممالک کی دولتِ مشترکہ کی تجویز کو ناقابلِ عمل اور خیالی پلاؤ کی حیثیت سے زیادہ درجہ دینے کو تیار نہیں۔ میں حتی الوسع ان کے نقطۂ نظر اور اپنے جواب پیش کرکے یہ ثابت کرنے کی کوشش کروں گا کہ صورتِ حالات ہرگز ایسی نہیں کہ اس پر قابو نہ پایا جاسکے یا ان کی اصلاح نہ ہوسکے۔

سب سے پہلا اعتراض کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اکثر مسلمان ملک قومیت کے جذبے میں گرفتار ہیں۔ وہ ہر معاملے کو اپنے مخصوص قومی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ مذہبی بنیادوں پر نہ اُن کو اعتماد ہے اور نہ ہی وہ اس زمانے میں ایسے فرسودہ اور زنگ آلود تصوّر کو کوئی اہمیت دیتے ہیں۔

یہ اعتراض ایک حد تک درست ہے لیکن اِس نظریے کی وجہ بھی آسانی سے سمجھ میں آجانی چاہیے۔ اوّل: پُرانے اسلامی ممالک میں تو یہ زہر خاصی کوشش سے داخل کیا گیا ہے اور اس کے اثرات بھی اتنے گہرے ہیں کہ ان کا مداوا بہ ظاہر کوئی آسان بات نہیں ہے۔ دوسرے نئے اسلامی ملکوں کو آزادی ملتے ہی نئی اور وسیع ذمّے داریوں سے عہدہ برآ ہونے سے فرصت ہی نہیں ملتی کہ وہ اتحادِ اسلامی کی طرف پوری توجہ دے سکیں۔ یہ اتحاد کے گیت انھیں دُور سے سُہانے تو ضرور محسوس ہوتے ہیں لیکن عملی اتحاد کے منصوبوں میں وہ براہِ راست دل چسپی لینے کا وقت اور ہمت نہیں پاتے۔ وہ ان دشواریوں کو نظر انداز نہیں کرسکتے جو اس وقت اپنے ملکوں کے اندر درپیش ہیں، اور پھر وہ یہ بھی محسُوس کرتے ہیں کہ پس ماندہ ملک بیرونی امداد کے بغیر ترقی نہیں کرسکتے۔ وہ باقی مسلمان ملکوں سے جو خود پس ماندہ ہیں، کیا توقع رکھ سکتے ہیں۔ لہٰذا وہ ایک حقیقت کو چھوڑ کر محض ایک سراب میں کوئی دل چسپی نہیں رکھتے۔

یہ تو تھا اعتراض! اب آپ اگر اس "قوم پرستی" کے اِعتراض کا حقائق کی روشنی میں جائزہ لیں تو ظاہر ہوگا کہ یہ طرزِ خیال مغربی تعلیم کے زہریلے اثرات اور فرنگیوں کی منظم سازشوں اور کوششوں کا نتیجہ ہے لیکن شُکر ہے یہ خیال صرف حکومتوں تک محدُود ہے، عوام میں اب بھی اخوتِ اسلامی کا بے پناہ جذبہ موجود ہے۔ جس کا بیّن ثبوت مَیں نے ملایا، انڈونیشیا، سنگاپور، ایران، لبنان، ترکی، سعودی عرب اور مصر میں سفر کرکے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ بات یہ ہے کہ اوّل تو کسی نے "اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ" کی عملی تفسیر پیش کرنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی، دوسرے ہم نے غیروں کے تجزیات درست مان کر خود بھی چند (غلط) معروضے قائم کرلیے ہیں۔

آپ خود ہی بتائیے کہ کوئی حقیقی، منظم اور موثر کوشش اس امر کی گئی ہے کہ ہر طرف سے اِتحاد کی آواز زور سے نہ سہی آہستہ ہی اٹھائی ہو۔

واقعہ یہ ہے کہ غیر مسلم دُنیا میں تو رقابتوں (بلکہ دیرینہ دشمنیوں) کے باوجود ایک فوق القومیّت Supra-Nationalistic تنظیم کا پرچار ہو رہا ہے اور اس پر عمل بھی ہوا ہے۔ مختلف الخیال اور مختلف النّوع قوموں کے (مشترکہ مفاد کے پیشِ نظر) کئی بین الاقوامی ادارے بنے ہوئے ہیں جہاں ان کی قومیت کے تقاضے بھی برقرار رہتے ہیں اور مل کر کام کرنے کے فائدے بھی پوری طرح حاصل ہوتے ہیں اور یہ بھی ایک افسوس ناک واقعہ ہے کہ مسلمانوں کو آج تک اتنی عقل اور ہوش نہیں آئی کہ وہ اپنی سالمیت برقرار رکھتے ہوئے کوئی مشترکہ تنظیم بنا سکیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ان ہی مغربی قوموں نے جنھوں نے قومیت کا موجودہ تصور دنیا میں پھیلایا ہے۔ اس وقت کم از کم پونے دوسو ایسی فوق القومیت تنظیمیں یا معاہدات قائم کیے ہوئے ہیں، جہاں ان کے مخصوص مفادات کا بھی ایک حد تک تحفّظ ہے، لیکن وسیع تر مفادات کی خاطر ہر ایک نے کچھ نہ کچھ قربانی ضرور دی ہے۔

ان معاہدات میں شامل ہونے والے ممالک بعض ایسے بھی ہیں جن کی دشمنی پُرانی ہے اور جو آج بھی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں۔

ان معاہدات کا تذکرہ شاید خالی از دلچسپی نہ ہوگا لیکن مَیں صرف چند ایک کا ذکر محض مثال کے طور پر پیش کروں گا تاکہ میرا موقف واضح ہو جائے کہ اس زمانے میں بھی قومیت کو برقرار رکھتے ہوئے فوق القومیت تنظیموں کو فروغ دیا جا رہا ہے اور کوشش کی جا رہی ہے کہ ایک متحدہ دنیا کا تصوّر قابلِ قبول ہو سکے۔ ملاحظہ ہو! یہ نہایت ہی مختصر انتخاب ہے۔ میں انگریزی میں نام پڑھتا ہوں کہ اس طرح زیادہ آسانی سے (معروف ہونے کی وجہ سے) سمجھ میں آسکے:۔

1. United Nations Organization ; 2. International Monetary Fund ; 3. British Commonwealth of Nations ; 4. European Common Market ; 5. European Economic Community ; 6. European Steel Community ; 7. Council of Europe ; 8. European Free Trade Association 9. Colombo Plan ; 10. French Community ; 11. International Labour Organization.

اور اب ملاحظہ ہوں:۔

1. International Tin Council ; 2. International Wool

Study Group ; 3. European Commission for control of foot and mouth diseases ; 4. International Olive Oil Council.

اور اب تو یورپین پارلیمنٹ، یورپین (بین الاقوامی) عدالت اور یونائیٹڈ اسٹیٹس آف یورپ کے منصوبے سوچے جا رہے ہیں، بلکہ ان کے ابتدائی مراحل طے بھی ہو چکے ہیں اور تو اور کل تک "تاریک" براعظم افریقہ میں جہاں ایک نئی قومیت مختلف ملکوں میں ٹھاٹھیں مار رہی ہے، وہاں بھی مئی ۱۹۶۳ء میں عدیس ابابا میں منعقد افریقی ملکوں کے سربراہوں نے افریقی اتحاد کے لیے منشور وضع کر کے ثابت کر دیا ہے کہ قومیت کا تصور برقرار رکھتے ہوئے بھی بین الاقوامی تنظیم ممکن ہے۔

ان پونے دو سو معاہدات میں سے ایک اور صرف ایک معاہدہ بعض مسلم ممالک کے درمیان ہے، جس کا نام عرب لیگ ہے اور جس کا کام آپ سب پر عیاں ہے۔ غضب ہے کہ اس حقیقت کے باوجود ہمارے کئی دوست مُصر ہیں کہ قومیت تو کجا ذہنیت کی موجودگی میں بھی مشترکہ مقاصد کے لیے تنظیم ناممکن ہے۔

فرانس اور جرمنی جیسے پُرانے دشمن اور امریکا اور روس جیسے کھلم کھلا رقیب تو ایک جگہ بیٹھ کر اپنے مشترکہ معاملات پر گفتگو کر سکیں، اپنے مشترکہ مفادات کے پیشِ نظر بین الاقوامی معاہدات وضع کر سکیں اور بین الاقوامی تنظیمیں قائم کر سکیں، لیکن مسلمان مُلک (جن میں سے اکثریت نئے ملکوں کی ہے اور جن میں باہمی عناد کی وہ خونی تاریخ موجود نہیں ہے جو فرنگ کے ملکوں میں ہے) مشترکہ اغراض کے لیے اکٹھے نہ ہو سکیں۔ عالمِ اسلام میں خدانخواستہ کیا خِلقی کمی پائی جاتی ہے کہ اس میں باہمی تنظیم یا معاہدات ناممکن ہوں؟ بات یہ ہے کہ ہم نے اس طرف کبھی خاص توجہ ہی نہیں دی۔ کام شروع ہی نہیں کیا۔ یونہی دُوسروں کی باتوں میں آ کر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے اور فتوے دے دیا کہ صاحب! اس ضمن میں کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ چلیے معاملہ طے ہوا۔ اب کوئی مشاعرہ منعقد کیا جائے یا کسی نئی بیرونی امداد کا بندوبست کیا جائے یا کسی نئے مالک کی تلاش کی جائے جو پُرانے مالک کا رقیب ہو اور اس طرح شاید زیادہ اچھی طرح گزر ہو جائے۔

ہم تو رخصت ہوئے، اوروں نے سنبھالی دُنیا
رہ گئی اپنے لیے ایک خیالی دُنیا

غضب ہے کہ ہم برطانوی دولتِ مشترکہ کے ممبر تو بن سکتے ہیں اور رہ سکتے ہیں — جہاں تک اس کا ایک ممبر جنوبی افریقہ (جو کالے لوگوں کو انسانی حقوق سے بھی محروم سمجھتا ہے) ایسا ہی معزز رکن تھا، جیسے دوسرے تھے اور جہاں ہندُستان جیسا غاصب اور ظالم ملک ہمارے شانہ بشانہ

مشترکہ مفاد میری سمجھ میں تو کبھی نہیں آیا کہ وہ کون سے ہمارے مشترکہ مفاد ہیں؟ انگریز کے ہوں تو ہوں جس کے لیے کام کرسکیں اور جہاں انگریز، جس نے ہمیں دو سو برس تک غلامی کی اس اندھیرے غار میں دھکیل دیا تھا، جہاں انسان کو کچھ سُوجھ ہی نہیں سکتا، جس نے ہمارا خون چُوس کر خصوصًا اس خطے کو جو اَب پاکستان کہلاتا ہے، صرف توپوں کی خوراک اور ایندھن کے واسطے اِستعمال کیا تھا، اسی انگریز کے سایۂ عاطفت میں دولتِ مشترکہ ممالکِ برطانیہ کی ممبری پر تو فخر و ناز کرسکیں، لیکن اگر اپنے بھائیوں سے مِل کر کام کرنے کی تجویز بھی پیش ہو تو اُسے ناممکن العمل قرار دے کر دھتکار دیں۔

میری قطعی رائے یہ ہے کہ آج بھی برطانیہ ہمارا دوست نہیں ہے۔ وہ ہمارے دشمنوں کا دوست ضرور ہے۔ اسرائیل کا چھُرا اس کے اسلحہ خانوں میں تیار ہوا۔ کشمیر کو ہندُستان کے حوالے کرنے کی ناپاک سَازش انگریز نے بنائی اور اب ہندُستان کو اپنے رفیقِ کار امریکا کے ساتھ مل کر جدید ترین قسم کا مہلک اسلحہ مہیا کر رہا ہے اور ہم ہیں کہ محض رُو رہے ہیں، بِلک رہے ہیں، بیخ رہے ہیں، چلّا رہے ہیں، بیان بازی میں اخباروں کے صفحے کے صفحے کالے کر رہے ہیں "اِٹلی کی توپوں میں کیڑے پڑیں" کا وِرد کر رہے ہیں لیکن اِتنی توفیق نہیں کہ اِس مصنوعی اور غیر فطری دولتِ مشترکہ سے علیحدہ ہو جائیں۔ آخر جنوبی افریقہ بھی تو برٹش کامن ویلتھ سے علیحدہ ہو کر زندہ ہی ہے۔ صرف ہم ہی ہیں جو دُوسروں کے بستہ فتراک ہو کر ہی زندہ رہ سکتے ہیں۔ کیا ہم اپنے پَیروں پر کھڑے ہو کر یا اپنے بھائیوں کی مدد سے یا اللہ کے فضل و کرم سے زندہ نہیں رہ سکتے؟ سچ پوچھیے تو اَب بھی جو چیز ہماری زندگی کی ضامن ہے وہ محض اللہ کا فضل و کرم ہے لیکن یہ حالت کب تک جاری رہے گی؟ اس کا اپنا قانون ہے کہ جب تک تم خود اپنی حالت کو نہ بدلو گے ہم تمھاری حالت کو بدلنے کے لیے تیار نہ ہوں گے۔ لہٰذا ہمیں اللہ کے فضل و کرم پر پورا بھروسہ رکھتے ہوئے "اپنی سی کریں بنے جہاں تک" کے اصول پر عمل کرتے ہوئے کام شروع کر دینا چاہیے۔

دوسرا اعتراض جو اتحادِ عالمِ اسلام کے متعلق اکثر سننے میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ تمام مسلمان ممالک خود پس ماندہ ہیں، وہ ایک دوسرے کی کیا مدد کرسکیں گے۔ یہ تو بہر صورت کسی زیادہ امیر یا ترقی یافتہ یا طاقت ور ملک کے زیرِ سایہ ہی پرورش پا سکتے ہیں۔ اِس شکست خوردہ ذہنیت کا تجزیہ کرنے سے ثابت ہو گا کہ یہ بزدلوں، کاہلوں اور دوں ہمت لوگوں کا نظریہ ہے۔ جان دار اور جواں مَرد قومیں اِس قِسم کے یاس آفریں خیال کو اپنے پاس بھی نہیں پھٹکنے دیتیں۔

پھر پس ماندگی کسی مستقل حالت کا نام تو نہیں ہے۔ آج جو ملک پس ماندہ ہیں، کل وہی معراجِ ترقی پر پہنچ سکتے ہیں۔ روس و انگلستان ایک زمانے میں اِتنے پس ماندہ تھے کہ وہاں کے باشندے قریبًا قریبًا تہذیب و تمدّن سے بالکل عاری تھے۔ آج وہ دُنیا کی ممتاز قوموں کے سَردار ہیں۔

کیا مسلمانوں نے قسم کھائی ہوئی ہے کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ پس ماندہ ہی رہیں گے؟ میری حتمی رائے ہے جو کہ حقائق پر مبنی ہے کہ اکثر مسلمان ملکوں میں خدا کے فضل سے وہ سب کچھ ہے جس کے ذریعے دنیا کی دوسری قومیں ترقی کے زینے پر چڑھی ہیں۔ "گراں خواب چینی" تو سنبھل جائیں اور مسلمان خوابِ غفلت میں پڑے رہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

میں آئندہ چل کر آپ کے سامنے اسلامی دُنیا کی زرعی، معدنی اور دیگر اقتصادی دولت کا ذکر کروں گا اور اس کی طرف بھی اشارہ کروں گا کہ ابھی تک ہم نے اپنے قدرتی خزانوں کو پوری طرح ٹٹولا بھی نہیں ہے، ورنہ ہمارے پاس اِتنی دولت موجود ہے کہ اگر صحیح طور پر اسے جمع کر کے عوام کے مصرف میں لایا جائے تو ہم بھی دنیا کی ممتاز اور ترقی یافتہ قوموں میں شمار ہو سکتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ چوں کہ اکثر اسلامی ملک غیروں کے قبضے میں تھے یا کم از کم زیرِ سایہ ضرور تھے، اِس لیے ان کی اقتصادیات پر غیر چھائے رہے، جس طرح وہ اپنا مفاد دیکھتے تھے، اسی طرح مغلوب ملک کا نشوونما کرتے تھے۔ میں آپ کے سامنے اپنے گھر ہی کی مثال پیش کرتا ہوں جس کے مجھے پاکستان بنتے ہی قریب سے اور سرکاری اِطلاعات کے مطابق براہِ راست مُطالعے کا موقع مِلا ہے۔

تقسیمِ ملک کے وقت تک مغربی پاکستان میں انگریز حاکم نے محض اپنی آبادی کا پیٹ بھرنے اور لنکا شائر اور مانچسٹر کے کارخانوں کو خام مال بہم پہنچانے کے لیے نہروں کا وسیع ترین انتظام کیا تھا۔ جن کی سیرابی سے گندم اور رُوئی کی پیدا وار بھی بڑھی کہ انگریزی منڈیوں کی ضروریات کے پورا ہونے میں بڑی مدد ملی لیکن یہاں کپڑے کے کارخانے نہ بننے دیے۔ پاکستان کے شروع میں یہاں صرف دو بڑے کارخانے کپڑے کے تھے۔ باقی سب جننگ فیکٹریاں تھیں۔ رُوئی کی گانٹھیں باندھنے والے کارخانے، جو براہِ راست رُوئی کو کراچی تک بذریعہ ریل بھیجنے میں مصروف رہتے تھے۔ یاد ہو کہ لاہور سے کراچی تک ریلوے لائن اول اول ہی بچھادی گئی تھی، حالانکہ نہ تو اس کی کوئی فوجی اہمیت تھی نہ ملک کے اندر تجارتی فائدہ تھا۔ مقصد صرف انگلستان کی ضروریات کو پورا کرنا تھا اور بس۔

مشرقی پاکستان میں، جو دنیا بھر میں سب سے زیادہ قدرتی پٹ سن پیدا کرتا ہے، ایک کارخانہ اس کی مصنوعات بنانے والا نہ تھا۔ سب کے سب کلکتے میں تھے۔ ہمارے ہاں صرف خام پٹ سن کی عارضی گانٹھیں باندھنے والی مشینیں KUTCHA BAILING PRESS تھیں۔ کوئی PUCCA BAILING PRESS نہ تھا اور چوں کہ ظاہر میں پھیلی ہوئی دولت کی فراوانی تھی، اِس لیے کسی کو پہاڑوں اور صحراؤں میں قدرتی ذخائر دریافت کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔

اور اب آزادی حاصل ہوتے ہی آپ ایک صنعتی انقلاب دیکھ رہے ہیں۔ کپڑا بننے کے کارخانوں

اور کھڈیوں کی وہ بھرمار ہے کہ نہ صرف ہم ملکی ضرورتیں پوری کر رہے ہیں، بلکہ باہر کی منڈیوں میں بھی ہمارا کپڑا بکنا شروع ہو گیا۔ تیل کے ذخائر بڑھ رہے ہیں۔ قدرتی گیس کا ایک قریبًا نہ ختم ہونے والا ذخیرہ مل چکا ہے۔ قیمتی پتھروں مثلاً زمرّد وغیرہ اور سنگِ مرمر کی خوب صورت، رنگین اور ملائم قسم کے ذخائر اب کام میں لانے شروع کر دیے گئے ہیں۔ سنگِ سبز جس کو اونکس کہتے ہیں، اب ہماری کئی عمارتوں میں استعمال ہوتا ہے۔ پن بجلی کی مقدار سینکڑوں حصّہ بڑھ گئی ہے۔ اُونی کپڑا بھی ملکی ضروریات پوری کر رہا ہے۔ ملک میں مصنوعی کھاد اور سیمنٹ کے کارخانے اپنے خام مال سے چل رہے ہیں۔ اِسی طرح مشرقی پاکستان میں پٹ سن کی مصنوعات، بوریاں، چٹائیاں، قالین، رسّے اور بیسیوں دوسری چیزیں بننی شروع ہو گئی ہیں۔ کاغذ وہاں بن رہا ہے، جو سارے پاکستان کی ضروریات کے لیے کفیل ہے۔ پن بجلی پیدا ہو رہی ہے۔ پھلوں کو ڈبوں میں بند کرنے کے کارخانے بڑھ رہے ہیں۔ غرض کہ ہر طرف ماشاءَ اللہ ترقی نظر آتی ہے۔ یہی حال آپ دوسرے اسلامی ملکوں میں پائیں گے، جو ابھی ابھی آزاد ہوئے ہیں۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ آزادی کے حاصل ہوتے ہی مسلمان ملکوں کی معاشی، تمدنی، زرعی، صنعتی، اقتصادی زندگی میں ایسا انقلاب آ رہا ہے کہ اقبال کا مژدہ آج بالکل صحیح ثابت ہو رہا ہے ؎

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا
دانہ تو، کھیتی بھی تو، باراں بھی تو، حاصل بھی تو

مجھے یاد ہے کہ میں نے سرکاری حیثیت سے ایک بیان دیا تھا کہ پاکستان کے بعض حصّوں خصوصًا بلوچستان، داؤدخیل کے علاقے اور مشرقی پاکستان کے بعض حصّوں میں (جہاں LIGNITE دستیاب ہوا تھا، جو ایک قسم کا کئی گھریلو ضروریات پورا کرنے والا ایندھن ہوتا ہے) وہ قدرتی اور معدنی ذخائر موجود ہیں، جو ہمیں ایک امیر ملک بنا سکتے ہیں۔ ضرورت ہے ان کو پوری طرح دریافت کرنے کی اور اپنے آدمیوں کی دریافت کرنے کی۔ واقعات کی روشنی میں آج اپنے سرکاری بیان کو بہ فضلِ خدا سو فی صد سچّا پاتا ہوں۔

بات ذرا لمبی ہو گئی، لیکن میں اس "پس ماندگی" کے الزام کو بالکل غلط ثابت کرنا چاہتا ہوں اور ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ اسلامی ملکوں کا اِتحاد محض چند حاجت مندوں کا آپس میں بغل گیر ہونے کے مترادف نہ ہو گا، بلکہ ایک مضبوط، قوی اور باوسیلہ تنظیم کا پیش خیمہ ہو گا۔

جو لوگ پس ماندگی کو عالمی اتحادِ اسلامی کے راستے میں رکاوٹ تصوّر کرتے ہیں، وہ بُری طرح طلسم ہیچ مقداری میں گرفتار ہیں اور میری دعا ہے کہ حق انھیں میری طرح صاحبِ اسرار کر دے۔

ضرورت اِس بات کی ہے کہ ہر اسلامی ملک اپنے اقتصادی حالات بہتر بنانے کی ٹھان لے۔ حکومت

اور عوام مل کر ملک کی عام بہتری کے لیے کام کریں، خصوصًا ہمارا نوجوان طبقہ جو اس وقت ایک بے راہ روی کی بھول بھلیاں میں گرفتار ہے، میں ان سے کہتا ہوں کہ سب بے فائدہ مشاغل چھوڑ کر اپنی تعلیم کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔ خاص طور پر سائنس جدیدہ کے ذریعے قدرت کے سربستہ خزانوں سے آگاہی حاصل کرو۔ علم طبقات الارض، علم معدنیات ——— سیکھو، تاکہ اپنے ملک کی ظاہرا اور چھپی ہوئی دولت کے صحیح استعمال سے اپنے ملک کی معاشی حالت بہتر بنا سکو اور حکومت کو بھی چاہیے کہ ہمارے نوجوان طبقے کی متاعِ عزیز کو اپنے ہاتھ سے نہ گنوائیں، بلکہ اُن سے تعمیرِ ملت کا کام لے کر ملک کی بنیادیں استوار کریں۔ باہر کے مبینہ ماہروں کی خدمات جلد از جلد ختم کر کے اپنے ملکی نوجوانوں کو ماہر بنائیں، جو پاکستان کے لیے کم از کم حب الوطنی کا جذبہ تو رکھتے ہیں۔

اب آپ اسلامی دنیا کے محل وقوع پر ذرا غور کریں۔ انڈونیشیا سے لے کر مراکش تک ایک وسیع و عریض سلسلہ اسلامی ممالک کا اس طرح پھیلا ہوا ہے، جس طرح کسی جسم کی ریڑھ کی ہڈی ہو۔ نیوزی لینڈ، آسٹریلیا یا کینیڈا کی طرح نہیں کہ ہیں تو ہر لحاظ سے اول درجے کے ملک، لیکن دُنیا کے کونوں میں واقع ہونے سے ان کی اہمیت، معاملاتِ عالم میں کوئی خاص درجہ نہیں رکھتی۔ عالمِ اسلام تو ماشاء اللہ دنیا کے ایسے حصے میں واقع ہے کہ اس کی عددی خصوصیت کے علاوہ اس کی محاریاتی قدر بہت زیادہ اہم اور قابلِ توجہ ہے۔ (شاید یہی وجہ ہے کہ فرنگ ہمیشہ اس طاقت کو کم کرنے کی فکر میں مبتلا رہتا ہے)۔

سیاسی اعتبار سے عالمِ اسلام کی حیثیت بڑی ممتاز اور سربلند ہو سکتی ہے، کیوں کہ یُو۔ این۔ او میں یہ سب سے زیادہ موثر اور بڑا گروپ بنا سکتے ہیں اور چھوٹے ایشیائی اور افریقی ملکوں سے مل کر دنیا کی محفلوں میں زیادہ سے زیادہ وقار حاصل کر سکتے ہیں۔ پھر ایک بنیادی عقیدہ رکھتے ہوئے ایک اللہ، ایک کتاب اور ایک رسولؐ کی تعلیم پر ایمان رکھتے ہوئے ان کے سیاسی اجزائے ترکیبی کچھ اس طرح آپس میں شیر و شکر کی طرح ملے ہوئے ہیں کہ ان کے اتّحاد سے نہ صرف وہ خود سرفراز ہو سکتے ہیں، بلکہ دنیا میں امن قائم کرنے میں بڑی مدد دے سکتے ہیں۔

آئیے اب آپ کو ان آزاد یا نیم آزاد اسلامی ممالک کے ناموں سے تو آشنا کرا دوں جہاں مسلمان پچاس فی صد سے زیادہ ہیں۔ انگریزی حروفِ تہجی کے اعتبار سے شروع کرتا ہوں:۔

۱۔ عدن	۲۔ افغانستان	۳۔ البانیہ	۴۔ الجیریا
۵۔ بحرین	۶۔ کیمرون	۷۔ چاڈ (یا شاڈ)	۸۔ ڈاہومی
۹۔ گنی	۱۰۔ انڈونیشیا	۱۱۔ ایران	۱۲۔ عراق

۱۳- ایوری کوسٹ ۱۴- اُردن ۱۵- کویت ۱۶- لبنان
۱۷- لیبیا ۱۸- ملایا (یا اب ملائیشیا) ۱۹- مالی ۲۰- ماریٹینیا
۲۱- مراکو ۲۲- مسقط اور عمان ۲۳- نائیجیریا ۲۴- نائجر
۲۵- پاکستان ۲۶- فلسطین ۲۷- قطار ۲۸- سعودی عرب
۲۹- سینگال ۳۰- سوڈان ۳۱- شام ۳۲- سیرالیون
۳۳- صومالیہ ۳۴- (وہ معاہداتی ریاستیں جو برٹش تحفظ میں ہیں) شرجا، راس الخیمہ، رام القوین، دوبائی، ابوذہبی، فوجیرہ۔
۳۵- تونس ۳۶- ترکی ۳۷- ٹانگانیکا ۳۸- یو۔اے۔آر (مصر)
۳۹- یمن ۴۰- زنجبار

ان قریباً چالیس ممالک میں سے عدن کالونی (عدن تحفظ شدہ علاقہ) بحرین، مسقط و قطار، معاہداتی ریاستیں سب کے سب برٹش اقتدار کے ماتحت ہیں اور اس طرح مسلمانوں کی آبادی پچاس فی صد سے زیادہ ہے۔

ہم سب کی یہ کوشش ہونی چاہیے کہ ان کو جلد از جلد غیروں کے قبضے سے نجات دلائی جائے، تاکہ ان کی حالت سُدھر سکے۔ ان کے علاوہ دنیا کے بڑے بڑے غیر مسلم ملکوں میں بھی مسلمان گو قلیت میں ہیں لیکن عددی لحاظ سے نہایت اہم اقلیتیں ہیں، مثلاً رُوس (سوویٹ یونین) میں ساڑھے تین کروڑ مسلمان ہیں۔ چین میں اب ایک کروڑ، ہندُستان میں چار کروڑ ستر لاکھ اور باقی ممالک میں قریباً ڈھائی کروڑ، جن میں سے حبشہ میں ساٹھ فی صد سے زیادہ مسلمان ہیں۔ اس آخری شق کی تفصیل خالی از دلچسپی نہ ہوگی۔ ذیل میں مسلم آبادی کی تعداد اور آبادی کا فی صد تناسب پیش کیا جاتا ہے:

۱- ارجنٹائن (جنوبی امریکا)	ڈھائی لاکھ	کل آبادی کا	۱۔۴	فی صد
۲- ارمینیا	ایک لاکھ ۶۴ ہزار	″	۱۲	″
۳- بیچوانالینڈ	۶۰ ہزار دو سو ساٹھ	″ ″	۲۰	″
۴- بسوٹولینڈ	ایک لاکھ ۴۷ ہزار ۳ سو ″	″	۱۹	″
۵- بھوٹان	۳ ″ ۵ سو ″	″	۵	″
۶- بلغاریہ	۱۱ لاکھ ۲۰ ″	″ ″	۱۴۔۶	″
۷- برما	۱ لاکھ ۹۷ ″ ۵ سو ″	″	۱۱	″
۸- کمبوڈیا	۵۴ ″	″ ″	۱	″

۹۔ کینیڈا	۲۹ ہزار	کل آبادی کا	۰٫۱۶	فی صد
۱۰۔ سیلون	۷ لاکھ	″	۷	″
۱۱۔ قبرص	۱ لاکھ ۱۶ ″ ۷ سو	″	۲۰	″
۱۲۔ کشمیر	۴۰ لاکھ	″ قریبًا	۹۰	″
۱۳۔ فرانس	۶ ″ ۸۰ ″		۱٫۶ ″	″
۱۴۔ فن لینڈ	۴ ″	″	۰٫۹	″
۱۵۔ جارجیا	۷ ″ ۴۲ ″	″	۱۹	″
۱۶۔ جرمنی	۵۰ ″	″	۰٫۷	″
۱۷۔ جزیرہ فجی	۳۲ ″	″	۷ یا ۹	″
۱۸۔ ہانگ کانگ	۶ ہزار ۶ سو	″	۰٫۲۵	″
۱۹۔ ہنگری	۶۰ ″	″	۰٫۶۵	″
۲۰۔ اٹلی	۳۵ ″	″	۰٫۷	″
۲۱۔ جاپان	۱ لاکھ ۳۵ ″	″	۰٫۱۶	″
۲۲۔ کینیا	۱۱ ″ ۶۰ ″	″	۱۹	″
۲۳۔ مڈغاسکر	۱۱ ″ ۳۴ ″	″	۲۲	″
۲۴۔ مالٹا	۳۴ ″ ۶ سو	″	۱۱	″
۲۵۔ ماریشس	۱ ″ ۲۰ ″	″	۱۷	″
۲۶۔ مالڈویا	۸۱ ″	″	۳	″
۲۷۔ موزمبیق	۷ ″ ۳۰ ″	″	۱۲	″
۲۸۔ نیپال	۲ ″ ۳۵ ″	″	۳٫۸	″
۲۹۔ نیوزی لینڈ	۴ ″ ۶ سو	″	۰٫۲	″
۳۰۔ فلپائن	۳۰ ″	″	۱۱	″
۳۱۔ پولینڈ	۱ ″ ۴۸ ″		۰٫۶	″
۳۲۔ پرتگالی تیمر	۱ ″ ۴۸ ″ ۵ سو		۳٫۲	″
۳۳۔ ری یونین	۴۷ ″	″	۱۸	″
۳۴۔ روڈیشیا اور نیاسالینڈ	۱۵ ″ ۶۶ ″	″	۲۲	″
۳۵۔ رومانیا	۶ ″ ۶۰ ″		۰٫۴	″

۳۷- تھائی لینڈ (سیام)	ساڑھے تیس لاکھ	کل آبادی کا	۱۱	فی صد
۳۸- ٹرینیڈاڈ	ایک لاکھ ۵۴ ہزار	″	۱۹	″
۳۹- یوگنڈا	۱۳ ″ ۵۸ ″	″	۲۲	″
۴۰- جنوبی افریقہ	۱ ″ ۳۰ ″	″	۰۶	″
۴۱- ویٹ نام	۴ ″ ۲۴ ″	″	۳	″
۴۲- یوگوسلاویہ	۳۰ ″ ۲۵ ″	″	۱۳	″

گویا کہ دُنیا کے ہر حصّے میں مسلمان موجود ہیں۔ کہیں زیادہ کہیں کم۔

نوٹ ۱: جو اعداد و شمار میں نے بیان کیے ہیں، ان کے متعلق چند ایک باتیں یاد رکھنا ضروری ہیں۔

اوّل: یہ کہ یہ تازہ ترین اطلاعات پر مبنی نہیں ہیں۔ اگرچہ ۶۱-۱۹۶۰ء تک آبادی کا اندازہ قریبًا قریبًا درست ہے۔

دوم: یہ کہ مختلف ذرائع سے جو معلومات حاصل ہوئیں ان میں باقی تو کافی مطابقت رکھتی ہیں لیکن دو یعنی چین اور رُوس کے متعلق روایتوں میں بڑا اختلاف ہے۔ ۱۹۶۲ء کے اِنٹرنیشنل ایئر بُک کے صفحہ ۱۸۳ پر چینی مسلمانوں کی تعداد آج سے چند سال پہلے ۵ کروڑ (کُل آبادی کا دس فی صد سے زیادہ حصّہ) درج ہے۔ حالاں کہ مجھے خود گزشتہ ماہ چینی سفیر متعیّنہ پاکستان نے بتایا تھا کہ چین میں ایک کروڑ مسلمان ہیں۔ کیا کوئی وسیع پیمانے پر مسلمانوں کا انخلا ہوا ہے؟ یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔

اِسی طرح روس کی مسلم آبادی کے متعلق کتابی اعداد و شمار اور روایتی تعداد میں بڑا فرق ہے۔ یہ اختلاف قابلِ تحقیقات ہے۔ باقی ملکوں کے اعداد و شمار صحیح معلوم ہوتے ہیں۔

کئی اور چھوٹے چھوٹے ملکوں اور جزیروں میں مسلمانوں کے اعداد و شمار دست یاب نہیں ہوسکے۔ قیاس ہے کہ سب کو ملا کر لاکھوں کی تعداد ہوگی۔

بعض ممالک میں مسلمان اقلیتوں کے ساتھ اچھا سلوک رَوا نہیں رکھا جاتا۔ مثلاً ہندوستان میں (خصوصًا کشمیر اور آسام میں) قبرص میں۔ حال ہی میں حبشہ سے بھی اس قِسم کی شِکایت موصول ہوئی ہے۔ ان مظلوم مسلم بھائیوں کی مدد کے لیے مسلمانوں کو اجتماعی طور پر اقدامات کرنے پڑیں گے۔ اس کے لیے بھی ان کے باہمی اتحاد کی سخت ضرورت ہے اور اگر یہ دولت مشترکہ دولت ممالکِ اسلامیہ کی صورت میں ہو تو اس کی خاص اہمیت ہوجاتی ہے۔

مسلم ممالک کی معدنی اور زرعی دَولت کا ذکر کرکے مَیں اب آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اللہ

تعالیٰ نے ان ملکوں میں بہت کچھ دے رکھا ہے۔ صرف نقص یہ ہے کہ ہم نے اپنی دولت کو غیروں کے ہاتھوں میں دیا ہوا ہے۔ اگر خود ہم ہی اس دولت کو زمین سے نکالیں اور خود ہی اسے قابلِ استعمال بنائیں تو ہماری حالت اور بھی سُدھر سکتی ہے۔ شکر ہے کہ اب اکثر مسلم ملکوں نے ایسا بندوبست کرنا شروع کر دیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے ہماری دولت کا مختصر خاکہ :-

دنیا بھر کے پٹرولیم (کروڈ آئل) کے ذخائر کا ۶۶ فی صد حصّہ مسلمان ملکوں میں ہے۔ کویت میں دنیا بھر میں سب سے زیادہ تیل نکالنے والے چشمے موجود ہیں۔ قدرتی ربڑ کا ۷۰ فی صد۔ پٹ سن کا ۴۰ فی صد، پام آئل کا ۵۶ فی صد، گرم مسالہ لونگ وغیرہ کا ۷۶ فی صد، کالی مرچ ۳۰ فی صد کاپوک (سنبل کی قسم کی نہایت ملائم ریشے دار پیداوار، جو تکیوں اور لائف بیلٹ کے کام آتی ہے) ۸۰ فی صد، کونین کا ۹۰ فی صد، قدرتی گیس کے ذخائر قریبًا قریبًا نہ ختم ہونے والے، چاول، روئی، گندم، کوکو اور کافی کی پیداوار اتنی کہ نہ صرف اندرونِ ملک کے لیے کافی بلکہ برآمد ہوتی ہے۔ یمن کی کافی دنیا بھر میں بہترین شمار کی جاتی ہے۔

اب ذرا ان مبیّنہ پس ماندہ ملکوں کی بڑی بڑی برآمدی اشیا کی مختصر روداد بھی سُن لیجیے۔ اُن میں چھوٹی چھوٹی چیزوں کا ذکر نہیں کروں گا، حالاں کہ ان کی فہرست بھی خاصی طویل ہے۔

عدن : کافی، کھالیں، تمباکو، مچھلی، نمک، پٹرولیم۔

افغانستان : قراقلی، اُون، پھل، قالین۔

الجیریا : پٹرول و گیس

بحرین : پٹرول و موتی

انڈونیشیا : ربڑ، پٹرول، کھوپرا (ناریل) ٹین، گرم مسالہ، تمباکو، پام آئل۔

ایران : پٹرول، روئی، اون، پھل، قالین، چاول۔

عِراق : پٹرول، کھجوریں (غالبًا دُنیا کی پیداوار کا ۸۰ فی صد حصّہ)

اُردن : تانبا، مصنوعی کھاد، تمباکو۔

کویت : تیل۔

لبنان : سنگترے، کیلا، سیب، ناشپاتی، سیمنٹ اور اون۔

لیبیا : تیل اور کھجوریں۔

ملایا : (ملیشیا) ربڑ، ٹین، کوئلہ، خام لوہا، باکسائیٹ (باکسائیٹ سے ایلومینیم بنتا ہے)، چائے۔

مالی : مونگ پھلی، چاول، گوند، مویشی۔

مراکو : فاسفیٹس، منگانیز، سکہ، سنگترے، جوار اور خشک سبزی۔
مسقط اور عمان : کھجور، مچھلی، سنگترے اور پھل۔
نائجیریا : روئی، کھالیں، مونگ پھلی، ناریل، کوکو، لکڑی اور ربڑ۔
پاکستان : پٹ سن، روئی، سوت، مچھلی، چائے، نمک۔
قطار : پٹرول۔
سعودی عرب : تیل، کھجوریں۔
سوڈان : روئی، SESAME تِل (جس سے خاص قسم کا تیل نکلتا ہے)۔ گوند، مونگ پھلی۔
شام (سیریا) : گندم، جوار، روئی، انگور اور زیتون
شرجا وغیرہ : تیل۔
تونس : خام لوہا، فاسفیٹس۔
ترکی : پھل، تمباکو، روئی، اُون، لوہا، کرومائیٹ، منگانیز، تانبا اور کھالیں۔
یو۔ اے۔ آر (مصر) : روئی اور سوت
یمن : کافی
زنجبار : لونگ، ناریل اور ابرق۔

یہ تو تھا مختصر ذکر بڑے بڑے برآمدی مال کا۔ اندرونِ ملک جن ضروری اشیا کی پیداوار ہوتی ہے اور جن کی کھپت وہیں ہو جاتی ہے اور جو معدنیات ملکی صنعتوں میں استعمال ہو جاتی ہیں۔ ان کے بیان کے لیے کافی وقت درکار ہے۔ مثال کے طور پر پاکستان کو لیجیے، جہاں قدرتی گیس بھی ہے، پٹرول بھی ہے۔ مصنوعی کھاد کے واسطے چونا اور جپسم بھی ہے۔ مارٹینیا میں خام لوہا ہے، بعض افریقی مسلم ممالک میں یورینیم بھی ہے، جو ایٹمی توانائی کے ضمن میں سب سے زیادہ قیمتی دھاتوں میں شمار ہوتی ہے اور آج سونے سے بھی زیادہ عزیز ہے۔

مَیں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ غیروں نے (اور خود ہم نے بھی) ان معدنی ذخائر کو بروئے کار لانے کی کوشش نہیں کی ورنہ "اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے"۔ انٹرنیشنل اٹلس (جو غیر سرکاری مطبوعات میں ایک بلند اور دقیع مقام رکھتی ہے)، کے ۱۹۶۳ء کی ایڈیشن میں ذرا صرف دو ملکوں افغانستان اور پاکستان کا ذکر سنیے، جن کو عام طور پر بے چارے پس ماندہ خطوں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

افغانستان : (صفحہ ۸۲) تانبے، سکے، لوہے کے بہت بڑے ذخائر یہاں ہیں، لیکن ان

کو استعمال میں نہیں لایا گیا۔ کوئلہ، پٹرول موجود پائے گئے ہیں۔ LAPIS LAXUTI (نہایت قیمتی پتھر) کی بہترین قسم یہاں ملتی ہے۔ رُوس درہ "حسف" میں گندک کے ذخائر نکالنے میں اور امریکن فیرچائلڈ کمپنی ان پوشیدہ معدنی ذخائر کے لیے ہوائی جائزہ لے رہی ہے۔ سارپل کے تیل کے چشموں پر تجربہ جاری ہے اور "اندکوہی" اور شیر غان کے علاقے میں روسی ماہرین کمپنی کے ساتھ تیل نکالنے کا معاہدہ، جنوری ۱۹۵۸ء میں ہوا تھا۔ ۱۹۵۸ء میں قراقلی کے ساڑھے چوبیس ٹکڑے برآمد ہوئے تھے۔

پاکستان: کئی خام معدنیات پاکستان میں پائی گئی ہیں۔ کوئلہ، (جپسم) فُلرس ارتھ، جو ٹالکم پاؤڈر بنانے کے کام آتی ہے۔ نمک (سوپ سٹون)، ابرق، کچا کرُوم اور پٹرولیم، نمک؛ معدنی کوئلہ کی کافی مقدار ہے اور قدرتی گیس کے لاانتہا ذخائر ہیں۔ صفحہ (۴۸۲)۔

یہ دو مثالیں پیش کر کے میں یہ دُہرانا چاہتا تھا کہ مسلم ممالک کی پس ماندگی یا غریبی ایک بالکل عارضی اور مصنوعی حالت ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم اسی حالت میں مگن ہو چکے ہیں، ورنہ دولت کے اتنے دفینے ہمارے یہاں موجود ہیں کہ جن کو نکال کر ہم بھی دُنیا کے امیر طبقوں میں شمار ہو سکتے ہیں۔ کیا اقبال اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے تھے ؎

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے

میں نے مسلمانوں کی عددی طاقت کا اوپر ذکر کیا ہے۔ یہ محض اعداد و شمار کا خاکہ نہیں ہے، بلکہ اس کی ذراسی تفصیل سے ظاہر ہو گا کہ بہادری، جواں مردی، شوقِ آزادی اور مجاہدانہ سرفروشی مسلمانوں کا شیوہ ہے اور ان کی فوجیں دُنیا بھر میں اپنا لوہا منوا چکی ہیں۔ انڈونیشیا اور الجیریا کی جنگِ آزادی کی داستانیں خونیں سہی، اِتنی حیات افروز اور رُوح پرور ہے کہ تاریخ اس پر شاہد رہے گی۔ ترک سپاہی اور پاکستانی سپاہی دنیا بھر کا بہترین لڑاکا جوان مانا گیا ہے۔ مصری بھائیوں نے جس طرح ایک دنیا کا مقابلہ کر کے علاقہ سویز کو خالی کرایا وہ ایک شان دار کامیابی ہے۔ غرض کہ افرادی طاقت (مین پاور) میں عالمِ اسلام غالباً دنیا کے سب خِطوں سے زیادہ امیر ہے۔ یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اگر ہم پست ہیں اور دوسروں کے دست نگر ہیں تو اس میں ہمارا اپنا ہی قصور ہے کسی اور کا نہیں۔ خدا تعالےٰ اب بھی ہمیں نیک ہدایت دے اور توفیق دے کہ قبضۂ فرنگ سے آزاد ہو سکیں۔ آمین۔

حسرت موہانی نے جو بات آج سے پچاس سال پہلے کہی تھی، افسوس ہے کہ آج بھی وہ حقیقت بنی ہوئی ہے ؎

غضب ہے کہ پابندِ اغیار ہو کر
مسلمان رہ جائیں یوں خوار ہو کر
سمجھتے ہیں سب اہلِ مغرب کی چالیں
مگر پھر بھی بیٹھے ہیں بے کار ہو کر

آج بھی باوجودیکہ ہم وہ سب رکھتے ہیں جس کا مختصر ذکر میں کر چکا ہوں۔ ہم دوسروں کے محتاج بنے ہوئے ہیں۔ ہم نے زندگی کے مقصد کو سمجھا ہی نہیں۔ سہل انگاری، غفلت، کاہلی اور تن آسانی کو اپنا شعار بنالیا ہے۔ اقبال کا فرمودہ ہمیں یاد ہی نہیں رہا ؎

رازِ حیات پوچھ لے خضرِ خجستہ گام سے
زندہ ہر ایک چیز ہے کوششِ ناتمام سے

وہ کوشش جہاں ہر کام یابی منزل نہیں تصور ہوتی، بلکہ سنگِ میل کا درجہ رکھتی ہے، ایسی کوشش جو ستاروں سے آگے اور جہانوں کی تلاش میں رہتی ہے۔ افسوس ہے کہ جب سے ملتِ اسلامیہ سے یہ جذبہ مفقود ہوا، جس کے باعث "بحرِ ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے" اس وقت سے ہم نے غیروں کی برتری بلکہ غلامی کو بہ خوشی تسلیم کر لیا۔ مجھے یقینِ کامل ہے کہ اگر آج بھی ہم پھر اُسی مجاہدانہ عزم کے ساتھ اپنی حالت بدلنے کا تہیہ کر لیں تو ہماری رُوحانی اور مادّی دولت ہمیں پھر ہمارا کھویا ہوا مرتبہ دلا سکتی ہے۔ انشاءاللہ۔

بعض دوستوں کا خیال ہے کہ پاکستان تو ہر حال میں اسلامی بھائیوں کی ہمدردی کے لیے بہت کچھ کرتا رہتا ہے لیکن ان کی طرف سے پاکستان کے موقف کی تائید میں شاذونادر ہی کوئی آواز اٹھی ہو۔ تو پھر جب یہ صورت ہو تو ہم کو چاہیے کہ اتحاد کے اس محال کام کو چھوڑ دیں۔ اپنے ملک کے دھندے تھوڑے ہیں کہ ہم دوسرے کے پھٹے میں ٹانگ اڑاتے پھریں۔ ان کا فرمانا ہے ؎

"کچھ ادھر کا بھی اشارہ چاہیے"

میری ذاتی رائے میں دوسرے ملکوں کے بھائیوں کی سرد مہری کی بھی بڑی وجہ یہی ہے کہ ہم نے کوئی دلی، منظم اور مستقل کوشش ان کو اپنے قریب لانے کی نہیں کی۔ ایک دو ڈگمگاتے قدم کبھی اٹھائے بھی تو وہ بھی یا دکھاوے کی خاطر یا بے یقینی سے۔ یا پھر یہ ہوا کہ ایک بھائی کی مدد کا وعدہ کر کے اُسے پُورا نہ کیا اور غیروں کی ریشہ دوانیوں کے باعث اٹھایا ہوا قدم بھی واپس لے لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آپس میں مزید بدمزگی پیدا ہو گئی، جس کو دُور کرنے کی کوئی کوشش نہ کی گئی اور اس طرح حالات بد سے بدتر ہو گئے۔ بین الاقوامی سیاست میں ایسے مقام کبھی کبھی آ جاتے ہیں۔ فراست اور تدبّر کا تقاضا یہ ہے کہ ایسی غلط فہمیوں کو احسن طریق سے رفع کیا جائے نہ کہ

ان کو ایک مستقل حیثیت دے دی جائے۔

دوسری وجہ پاکستان کے لیے ہر حال میں اتحاد کی کوشش رکھنے کی یہ ہے کہ یہ بہر صورت ایک نیک کام ہے، بلکہ ایک مقدّس فریضہ ہے۔ نیکی میں جو بھی پہل کرے وہ اللہ کے ہاں سُرخرو ہوگا۔

تیسرے یہ کہ بانیانِ پاکستان میں سے ایک یعنی علامہ اقبالؒ نے جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، اپنا سارا فکری پیغام اس عالمی اتحادِ اسلامی کے لیے وقف کیا ہوا تھا۔ بہر نوع وہ اپنے خطّے کے مسلمانوں کو ہمیشہ یہی تلقین کرتے رہے کہ جب تک دُنیائے اسلام میں مکمل اتحاد نہیں ہوگا، مشرق کی نجات نہ ہوگی اور مشرق کی نجات نہ ہوئی تو فرنگی سیاست کی لعنت دنیا کو ایک جہنم بنائے رکھے گی۔ انھوں نے ہر ملک کے مسلمان کو یہی پیغام دیا کہ دیکھنا کہیں رنگ و نسل و خون و علاقائی عصبیت یا فرنگی تصوّرِ قومیت میں نہ کھو جانا ؎

جو کرے گا امتیازِ رنگ و خوں مٹ جائے گا
تُرکِ خرگاہی ہو یا اعرابیٔ والا گہر
ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بہ خاکِ کاشغر

معمارِ پاکستان یعنی قائدِ اعظم محمد علی جناح کو قدرت نے مہلت نہ دی کہ اس معاملے میں مِلّت کی واضح طور پر راہ نمائی کر سکتے ہیں لیکن ایک صحافی کے بیان کے مطابق جب وہ پاکستان بننے سے پہلے مزارِ اقبال پر فاتحہ خوانی کے لیے گئے تو ان سے پوچھا گیا کہ کیا پاکستان دوسرے اسلامی ملکوں سے اتحاد کے لیے کوشاں ہوگا تو آپ نے فرمایا: یقیناً، پاکستان بنتے ہی جو کوشش اسلامی ممالک کو اقتصادی پلیٹ فارم پر جمع کرنے کی کی گئی، اس سے تو یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر قائدِ اعظم اور زندہ رہتے تو ضرور دنیائے اسلام کی خدمت کی طرف توجّہ دیتے۔

ہمارے موجودہ آئین میں اصولِ پالیسی کے تحت فقرہ نمبر ۲۱ میں یہ بات واضح طور پر بیان کی گئی ہے کہ حکومتِ پاکستان اتحادِ بین المسلمین کو فروغ دینے کی پالیسی پر کاربند رہے گی۔ ایک بات جو پاکستان کو اس خدمت کے لیے خاص طور پر موزوں بناتی ہے، یہ ہے کہ یہ ایک بالکل نئی اور نظریاتی مملکت ہے، اِس لیے اس کی کسی دُوسرے مسلم ممالک کے ساتھ کوئی نئی یا پُرانی پرخاش نہیں ہے، بلکہ اِس کا تو قیام ہی اسلامی نظریے کے طفیل ظہور میں آیا، اس لیے پاکستان کا دُوسروں سے بڑھ کر یہ فرضِ منصبی ہے کہ چاہے دوسرے کچھ کہیں یا کچھ کریں، یہ اپنے موقف پر ڈٹا رہے اور اِتحادِ بین المسلمین کے نعرے کو اتنا دل سوز بنا دے کہ اس پر فی الحال کان نہ دھرنے والے بھی بالآخر ہماری آواز سننے پر مجبُور ہو جائیں۔

جیساکہ میرے محترم دوست علامہ محمد اسد نے اپنی تازہ ترین تصنیف (اسلام میں حکومت اور سیاست کے اصول) میں لکھا ہے :-

"ہر ملّت کی زندگی میں جلد یا بہ دیر ایک ایسا وقت آتا ہے جب کہ اس کو اپنی قسمت کا آزادانہ فیصلہ کرنے کا اختیار دیا جاتا ہے۔ اسلامی دُنیا میں آج وہ وقت آپہنچا ہے۔ قریبًا ایک سو سال کی جدوجہد، امیدوں، غلطیوں اور مایوسیوں کے پُرآشوب دَور سے گزر کر آج اکثر مسلم ممالک اِستعماری پنجے سے نِکل کر مکمل آزادی کی نعمت کو حاصل کرچکے ہیں۔ اگر آج انھوں نے اپنی قسمت کی تعمیر کا موقع کھو دیا تو پھر شاید مدّت العمر تک یہ وقت ہاتھ نہ آسکے گا۔"

تو، اَے برادرانِ ملّت! آئیے ہم صدق دل سے حالات گزشتہ اور حاضرہ کا جائزہ لیں اور اپنی آئندہ تعمیر کے منصوُبوں پر قابلِ عمل طریقوں سے غور کریں۔ میری دانِست میں وہ طریقہ یہی ہے کہ اخوت کے ازلی رشتوں کو استوار کرتے ہوئے اور مشکلات اور دشواریوں پر قابو پاتے ہوئے ہم ایک دولتِ مشترکہ ممالکِ اسلامیہ کے منصوُبوں کی بنیاد قائم کریں، تاکہ مسلمانوں کے بھی دن پھریں اور وہ دنیا میں اپنا صحیح مقام حاصل کرسکیں۔

اِس مقصد کے لیے ایک مجاہدانہ اقدام کی ضرورت ہے جس میں ہم اپنا تن، من، دھن لگا دیں۔ کامیابی و نصرت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم اگر سچے مسلمانوں والے جذبے سے سرشار ہوکر امتِ محمدیہ کی ایک نئی اور وسیع تنظیم کی بنیاد ڈالیں گے تو اللہ تعالیٰ تائید غیبی سے ہماری ناچیز کوششوں میں برکت ڈالے گا۔ انشاء اللہ۔

اب میں ان عملی تجاویز کا ذکر کرتا ہوں جن سے یہ مقصد حاصل ہوسکتا ہے۔ واضح رہے کہ میں ان کے سِلسلے وار بیان سے یہ نہیں کہہ رہا کہ یہ کسی پہلے یا دُوسرے یا تیسرے قدم کا تعین ہے۔ ان تمام تراکیب کو بیک وقت یا مناسب اوقات میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہم پہلے قدم کے بعد دوسرے قدم اٹھانے کا انتظار کرتے رہیں۔

تو یہ ہیں میری تجاویز۔ ان پر ٹھنڈے دل سے غور فرمائیے:

۱- ایک دوسرے کے حالات سے براہِ راست واقفیت حاصل کی جائے۔ غیروں کے ذریعے اور واسطے سے قطع تعلق کرکے خود آپ ایک دُوسرے سے رابطہ اتحاد قائم کریں۔

۲- اپنے غیر ملکی بھائیوں کی تاریخ، ثقافت، تہذیب، ادب، فن، معاشی اور سیاسی اور اِقتصادی حالات کا براہِ راست مطالعہ کیا جائے، تاکہ صحیح حالات کی روشنی میں اتحادِ عمل

کی راہیں نکل سکیں

۳۔ عربی زبان کی تعلیم کو ہر ملک میں فروغ دیا جائے۔ عربی قرآنی زبان ہونے کی وجہ سے تھوڑی بہت ہر ملک کے مسلمان کے زیرِ مطالعہ آتی ہے۔ دنیائے اسلام کے اکثر حصّوں میں عربی مادری زبان کا درجہ رکھتی ہے اور باقی ملکوں میں اس کا ایک بلند اور قابلِ احترام مقام متعیّن ہے۔ عربی کی تعلیم کا ہمارے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پورا اہتمام ہونا چاہیے۔ تاکہ عالمِ اسلام کے مسلمان ایک دُوسرے کی زیادہ سے زیادہ قابلِ فہم زبان کے ذریعے اپنے خیالات اور جذبات کی آسانی سے ترجمانی کر سکیں۔

۴۔ پیغمبرِ اسلامؐ کی مقدّس زندگی کی تعلیم ہماری درس گاہوں میں لازمی قرار دی جائے، تاکہ اسلام کے سرچشمۂ حیات سے ہم متواتر سیراب ہوتے رہیں۔

۵۔ یومِ میلادالنبیؐ کی تقریب سرکاری طور پر تمام مسلم ممالک میں بصد شان و شوکت اور ایک منظم طریقے سے منائی جائے اور اس متبرک دن کا پیغامِ اخوتِ عالمی کے لیے بھی اِستعمال کیا جائے۔

۶۔ مسلم ممالک کی زرعی، معدنی، تجارتی، صنعتی، اقتصادی حالات سے زیادہ سے زیادہ آگاہی حاصل کی جائے، تاکہ مشترکہ منڈیوں کے قیام کے امکان کا جائزہ لیا جا سکے۔ یورپین کامن مارکیٹ بننے کے بعد عالمِ اسلام کو اپنی مشترکہ اتحادی منڈی کی طرف توجّہ دینی چاہیے۔ اسی طرح دولتِ مشترکہ ممالک برطانیہ کی منڈی بھی مسلمان ممالک کی باہمی تجارت میں حائل ہے۔ لہٰذا میں مشترکہ اسلامی منڈی پر خاص زور دیتا ہوں۔

۷۔ ہر اسلامی ملک کے سیاسی، اقتصادی، تجارتی اور سیاسی رجحانات کا مطالعہ کیا جائے۔ تاکہ کوئی مشترکہ راہِ عمل وضع کی جا سکے جس سے ہم ایک دوسرے کی مدد کر سکیں۔

۸۔ ہر اسلامی ملک میں ایسے کتب خانے قائم کیے جائیں جہاں ایک دوسرے کے علم و ادب، فن و ثقافت سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم ہو سکیں۔

۹۔ ایک خاص جزو ہماری ان لائبریریوں کا وہ ہونا چاہیے، جس میں محض عددی واقفیت STATISTICAL INFORMATION مہیا کیا جائے جس میں وقتاً فوقتاً تازہ ترین اِطلاعات کے مطابق ترمیم ہوتی رہے۔

۱۰۔ اس ضمن میں ملک ملک میں ایسے اخبار یا رسائل جاری کیے جائیں جو نہ صرف پیغامِ اِتحاد کے مختلف پہلوؤں کے لیے وقف ہوں، بلکہ جو ایک آئینہ ہوں، ملکی حالات کی ہر نوع کا، تاکہ ہمیں ہر قسم کی واقفیت صحیح طور پر حاصل ہو سکے۔ اس میں کسی غیر اسلامی

عنصر کا دخل نہ ہو۔ منشا اِس ساری تگ و دَو کا یہ ہو کہ ایک مسلسل اور منظم پروپیگنڈا بین الاقوامی سطح پر اتحادِ اسلامی کے لیے جاری کرنے کا اہتمام کیا جائے اور اس کے لیے ہر جائز کوشش پر عمل کیا جائے۔

۱۱۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی یہ ہو کہ خاص خاص ایسی تصانیف کے تراجم کا ملکی زبانوں میں اہتمام کیا جائے جو اتحادِ بین المسلمین کی نشان دہی کرتی ہوں یا جن کے مطالعے سے اس پیغام کی حقیقت واضح ہوتی ہو، جن پر عمل کرنے سے ہم عالمی اتحادِ اسلامی حاصل کر سکتے ہیں۔ علّامہ اقبال کی تصانیف کا ترجمہ تو فوراً ہونا چاہیے، جن میں انھوں نے ملّت کو وحدتِ فکر اور وحدتِ عمل کا پیغام دیا ہے۔ عربی زبان میں اقبال کے اس حصّہ کلام کو اشاعت ضروری ہے کہ ان ہی ممالک پر فرنگی تصورِ قومیت کا بھوت بُری طرح سوار ہے۔ اسی طرح کسی اور مسلم مفکّر نے دیگر اسلامی ممالک میں یہی پیغامِ وحدت دیا ہو تو اس کا ترجمہ بھی مختلف زبانوں میں کرایا جائے۔

نوٹ: تذکرۃً یہ بات خالی از دلچسپی نہ ہوگی کہ ۱۹۶۱ء میں صدر سوئیکارنو نے مجھ سے جاکرتا میں فرمایا کہ اقبال کی کئی کتابوں کا ترجمہ بھاشا انڈونیشیا یعنی انڈونیشیا کی قومی زبان میں ہو چکا ہے۔

۱۲۔ اخبارات کو خاص طور پر اتحادِ بین المسلمین کے ضروری مسئلے کے متعلق توجّہ دلا کر ان کے چند کالم عالمِ اسلام کے خبروں کے متعلق مخصوص کر دیے جائیں ہر ملک کی مرکزی انجمن اِطلاعی بلیٹن شائع کرے جن کا خلاصہ معتبر معلومات کی اشاعت کے لیے وقتاً فوقتاً مرکز عالمِ اسلام سے شائع ہوا کرے۔

۱۳۔ جس جس ملک میں بیرونی اسلامی ممالک کے طالبِ علم پڑھتے ہیں، اُن سے عملی رابطۂ اتحاد قائم کیا جائے۔ اُن پر اپنے رویّے سے یہ ثابت کیا جائے کہ وہ اپنے گھر میں ہیں۔ اُن کو اپنی قومی اور علمی اور مجلسی تقریبات میں بُلایا جائے، بلکہ گھروں میں بُلا کر اُن پر اخوتِ اسلامی کا پورا مظاہرہ کیا جائے۔

نوٹ:۔ اِس قسم کا تجربہ لاہور میں چند دردمندانِ اسلام کی جاری کردہ تحریکِ محبّانِ عالمِ اسلامی .FRIENDS OF THE MUSLIM WORLD مختصراً الاحبّا کے ذریعے گزشتہ ایک سال میں کیا گیا ہے، جو بہ فضلِ خدا بہت ہی کامیاب رہا ہے اور جس سے یہ حوصلہ پڑتا ہے کہ اگر ہماری نئی پود کے دلوں میں اسلامی عالمگیر برادری کا یہ بیج بو دیا جائے تو انشاءاللہ ایک دن پھل لائے گا۔

۱۴- دوستی، خیرسگالی اور اخوتِ اسلامی کے خیال کو فروغ دینے کے لیے ہر ملک میں باہر سے آنے والے مسلم مشاہیر کو اپنے خیالات پیش کرنے کے مواقع بہم پہنچائے جائیں۔ اس طرح اگر کوئی سرکاری نزاکتیں مانع نہ ہوں تو سرکاری وفود کو بھی اِسی طرح عوامی اجتماعوں میں دعوت دے کر ان کے ملکی حالات سے واقفیت حاصل کی جائے اور ایک دوسرے کے دُکھ سُکھ میں شامل ہونے کے مواعید کیے جائیں۔

۱۵- اسلامی ممالک کے درمیان رسل ورسائل کے وسیلوں کو فروغ دیا جائے۔ ٹیلی فون، تار، ریل، ہوائی جہاز کے سفر کے انتظامات کی طرف فوری توجہ دی جائے۔ ان میں آسانیاں پیدا کی جائیں۔ ویزا کی پابندیوں کو ختم (یا کم از کم بہت نرم) کر دیا جائے۔ جس طرح تجارتی تعلقات میں بعض ملکوں Most favoured nations کا درجہ دیا جاتا ہے۔ اسی طرح اسلامی ملکوں کو بھی وہی درجہ دیا جائے اور رسل ورسائل کے سلسلے میں بھی یہی پالیسی رَوا رکھی جائے۔

نوٹ: مقامِ افسوس ہے کہ ایران جو ہمارا دوست اور ہمسایہ ہے اور جو ایک فوجی معاہدے میں بھی پاکستان کا شریک ہے اور سعودی عرب، جہاں ہمارے رُوحانی مراکز کا خزانہ ہے وہاں کے لیے تو ویزا کی سخت اور کڑی پابندی ہو اور ڈنمارک، سویڈن وغیرہ کئی یورپین ممالک کی یاترا کے لیے ویزا کی ضرورت ہی نہ ہو۔ اسلامی ممالک میں سفر کے لیے زرِمبادلہ کی سہولتیں ابھی تک محدود ہیں۔

۱۶- اعلا درجے کے بااختیارات سرکاری وفود کا تبادلہ اسلامی ملکوں کے درمیان زیادہ سے زیادہ تعداد میں ہونا چاہیے کہ اس سے تجارتی، اقتصادی اور مُعاشی تعلقات جلد سے جلد استوار ہو سکیں۔

نوٹ: خدا کا شکر ہے کہ پاکستان اب اس پالیسی پر گامزن ہوتا نظر آتا ہے۔ کاش کہ دوسرے ممالک بھی اسی روش کو اختیار کریں اور ایک مشترکہ اسلامی منڈی کی بنیاد ڈال سکیں۔

۱۷- مکّہ مکرمہ سے ابتدا کر کے عالَمِ اسلامی کی اونچے درجے کی کانفرنسیں مختلف مراکز میں منعقد ہوتی رہیں، تاکہ اخوت اور باہمی تعلقات کے عملی پہلو زیرِ بحث آتے رہیں اور رفتہ رفتہ تجارتی اور معاشی ہم آہنگی سے ہم ایک دوسرے کے قریب تر آتے جائیں۔ ان اجتماعوں کا ایک بڑا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ آپس کے تضاد اور شکر رنجیاں اور چپقلش مٹانے

کے قابلِ عمل منصوبے سوچے جائیں۔ ملکی سربراہوں کی ایک پنچایت قائم کی جائے، جو نیک نیتی سے ہر وقت آپس میں مصالحت کی کوشش میں مصروف رہے۔

۱۸۔ اگر ہمیں اللہ تعالیٰ یہ توفیق دے کہ ہم اس پروگرام پر عمل کر سکیں تو پھر کچھ مدت کے بعد (لیکن جتنی جلدی سے جلدی ممکن ہو سکے) تمام مسلم ملکوں کے سربراہوں کی چوٹی کی کانفرنس (Summit Conference) مکہ معظمہ یا مدینہ منورہ میں بلائی جائے اور وہاں دولتِ مشترکہ ممالکِ اسلامیہ کی داغ بیل ڈالی جائے اور اسی ارضِ پاک میں (جہاں سے دُنیا کو رُشد و ہدایت و اتحاد کا پیغامِ ابدی دیا گیا تھا) اس تنظیم کا مستقل دفتر ہو، جو مرکز کا کام سرانجام دے۔

نوٹ: آخر روس اور امریکا کی سخت رقابت کے باوجود یو۔ این۔ او کا صدر مقام تو نیویارک میں ہی ہے۔ مکہ مکرمہ یا مدینہ منورہ سے تو ہر کلمہ گو کو جو عقیدت ہے، اس کے پیشِ نظر مرکز کے محل وقوع پر کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔

۱۹۔ ہر اسلامی ملک کے عوام اپنے نمائندوں اور فلاحی جماعتوں کے ذریعے اپنی اپنی حکومتوں کی توجہ اس ضروری اسلامی اور بین الاقوامی فریضے کی طرف دلا کر حکومتوں کو نظریۂ اتحاد کی جانب راغب کرنے میں مصروفِ کار رہیں۔

۲۰۔ محبانِ عالمِ اسلامی کی قسم کی انجمنیں اندرون اور بیرون ملک قائم کی جائیں، جن کی بڑے بڑے شہروں میں شاخیں ہوں اور جو ہر وقت اس پروگرام کی ان مشقوں کی تکمیل کی طرف مصروف رہیں، جن سے بالآخر ہمارے دلوں سے مصنوعی کدورتیں دُور ہو کر حقیقی محبت کا جذبہ موجزن ہو سکے۔

مَیں نے جو کچھ اس بیس نکاتی پروگرام میں عرض کیا ہے وہ کسی آخری نقشے کی صورت میں نہیں پیش کیا۔ صرف افکار کو اس سمت راغب کرنے کی ایک ذرا تفصیلی دعوت دی ہے۔ جس وقت ہم عملی طور پر کام شروع کریں گے، اس پروگرام میں کئی تبدیلیاں پیدا ہوں گی۔ لیکن مطمحِ نظر ایک ہی رہے گا اور منزل بھی ایک ہی رہے گی۔ اکثر احباب یہ فرماتے ہیں کہ یہ کام تو بہت بڑا کام ہے، اسے کرے گا کون؟ جواباً عرض ہے کہ مَیں اور آپ۔ دُوسروں کا منہ دیکھتے نہ رہنا چاہیے۔ "اپنی سی کریں بنے جہاں تک" کے سنہری اصول پر کاربند ہوتے ہوئے بھی اور اس بات سے ایک روحانی اور حقیقی مسرت حاصل کرتے ہوئے کہ ہم ایک مقدس فریضہ ادا کر رہے ہیں اور اللہ کے فضل و کرم پر بھروسہ رکھتے ہوئے ہمیں بسم اللہ کر دینا چاہیے۔ میرا تجربہ گزشتہ چند سالوں کا یہ ہے۔ خصوصاً محبانِ عالمِ اسلامی کی تحریک سے وابستگی کی وجہ سے گو کہ یہ کام بظاہر بہت مشکل نظر آتا ہے۔ درحقیقت اتنا

دشوار نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ خود اس میں آسانیاں پیدا کر دیں گے۔ جواں مَردوں کے کارناموں سے تاریخ عالم کے صفحات پُر ہیں۔ جن قوموں نے حصُولِ مقصد کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دی وہی دُنیا میں سرفراز ہوئی ہیں۔

حضرت علیؓ کو خیبر والوں نے خیرسگالی کی دعوت تو نہیں دی تھی۔ حضرت خالد بن ولیدؓ کو کوئی اِستقبالیہ رقعہ نہیں بھیجا گیا تھا۔ محمّد بن قاسم کے پاس کوئی خط نہ گیا تھا کہ جناب تشریف لائیے۔ طارق نے ایک گلستانِ اُندلس کا رُخ محض سیر و تفریح کے لیے نہ کیا تھا۔ ان میں سے ہر ایک نے ایک عظیم مقصد کے لیے اپنی جان جوکھوں میں ڈالی تھی۔ آخر کولمبس بھی تو کسی آسان کام کو انجام دینے گھر سے نہ نکلا تھا۔ کپتان کُک کا کام بھی نرم و ملائم نہ تھا۔ وہ محض ۳۵۰ ٹن کے جہاز Aloa میں انگلستان سے ۱۱ ہزار میل دُور نیوزی لینڈ کی جنت میں بسنے چلے تھے۔ وہ جان پر کھیل کر گھر سے نکلے تھے۔ فرنگ نے جو ساری دنیا کو اپنے چنگل میں لے لیا تھا، وہ کسی چھومنتر کے ذریعے تو نہ تھا۔ وہ لوگ جان پر کھیلے تھے اور ان پر غالب آئے تھے، جن کو جان پیاری ہو چکی تھی۔ اکبر کا وہ شعر یہاں کتنا صادق آتا ہے ؎

جو دیکھی ہسٹری اِس بات کا کابل یقیں آیا
اسے جینا نہیں آیا، جسے مرنا نہیں آیا

لنڈبرگ یا ایمی جانسن امریکا سے پیرس کسی طِلسمی اڑن کھٹولے میں نہ اُڑے تھے۔ کون ٹیکی کے بہادر محض سمندری سفر کے لطف سے بہرہ اندوز ہونے نہ چلے تھے۔ ہلاری اور ٹنزنگ ایورسٹ کی چوٹی پر صرف ہَوا خوری کے لیے نہ گئے تھے۔ خلائی سفر کرنے والے محض ہوائی کرتب تو نہیں دکھا رہے تھے۔

جوینده یابنده۔ آپ تلاش میں نِکلیں تو سہی، منزلِ مقصود ہاتھ آ ہی جائے گی ؎

گِلہ اے نظیرؔ اس کی رحمت کا کیا ہے
کبھی تو نے دل سے دُعا کی بھی ہوتی

دولتِ مشترکہ ممالکِ اسلامیہ کے ان فوائد کے علاوہ جن کا بیان کر چکا ہوں، ایک بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ امنِ عالم کے لیے ایک نئی اور موثر کوشش کا آغاز ہو جائے گا۔

اِس وقت دنیا دو بلاکوں میں بٹی ہوئی ہے۔ سرمایہ داری نظام اور کمیونسٹ نظام کی باہمی دشمنی نے جو خطرہ امن عالم کے لیے پیدا کر دیا ہے وہ ایسا مہیب ہے کہ بعض دانش وروں کا خیال ہے کہ اگر ایٹمی جنگ چِھڑ گئی تو اس کے اثرات قیامت خیز ہوں گے۔

ان دونوں متخاصم بلاکوں نے باقی دنیا کے چھوٹے چھوٹے ملکوں کو کسی نہ کسی ڈھب سے اپنا

خیمہ بردار یا حلیف بنایا ہوا ہے یا بنانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ مسلمان ملک بھی یہ دیکھ کر کہ آج کل اکیلے رہنے میں خطرات زیادہ ہیں۔ کسی نہ کسی بلاک سے وابستگی رکھنے میں ہی سلامتی سمجھتے ہیں۔ ذرا غور سے دیکھا جائے تو یہ پالیسی ان کو خطرات میں گھیرنے والی ہے، بچانے والی نہیں۔

نوٹ: اخباری اطلاعات کے مطابق کراچی میں افریشیائی اقتصادی کانفرنس شروع ہوئی ہے۔ یہ بہت حوصلہ افزا اقدام ہے اور اس میں افریقی ایشیائی اتحاد کی ہر ممکن کوشش کی جارہی ہے۔ مولانا بھاشانی صاحب نے بھی اس قسم کے اقدامات کی تلقین کی ہے۔ اگرچہ مجھے یہ دیکھ کر دکھ ہوا ہے کہ مولانا کی زبانِ مبارک سے کسی اسلامی اقتصادی کانفرنس کے انعقاد کے لیے ایک لفظ تک بھی نہیں نکلا۔ بہرصورت اس کانفرنس کے انعقاد سے میرا یہ موقف تو ثابت ہو گیا کہ ہم خود بھی اِس بات کے قائل ہو گئے ہیں کہ ملکی نظریۂ قومیت کے باوجود وسیع تر بین الاقوامی تنظیم ممکن ہے، بلکہ اس پر دنیا کے مختلف ممالک، مختلف دائروں اور مختلف درجوں پر ہمارے یہاں بھی عمل ہونا شروع ہو گیا ہے۔ خدا کرے کہ مسلمانوں کو اپنی حقیقی اور قدرتی برادری کی بنیادوں پر بھی منظم ہونے کا خیال پیدا ہو!

اگر اسلامی دنیا متحد ہو کر غیر جانب داری کا رویّہ اختیار کرے تو اس کا ایک علیحدہ بلاک ایسا قائم ہو سکتا ہے جو طاقت بھی رکھتا ہو گا اور اثر بھی۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اس وقت یو۔ این۔ او میں ہماری تعداد ایک تہائی کے قریب ہے۔ ہمارا محلِ وقوع، معدنی وسائل اور مَین پاور ایسی ہے کہ متحد دنیائے اسلام کی بات کو آسانی سے رَد نہیں کیا جا سکتا۔ ہمیں ان دونوں بلاکوں سے کوئی رُوحانی یا تاریخی یا ذہنی تعلق نہیں ہے۔ ہم ان کے نظاموں سے کلیتہً اتفاق نہیں کرتے۔ ہمارا راستہ درمیانی ہے۔ ہم امتِ وسطیٰ ہیں۔ ہمیں دنیا میں فساد پیدا کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ ہم دنیا میں کسی کی تکلیف دہ برتری نہیں چاہتے۔ ہم دنیا میں امن و انصاف چاہتے ہیں۔ ہم اپنا بلاک اِس واسطے نہیں بناتے کہ ہماری خود غرضی اس میں پنہاں ہے، بلکہ ہم اس واسطے یہ بلاک بناتے ہیں کہ دنیا کو باہمی آشتی، صلح جوئی، امن اور ترقی کا پیغام دے سکیں۔

مَیں نے ایک دَولتِ مشترکہ کی تجویز کی ہے۔ بعض دوست اس کا نام یونائیٹڈ اسٹیٹس آف اسلام تجویز کرتے ہیں۔ نام کچھ بھی ہو بہرصورت لچک دار تنظیم ہونی چاہیے۔ کسی کو کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ یو۔ این۔ او کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ اِس قسم کی تنظیم ہم بھی کر سکتے ہیں۔ ہر ایک چھوٹے

بڑے ملک کو یکساں نمائندگی ہو، بلکہ چھوٹے ملک ہی شروع میں تنظیم کے صدر اور افسر مقرر ہوں۔ ہم غیروں کی دولتِ مشترکہ میں رہ کر خوش رہ سکتے ہیں تو اپنے بھائیوں سے مل کر کام کرنے کا تو اور بھی لطف آئے گا۔ ہماری اغراض بھی رُوحانی طور پر مشترکہ ہوں گی اور ہماری ساری کوشش اللہ اور اس کے رسول برحق کی خوشنودی حاصل کرنے میں صرف ہوگی۔

غیر جانب داری کی قدر ہم نے گزشتہ دس سالوں میں کافی طور پر دیکھ لی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ساری مسلم دنیا غیر جانب داری کا اعلان کر دے تو اس کا دونوں بلاکوں پر بہت ہی اچھا اثر پڑے گا اور بہت ممکن ہے کہ تیسری اور شاید آخری تباہ کن جنگ کا خطرہ واقعی ٹل سکے۔ یہ بات کسی حد تک باعثِ اطمینان ہے کہ بعض اسلامی ملکوں کے سربراہوں نے اسی قسم کی دولتِ مشترکہ یا اتحادی تنظیم کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ شاہ سعود نے، ٹنکو عبدالرحمان نے، سر احمد بیلو (شمالی نائیجیریا کے وزیر اعظم) نے صومالی ریپبلک کے وزیرِ اعظم عبدالرشید علی شرمارک نے خود ہمارے اپنے صدر محترم نے وقتاً فوقتاً اتحاد عالم اسلامی کی طرف توجہ دلائی ہے، لیکن افسوس ہے کہ ان مسلمان حکومتوں کی طرف سے کوئی منظم کوشش ظہور میں نہیں آرہی، جس سے معلوم ہو کہ کوئی عملی کام شروع کر دیا گیا ہے۔ کل ہی بزرگ رہنما حضرت سید امین الحسینی مفتیٔ اعظم فلسطین نے بھی اسی قسم کے اتحاد پر زور دیا ہے۔ وہ موتمر عالمِ اسلامی کے محترم صدر اور اس کے رُوح رواں ہیں۔ مکہ معظمہ میں رابطۂ عالمِ اسلامی کی تحریک شروع ہو چکی ہے۔ قاہرہ میں اسلامی کونسل بہت ہی مفید اور عملی کام کر رہی ہے۔ غالباً اسی قسم کی اور تحریکیں دیگر ممالکِ اسلامیہ میں بھی ہوں گی جن کا ہمیں علم نہیں ہے۔ بہر صورت اب معلوم ہوتا ہے کہ وہ وقت آن پہنچا ہے کہ دنیائے اسلام کے دل میں پھر ایک بار یک جہتی، اتحاد اور سرفرازی کی تڑپ پیدا ہوئی ہے۔ کسی کے دکھ درد میں ہمدردی کا ایک لفظ کہنے سے اس کا دل موہ لیا جا سکتا ہے۔ مومن کا دل بہت نرم ہے۔ حال ہی میں قبرص کے مسلمانوں کے متعلق میں نے ایک اخباری بیان دیا ہے۔ قبرص کے ٹرکش کمیونل چیمبر سے جو جواب آیا ہے، اس کا اقتباس سنیے۔ یہ موجودہ زمانے کے ان ترکوں کا نظریہ ہے جن کے متعلق ہم کو بتایا گیا ہے کہ وہ مذہبِ اسلام کو خیرباد کہہ چکے ہیں۔ (یاد رہے یہ بالکل غلط پروپیگنڈا ہے۔ جتنی عظمت اسلام کی اور جتنی محبت مذہب کی ترک عوام کے دل میں پائی جاتی ہے، اس کی مثال ملنی مشکل ہے) یہ خط زمانۂ حال کے یورپین قسم کی ترک جماعت کا ردِ عمل ہے۔

"میرے پیارے اسلامی بھائی"۔ آگے لکھتے ہیں "کہ مسلم برادری کا نام ہی دل میں ایک تڑپ پیدا کر دیتا ہے ... خدا کرے آپ کی جماعت جو قرآنِ پاک کی تعلیم پر عمل کر رہی ہے۔ دن بدن

طاقت پکڑے۔ ہم نے آپ کے بیان کو اپنے اخباروں میں چھاپا ہے... ہمیں یقین ہے کہ سب سے سچے مذہب اسلام کی نیک تعلیم آخر کار تمام عالمِ اسلامی کو متحد کرنے میں کام یاب ہوگی"

حال ہی میں مفتیٔ اعظم فلسطین کی ایک دعوت میں جو انھوں نے بیروت میں دی تھی، جب میں گزشتہ جولائی میں وہاں گیا تھا۔ ایک مشہور لبنانی مسلم وکیل نے مجھ سے کہا "پاکستان کو خدا نے بڑا موقع دیا تھا کہ وہ اسلامی دنیا کو اکٹھا کر سکے، مگر آپ نے اس فریضے کی طرف توجہ نہیں دی"۔ مَیں نے جواباً عرض کیا کہ پاکستان کا دل و جان اِس کام کے لیے حاضر رہا ہے اور حاضر ہے اور انشاءَاللہ ہم اس کام کو سرانجام دیں گے۔

حضرات! میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ قوموں کو ایسا موقع کبھی نہ کبھی ملتا ہے کہ وہ دنیا میں اپنی تقدیر پلٹ سکیں۔ میری رائے میں وہ موقع آگیا ہے۔ اگر اس وقت ہم نے اپنا فرض ادا کرنے میں کوتاہی کی تو پھر شاید یہ موقع صدیوں ہی ہاتھ نہ آئے اور ہم فارسی شاعر کے قول کے مصداق بن کر رہ جائیں ؎

رفتم کہ خار از پا کشم، محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دُور شد

شامِ ہمدرد - لاہور
۵ر دسمبر ۱۹۶۳ شمسی



حکیم محمد عبداللطیف فلسفی

[شام ہمدرد کراچی ، دسمبر ، ۱۹۶۳ شمسی]

شفاء الملک

حکیم عبدُاللطیف فلسفی

۲۹ر اپریل ۱۹۰۱ ش

تحقیقاتِ طبیہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر مختلف انداز سے غور و فکر کیا جا سکتا ہے۔ ایک تو طریقۂ تحقیقِ قدیم ہے جس میں مشاہدات کی سب سے زیادہ اہمیت ہے اور جس میں جسمِ انسانی کو نمایاں و مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ دواؤں کے تجربات جسمِ انسانی پر کیے جانے کی ضرورت پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ قدما کا اندازِ فکر اور طرزِ تحقیق یہی رہا ہے اور اسی کی بدولت ہمیں وہ علم حاصل ہوا ہے جسے طبِ قدیم یا طبِ مشرقی ہم کہتے ہیں۔ مسلمانوں کے زوال کی داستان بڑی طویل ہے۔ یہ زوال اِس انداز و رفتار سے شروع ہوا کہ مسلمانوں کے علوم و فنون ان کے ہاتھوں سے نکلتے چلے گئے اور بالآخر مغرب پہنچ گئے اور مسلمان ہر اعتبار سے تہی دست اور تہی دامن رہ گئے، حتّٰی کہ آج کا دَور آیا ہے کہ مسلمان اتنا بھی نہیں جانتے کہ ان کے معلّمین کون تھے اور ان کے علوم و فنون کا عالم میں کیا مقام تھا۔

اِدھر مسلمان ذہنی اعتبار سے اِس قدر پس ماندہ ہو گئے اور اپنے ماضی اور اپنی روایات اور اپنے علوم و فنون سے منقطع ہو گئے، اُدھر یورپ مسلمانوں ہی کے علوم و فنون سے مالا مال ہو گیا اور اس نے ٹوٹے ہوئے تاروں کو جوڑ لیا اور مسلمانوں کے ورثے سے کامِلاً استفادہ کر کے ایسے محیر العقول کارنامے ہر شعبۂ علم میں انجام دیے کہ مسلمان کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں اور اِس خیرگی نے اسے باقی ماندہ ادراک سے بھی محروم کر کے رکھ دیا اور اب وہ اپنی چیز کو اپنی کہنا بھی پسند نہیں کرتا۔

دنیائے طب میں انقلاب خیال و فکر اُس وقت آیا کہ جب طب نے فن کے بجائے پیشے کی حیثیت اختیار کر لی اور تجارتی اغراض و مقاصد نے اس میں دخل دے دیا۔ ایک طرف یہ اور دوسری طرف شوقِ تجدید ان دونوں نے مل کر طبی دنیا میں ایک انقلاب پیدا کیا اور علمائے طبِ جدید نے پیدائشِ امراض، اسبابِ امراض وغیرہ میں کلیّۃً جراثیم کو دخیل کر دیا۔ اس کی بِنا پر طریقِ علاج میں ایک انقلاب آیا اور اب درستیِ مزاج اور توازنِ اخلاط کی جگہ جراثیم کُشی نے لے لی اور جراثیم کش دواؤں نے اعلا مقام حاصل کر لیا۔

اسبابِ مرض کے باب میں اِس انحرافِ قطعی نے طبِ قدیم اور طبِ جدید کے دو طبقے پیدا کر دیے اور ان دونوں طبقوں کے داعی مضبوط دلائل و شواہد کے ساتھ میدانِ عمل میں آگئے اور متحارب بھی ہو گئے۔ طبِ قدیم کی افادیت اور بے ضرری کے لیے ایک ہزار سال کی تاریخ موجود ہے اور طبِ جدید کی افادیت کے لیے بھی شواہد کی کمی نہیں ہے مگر اس کے ساتھ ہی طبِ جدید کی ضرر رسانی سے طبی لٹریچر بھرا پڑا ہے اور یہ لٹریچر اتنا زیادہ ہے کہ جس کی مثال تاریخ طب میں اور کہیں نہیں ملتی۔ اس تعارف میں اِس موضوع پر بحث مقصود نہیں ہے، بلکہ یہ بتانا ہے کہ آج کے مہمان مقرر پہلے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں اور اسی موضوع پر آج ان کا خطاب ہے۔

حکیم عبداللطیف فلسفی صاحب دنیائے طب کی بڑی نامور شخصیت ہیں۔ ۲۹ر اپریل ۱۹۰۱ء میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے۔ اپنے والد حکیم عبدالوحید صاحب کے سایۂ عاطفت سے ابتدائے زندگی ہی میں محروم ہو گئے۔ ان کی تربیت ان کے بڑے بھائی شفاء الملک حکیم عبدالمعید صاحب نے کی۔ اُردو، فارسی اور عربی اور منطق و فلسفہ کی تعلیم کے بعد انھوں نے تکمیل الطب کالج لکھنؤ میں طب کی تعلیم حاصل کی اور پھر اسی کالج میں مدرّس کی حیثیت سے مامور ہوئے۔

حکیم فلسفی صاحب نے متعدد مضامین اور کتابیں لکھی ہیں، مثلاً مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں صاحب کے رسالہ القول المرغوب فی الماءِ المشروب کے جواب میں التحقیق المطلوب فی الماءِ المشروب، تحقیق المقال فی تعریف الاعتدال، کتاب النبض، طب اور سائنس، قدیم تشریح و منافع کی تاریخ، قدیم سرجری کی تاریخ، مزاج، کافور، بحران غذائے مطلق کا وجود، حمّیٰ دقّیہ کے مادّی ہونے کا ثبوت، یونانی نسخوں میں شربت کا راز وغیرہ۔

حکیم فلسفی صاحب طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی میں پروفیسر رہے ہیں۔ آج کل ادارۂ ہمدرد کے قائم کردہ جامعہ طبیہ (دہلی) میں شیخ الجامعہ ہیں۔ حکیم صاحب طبی سیاست میں اہم مقام رکھتے ہیں اور اپنی متوازن پالیسی کی وجہ سے ہر جگہ مشیر کی حیثیت سے شریک ہوتے ہیں۔

طبیعت بڑی اچھی پائی ہے۔ احباب کا حلقہ بڑا وسیع ہے۔ مصوّری اور موسیقی سے لگا کر پہلوانی اور بنوّٹ تک کا شوق رکھتے ہیں۔ چونسٹھ کی عمر میں جوان ہیں۔ قابلِ قدر اور لائقِ تقلید ہیں ایسی شخصیتیں۔

محمد سعید

تحقیقاتِ طبیّہ

شفاءُ الملک حکیم محمدؐ عبداللطیف فلسفی

سُنے گا اقبال کون ان کو یہ انجمن ہی بدل گئی ہے
نئے زمانے میں آپ ہم کو پُرانی باتیں سُنا رہے ہیں

لیکن میں کیا کروں، مجبُور ہوں۔ قوانینِ فطرت کی خلاف ورزی کیسے کرسکتا ہوں۔ تمام نیچرل لاز پرانے، ہم پُرانے اور آپ پُرانے، پھر باتیں نئی کیسے سُناؤں۔ دیکھیے انسان پُرانا ہے، اس کی پیدائش کا طریقہ پُرانا۔ نئے ڈھنگ کی پیدائش کیسے بیان کروں۔ چاند اور سُورج نئے کہاں سے لاؤں۔ آگ، ہَوا، پانی، مٹّی نئی کہاں سے لاؤں۔ آپ کی نئی غذا کہاں سے فراہم کروں۔ موت وحیات کے پُرانے سلسلے کو کیسے منقطع کروں۔ یہ سب قوانینِ قدرت پُرانے اور اٹل ہیں ان میں کیسے ترمیم کروں؟

ہمارا کام زندگی کے فوراً بعد شروع ہوجاتا ہے اور موت سے قبل ختم ہوتا ہے۔ نقطۂ حیات سے نقطۂ ممات تک جو مسافت ملتی ہے، یہی ہماری مساعی کا گہوارہ ہے۔ اِسی میں ہم پھلتے پھُولتے بھی ہیں اور ٹھوکریں بھی کھاتے ہیں۔ اس مسافت کو جتنا بھی ہم طویل کرسکیں ہمارا کمال ہے اور جتنی یہ مدت بادِ مخالف کے جھونکوں سے جلد طے ہوجائے، وہ ہمارا نقص ہے۔ بادِ مخالف کے جھونکوں کے مقابل ہماری حیثیت ایک مردِ مجاہد کی ہوتی ہے جس میں کبھی ہم غازی اور کبھی شہید بن جاتے ہیں۔

فلسفۂ موت وحیات پر اگر غور کیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ یہ ایک اعتباری چیز ہے۔ محض صورتوں کے تغیر کا نام موت وحیات ہے۔ ہر فنا میں ایک بقا ہے اور ہر بقا میں ایک فنا۔ ہر عدم میں ایک وجود اور ہر وجود میں ایک عدم اور ہر حیات میں ایک موت اور ہر موت میں ایک حیات مضمر ہوتی ہے۔ ہر تعمیر میں کسی کی تخریب اور ہر تخریب میں کسی کی تعمیر ہوتی ہے۔ تخریب کی دُنیا اگر گریہ وبکا میں مبتلا ہوتی ہے تو تعمیر کی دُنیا میں خوشی کے شادیانے بجتے ہیں۔ اگر نباتات وحیوانات

کو موت کے گھاٹ اتار کر اس سے غذا حاصل کی جاتی ہے تو ان کی تخریب اور موت سے ایک دوسری تعمیرِ حیات حاصل ہوتی ہے۔ مثلاً یہی نباتات، اخلاط اور پھر اعضا اور پھر انسان کی صورت اختیار کرتے ہیں اور اسی خون سے منی اور حویطہ منی بنتے ہیں اور جب یہ فنا ہوتے ہیں تو ایک دوسرے انسان کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ حیوانات و نباتات کی دنیا میں جب تخریب ہوتی ہے تو وہاں غم کے بادل چھا جاتے ہیں ، لیکن اس انسانی دنیا میں مسرت کی لہریں دوڑتی ہیں اور جب یہ انسان فنا ہوتا ہے اور اس پر موت طاری ہوتی ہے تو اس کی دنیا میں رنج و الم کی گھٹائیں چھا جاتی ہیں لیکن اس کے سڑنے گلنے سے جو کیڑے پیدا ہوتے ہیں ان کی دنیا میں خوشی کے گیت گائے جاتے ہیں۔

اِس مسئلے پر گہری نظر ڈالی جائے تو نظریۂ ارتقا، جس کی مدت ڈارون کے نزدیک ہزاروں سال کی ہے، یہاں چند سال میں نظر آجاتی ہے۔ عناصر سے نباتات، نباتات سے حیوانات، حیوانات سے انسان چند سال میں پیدا ہو جاتا ہے۔

انسان کی حیات و موت کی درمیانی مدت میں کچھ تغیرات نظر آتے ہیں بعض تغیرات تو طبعی ہوتے ہیں، مثلاً بچپنا، پھر جوانی، پھر ادھیڑپن، پھر بڑھاپا وغیرہ وغیرہ۔ اور بعض غیر طبعی حالات وقتاً فوقتاً رونما ہو جاتے ہیں۔ یہ غیر طبعی تغیرات تین قسم کے ہوتے ہیں کبھی مزاج میں تبدیلی یعنی سوئے مزاج۔ کبھی ترکیب اعضا میں خلل، کبھی اتصالِ اعضا میں تفرق۔

اب ہمارا کام یہیں سے شروع ہو جاتا ہے یعنی ان بگڑے ہوئے حالات کو سدھارنا اور انسان کو طبعی حالات پر قائم رکھنا۔ یہ ہمارا فرض ہوتا ہے۔ اِس کے لیے ہمارے واسطے ضروری ہو جاتا ہے کہ ان کے اسباب و علل کا پتہ چلائیں۔ اسباب کا سُراغ لگانے سے پتا چلتا ہے کہ وہ بھی تین ہی قسم کے ہوتے ہیں: اسباب بادیہ (خارجی اسباب)، اسباب سابقہ اور اسباب واصلہ (داخلی)۔

لیکن جب ہم ان اسباب پر گہری نظر ڈالتے ہیں اور تجربے و مشاہدے کو اپنا رہ نما بناتے ہیں تو ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ بعض انسانوں میں ان اسباب کے موجود ہوتے ہوئے وہ غیر طبعی حالات کا اصلی سبب قوتِ مدافعت کا ضعف ہوتا ہے جو اس کے اجزائے ترکیبی یعنی عناصر کے اعتدال سے پیدا ہوتا ہے، جس کو دوسرے الفاظ میں مناعت (امیونٹی) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

مشرقی طب کا فلسفۂ علاج حقیقت میں اس مناعت اور قوتِ مدافعت کو تقویت پہنچا کر حالاتِ غیر طبعی کو زائل کرنا ہوتا ہے جس کو قوانینِ فطرت (نیچرل لاز) کے ذریعے سے اعتدال پر لایا جاتا ہے اُن عناصر کے اعتدال کو برقرار رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے، جس کی وجہ سے قوتِ مدافعت قوی ہو کر بیماریوں کو زائل کر دیتی ہے۔

اِن قوانینِ فطرت کے ذریعے سے علاج کے مختلف طریقے ہیں: علاج بالغذا، علاج بالدّوا، علاج بالید، علاج بالتدبیر، سورج کی شعاعوں کے ذریعے علاج، غسل کے ذریعے علاج، بالو کے ذریعے علاج، ورزش کے ذریعے علاج، رنگوں کے ذریعے علاج، سونے، جاگنے، کھانے پینے، استفراغ و احتباس وغیرہ کے ذریعے علاج، گرمی، سردی، خشکی تری کے ذریعے وغیرہ وغیرہ علاج کیے جاتے ہیں۔
مشرقی طب کا طریقۂ علاج نیچرل لاز پر مبنی ہے جو اٹل ہیں۔ یہ ایک مستقل طریقۂ علاج ہے، جو کسی دوسرے طریقۂ علاج میں مدغم نہیں ہو سکتا۔
جس طرح ہومیوپیتھی، کروموپیتھی اور ہائڈروپیتھی اپنی اپنی جگہ مستقل طریقہ ہائے علاج ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ مدغم نہیں کیے جاسکتے ہیں، اِسی طرح طبِ مشرقی ایک اپنی ذاتی حیثیت رکھتی ہے، جو ادغام کی متحمل نہیں ہوسکتی۔
ہمارے ملک کی یہ بڑی خوش قسمتی ہے کہ ہماری جان بچانے کے لیے مختلف علاج کے طریقے موجود ہیں۔ اگر ایک سے جان نہیں بچتی تو دُوسرے طریقۂ علاج سے قسمت آزمائی کی جاتی ہے اور کسی نہ کسی سے زندگانی کا سہارا مل جاتا ہے۔ وہ ملک انتہائی بدقسمت ہیں جہاں صرف ایک ہی طریقۂ علاج پر زندگی و موت کا دار و مدار ہے۔
مشرقی طب کی ترقی کے متعلق یہ خواب کہ ایلوپیتھی مضامین اس کے ساتھ پڑھائے جائیں۔ نہ اب تک شرمندۂ تعبیر ہوا ہے اور نہ کبھی آئندہ امید کی جاسکتی ہے، کیوں کہ دونوں طبوں کے اصول اور لائن آف ریسرچ بالکل جُدا جُدا ہے۔ اگر اسی لائن کے اوپر طب کی ترقی دیکھنا ہے تو ایلوپیتھی آپ کے سامنے موجود ہے، آپ اس کی پرستش کریں اور مشرقی طب کو خیرباد کہہ کر اس جنجال سے پیچھا چھڑائیں کیوں کہ ایلوپیتھی وہی پرانی ویدک اور یونانی طب سے نکلی ہوئی ایک صورت ہے جو جدید سائنسی اصُولوں پر معراجِ ترقی پر چڑھائی گئی ہے۔ اب اس لائن پر از سرِ نو اپنا دماغ کھپانا وقت اور رُپے کو ضائع کرنا، ایک فعل عبث اور تحصیل حاصل ہے۔ لیکن طبِ مشرقی کی لائن آف ریسرچ ایلوپیتھی کی طرح کیمیائی تحلیل و تفریق پر مبنی نہیں ہے، بلکہ نیچرل لاز کے تحت مشاہدے اور تجربے پر اس کی بنیاد ہے۔ مثال کے طور پر عورتوں کے حمل کا امتحان کرنے کے لیے ایک کیمیائی طریقہ ہے جو کیمیائی لیبوریٹری میں انجام دیا جاتا ہے اور ایک طریقہ "ہیگر سائن" ہے یعنی رحم کے منھ کا انگلی سے مُعائنہ کرنا اور ہونٹ کے مانند اگر اس میں نرمی پائی جاتی ہے تو فقدانِ حمل ہے۔ ہماری لائن آف ریسرچ کا یہ آخری امتحان ہے۔ ایسی تمام چیزیں جو ہماری لائن آف ریسرچ کے مطابق پائی جاتی ہیں وہ سب ہمارے فن کے اندر شامل ہوسکتی ہیں اور اِسی قِسم کی تحقیقات کا کام ہم کو شروع کرنا چاہیے اور یہی ہمارے فن کی اصلی ترقی متصوّر ہوگی۔

جدید تحقیقات اور جدید ریسرچ کو یورپ کی تحقیقات میں محدود سمجھنا یا ہر مسئلے کی صداقت کی کیمیائی تحلیل سے سند حاصل کرنے کی کوشش کرنا بڑی تنگ نظری ہے۔

علمی تحقیقات کے مختلف پہلو ہوتے ہیں، جو مختلف علوم و فنون سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے دنیا میں مختلف علوم و فنون کا وجود باقی ہے۔ باوجود کیمیائی تحلیل و تفریق کے فزکس، باٹنی، زوآلوجی، جیالوجی، فلاسفی، میٹافزکس، جغرافیہ وغیرہ وغیرہ تمام علوم موجود ہیں۔ اگر کیمسٹری ہی سے تمام مسائل حل ہو جاتے تو ان علوم و فنون کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

پھر یہ بھی ایک مغالطہ ہے کہ ریسرچ ایف۔ ایس سی پاس طلبا یا ایم۔ بی۔ بی۔ ایس ڈاکٹر کر سکتے ہیں یا کچھ ایلوپیتھی پڑھے ہوئے اطبا کر سکتے ہیں، کیوں کہ ریسرچ ایک ایسی دشوار گزار منزل ہے کہ اس پر عبور کرنا ان لوگوں کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لیے علومِ قدیمہ اور علومِ جدیدہ کی انتہائی قابلیت اور پھر لگن اور دماغ میں نئی چیز سوچنے کی اپج ہونا ضروری ہے۔ بغیر اس کے موتی ہاتھ آنا کوئی کھیل نہیں ہے۔

شامِ ہمدرد۔ کراچی
دسمبر ۱۹۶۳ شمسی



حکیم محمد سعید دہلوی

حکیم محمد سعید دہلوی

۹ جنوری ۱۹۲۰ شمسی

شامِ ہمدرد میں پہلے میں اختتامی کلمات کہتے ہوئے آپ کا شکریہ ادا کرنے کا فرض بجالاتا تھا۔ آج ایک رسم ادا کرنے کے لیے کھڑا ہوں۔ وہ رسم یہ ہے کہ جناب حکیم محمد سعید دہلوی کا تعارف کراؤں۔ بہت سی شخصیتوں کا تعارف کرانا فرض کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ مشہور ہو کر بھی بہت سی باتوں میں عوام کی نگاہ سے اوجھل ہوتے ہیں۔ ضرورت ہوتی ہے کہ ان کی شخصیت پر پڑے ہوئے دبیز پردوں کو ایک ایک کرکے اتار دیا جائے۔ مگر حکیم سعید صاحب کے لیے یہ تعارفِ رسم اس لیے ہے کہ ان کی زندگی کا کوئی گوشہ پردۂ اخفا میں نہیں، وہ کھلی ہوئی کتاب کے مانند ہیں۔ انھوں نے ہمدرد ہی کو ٹرسٹ کے حوالے نہیں کیا، اپنے آپ کو بھی قومی ملکیت بنادیا ہے۔ اب ایسی شخصیت کا تعارف کرانا، تعارف کا منہ چڑانا نہیں تو اور کیا ہے؟

حکیم صاحب کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں۔ وہ حیران کن حد تک بہت سی متخالف و متصادم صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ وہ سات گھنٹے روزانہ مطب کرنے والے طبیب بھی ہیں، ایسے طبیب کہ اب تک کم از کم سات لاکھ مریضوں کی نبض دیکھ چکے ہیں۔ وہ مدیر بھی ہیں اور ایسے لائق اور محنتی مدیر کہ اس وقت اردو، بنگالی، انگریزی اور فارسی زبانوں میں شائع ہونے والے آٹھ کثیر الاشاعت رسائل و جرائد ان کی ادارت میں باقاعدگی سے جاری ہیں۔ وہ ایک بالغ نظر مصنف بھی ہیں اور ان کی کتاب "یورپ نامہ" علمی، طبی اور ادبی حلقوں سے خراجِ تحسین وصول کر چکی ہے۔ وہ اعلا درجے کے منتظم بھی ہیں اور اس کا بیّن ثبوت یہ ہے کہ اس وقت کراچی، لاہور، ڈھاکہ اور راولپنڈی میں ہمدرد کے شان دار مراکز قائم ہو چکے ہیں اور روز بروز یہ سلسلہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جارہا ہے اور ان مصروفیات کے ساتھ ساتھ وہ ایک اَن تھک سیّاح بھی ہیں، ایسے سیّاح کہ اسلامی ممالک کے علاوہ یوگوسلاویہ، آسٹریا، سوئٹزرلینڈ، جرمنی، ہالینڈ، انگلینڈ، فرانس، اسپین، اٹلی، یونان میں سے کوئی خطہ اُن کی سیاحانہ تگ و تاز سے محفوظ نہیں رہ سکا۔

حکیم صاحب کی شخصیت کے ایک اور پہلو کی طرف بھی اشارہ کرنا چاہتا ہوں جو بیک وقت عیب بھی ہے اور خوبی بھی۔ میں حکیم صاحب کا ایک دیرینہ نیاز مند ہوں، مگر مجھے شکایت ہے کہ

میرے ذہن میں ان کے جو خدّوخال تھے۔ ان کا نقشہ ان سے ملتے ہی درہم برہم ہوگیا۔ میرا خیال تھا کہ حکیم حافظ حاجی محمد سعید دہلوی ایک معمّر بزرگ ہوں گے۔ ایک ہاتھ میں عصا ہوگا دُوسرے ہاتھ میں تسبیح ہزار دانہ۔ چہرے پر سفید نورانی داڑھی بہار دکھا رہی ہوگی۔ عبا قبا میں ملبُوس ہوں گے۔ فربہی ایسی ہوگی کہ اس پر آماس کا شبہ ہوگا۔ مگر اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔
حکیم صاحب کو دیکھ کر یہ خیالی محل آناً فاناً دھڑام سے زمین پر آرہا۔ یا للعجب! سر سے پاؤں تک ایک سفید پوش نوجوان! نہ عبا نہ قبا نہ عصا۔ نہ لحیم نہ شحیم نہ ضخیم نہ جسیم، کچھ بھی تو نہیں۔ میں اپنے خیالی نقشے میں ترمیم کے لیے تو تیار تھا، مگر تنسیخ کے لیے نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ میں آج تک ”بصیرت و بصارت“ کے اِس اختلاف میں مصالحت کی کوئی صورت نہیں نکال سکا۔ مجھے اب بھی اصرار ہے کہ انھیں بوڑھا ہونا چاہیے مگر حکیم صاحب کو ضد ہے کہ وہ نوجوان ہیں اور نوجوان ہی رہیں گے۔ یہ اسی ضد کا کرشمہ ہے کہ وہ روز بروز نوجوان سے نوجوان تر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ گرمی ہو یا سردی ان کے لباس سے یوں شبہ ہوتا ہے جیسے سنگِ مرمر کا ترشا ہوا ایک جیتا جاگتا مجسّمہ ہماری نگاہوں کے سامنے ہے۔ گرم کپڑوں کے باوجود جاڑوں میں ان کا لباس دیکھ کر مجھ پر ہمیشہ کپکپی طاری ہوجاتی ہے۔
حکیم صاحب کی سیاحت کا ذکر ہوچکا —— ان کی با مقصد سیاحت کا تازہ ترین نمونہ ان کا دَورۂ چین ہے۔ یہ دورہ خالصتہً غیر سرکاری تھا مگر اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک اسے جو اہمیت حاصل ہے وہ بڑے بڑے مشہور سرکاری دَوروں کو بھی حاصل نہیں ہوسکی۔ چین ہمارا پڑوسی ملک ہے اور ہماری نئی اور آزاد پالیسی کی وجہ سے وہ ہمارے قریب آتا جا رہا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ حکیم صَاحب کے اِس دورے نے پاکستان اور چین کے عوام کو پہلے سے زیادہ قریب تر کردیا ہے۔
حکیم صاحب نے چین میں کیا دیکھا، کِس زاویے سے دیکھا، کس لیے دیکھا اور کیسے دیکھا۔ یہ سَاری داستان سننے کے قابل ہے۔ پاکستانی قوم ایک زندہ و بیدار قوم کی روداد عمل سن کر کچھ سیکھ سکتی ہے۔ ہمیں ہمیشہ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ رسولِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق ہر اچھی بات مومن کی گمشدہ متاع ہے اور وہ اسے جہاں پاتا ہے اخذ کرلیتا ہے۔
میں تعارف کی رسم سرسری طور پر ادا کرچکا مگر آخر میں یہ روایتی فقرہ کہنے کی رسم ہرگز ادا نہیں کروں گا کہ ”میں آپ کے اور حکیم صَاحب کے درمیان زیادہ دیر تک حائل نہیں رہنا چاہتا“ حکیم صاحب اور آپ کے درمیان تو دیوارِ چین بھی حائل نہیں ہوسکی بھلا میں کیا حائل ہوسکتا ہوں۔ لہٰذا اب میں حکیم صاحب سے درخواست کروں گا کہ وہ تشریف لائیں اور آج کے چین سے متعلق اپنے تاثرات سے آپ کو مستفید فرمائیں۔

کوثر نیازی

سفرِ چین
طبِّ چینی

حکیم محمد سعید دہلوی - مدیر ہمدرد

خواتین و حضرات!

آج کی اِس تقریب میں جو دعوت نامہ کارکنانِ ہمدرد نے جاری کیا ہے اس میں مجھے سیاح لکھ دیا ہے۔ میں بار بار سوچتا ہوں اور سیاح کے معنی اور تعریف پر غور کرتا ہوں تو مجھے یہ لفظ اپنے اوپر چسپاں کرنے کا کوئی جواز نظر نہیں آتا اور سیاح ہونے کی کوئی بات اپنے میں نہیں پاتا۔ خاص طور پر جب مجھے مشہور چینی مصنف لین۔ یوتانگ کا یہ قول یاد آتا ہے کہ سیاحت کی رُوح یہ ہے کہ اُس کے فرائض کچھ نہ ہوں، وہ مقررہ وقت کا پابند نہ ہو، اپنی ڈاک سے بے نیاز ہو، دخل در معقولات کرنے والے ہمسایوں کی دست رست میں نہ ہو، اُس کے پاس ملنے والے وفد نہ آئیں اور اس کی منزل کوئی نہ ہو۔ سچا سیاح وہ ہے جسے یہ معلوم نہ ہو کہ وہ کہاں جائے گا، اور مکمل سیاح وہ ہو سکتا ہے، جسے یہ بھی معلوم نہ ہو کہ وہ کہاں سے آیا ہے۔ وہ تو اپنا نام اور لقب بھی بھول جاتا ہے۔

اِس قول کی روشنی میں تو میں اپنے کو کسی حیثیت سے بھی سیاح نہیں پاتا، کیونکہ جیسا کہ آگے چل کر آپ سے عرض کروں گا ہمارے فرائض تھے اور بہت کچھ تھے، بلکہ ان فرائض کو پورا کرنے کے جذبے ہی نے ہمیں یہ طول طویل سفر کرنے پر مجبور کیا تھا۔ ہم مقررہ وقت کے بھی پابند تھے۔ ہم نے خود بھی اپنے آپ پر پابندیٔ وقت عائد کر رکھی تھی اور ہماری میزبان اور مہربان حکومتِ چین نے بھی بہت باقاعدہ نظامِ اوقات ہمارے آنے جانے، ملنے جُلنے، گھومنے پھرنے اور مجلسوں میں شریک ہونے کا بنا رکھا تھا۔ ہم اپنی ڈاک سے بے نیاز نہ تھے۔ احباب و اعزا ہمیں یاد کرتے تھے اور ہمیں

بھی ان کی یاد آتی تھی۔ دخل در معقولات کرنے والے ہمسایوں کی زد سے ہم ضرور باہر تھے، ویسے بھی اللہ کا شکر ہے کہ کم از کم میری اپنی حد تک مجھے ہمسائے بھلے ہی ملے ہیں۔ واضح رہے کہ یہاں میرا کوئی ہمسایہ موجود نہیں ہے۔ لین۔یو۔تانگ نے سچا سیّاح اسے بتایا ہے جسے یہ نہ معلوم ہو کہ وہ کہاں جائے گا تو حضرات میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مجھے یہ معلوم ہی نہیں، بلکہ اچھی طرح حفظ تھا کہ بیکنگ سے نانکنگ شنگھائی ھانگ چاؤ کینٹس ہانگ کانگ کیون منگ جانا ہے اور مکمل سیّاح کی تعریف لین۔یو۔تانگ نے یہ کی ہے کہ جسے یہ بھی معلوم نہ ہو کہ وہ کہاں سے آیا ہے اور وہ اپنا نام اور لقب بھی بھول جائے۔ اِس پہلو میں ذرا سی گنجائش شبہ کی نکل آئی ہے کیوں کہ دورانِ سفر میں بہت مقامات اور بہت سے لوگوں نے میرے ذہن کو اس طرح جذب کرلیا ہے کہ میں واقعی سب کچھ بھول گیا اور اتنا محو ہوگیا کہ مجھے کچھ یاد نہ رہا۔ شاید اسی پہلو کو آج کے داعیوں نے بھانپ لیا اور لے اڑے۔ بہرحال میں سیّاح ہوں یا نہ ہوں، آپ کو ضرور اپنی دید و شنید سناؤں گا اور آپ کے صبر و تحمل کا امتحان لوں گا۔

خواتین و حضرات!

آپ متوقع ہوں گے کہ میں چین اور چینی عوام کے متعلق اپنے تاثرات بیان کرنا شروع کر دوں۔ تاثر مبنی ہوتا ہے مشاہدے پر۔ اور مشاہدے کی بنیاد دلچسپی ہے۔ ہر آدمی کی دلچسپیاں، چاہے وہ کتنی ہی وسعت رکھتی ہوں، پھر بھی محدود رہتی ہیں اور دلچسپیاں محدود ہونے کا واضح مطلب یہ ہے کہ مشاہدات کا دائرہ بھی محدود ہوگا۔ ظاہر ہے کہ میری دلچسپیاں اور ان کی بنیاد پر مشاہدات بھی غیر محدود نہیں ہیں۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ میری دلچسپیاں صحت و طب کی مملکت سے زیادہ وابستہ ہیں۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ میرے مشاہدات و تاثرات کی دنیائیں بھی بہت وسیع نہیں ہیں۔ ہر چند کہ میں نے چین میں بہت کچھ دیکھا اور بہت کچھ سمجھا اور اس کو ذہن نشین بھی کرلیا پھر بھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ کچھ بھی نہ دیکھا اور دیکھنے سمجھنے اور جاننے کی پیاس بڑھ گئی۔ ایک واقعہ عرض کرتا ہوں:

پچھلے دنوں ایک مریض کی نبض دیکھتے ہوئے محسوس ہوا کہ اس کی انگلی میں جو انگوٹھی ہے اس کے نیچے کچھ سفیدی نظر آتی ہے۔ خیال ہوا کہ شاید یہ بھی مرض کا کوئی حصّہ ہو۔ پوچھا تو مریض نے جلدی سے انگوٹھی اتار کر اپنی انگلی صاف کی اور معذرت کے لہجے میں کہنے لگا کہ صاحب میں آٹے کا کاروبار کرتا ہوں، انگلی میں آٹا لگا رہ گیا تھا۔ آٹے نے مجھے فوراً بھوسی یاد دلائی جو میں اکثر خشک کھانسی کے مریضوں کو دیا کرتا ہوں۔ بڑے فائدے کی ہے یہ حقیر اور بے کار سی چیز۔

تو میں نے اس مریض سے کہا کہ میرے بہت سے مریض آٹے میں بھوسی نہ ہونے کی شکایت کرتے

ہیں۔ اس نے مجھے تسلی بخش یا غیر تسلی بخش جو کچھ بھی جواب دیا لیکن ایک سوال مجھ سے کر ڈالا کہ چین میں آٹا کیسا ہوتا ہے؟ میں اس سوال کا کیا جواب دیتا، جب میں نے چین میں آٹا دیکھا ہی نہیں، بلکہ مجھے چین میں آٹے کا خیال بھی اسی وقت آیا جب مجھ سے یہ سوال کیا گیا۔ اسی سوال نے اپنے مشاہدات محدود ہونے کی بات یاد دلائی۔

آپ کو معلوم ہے کہ میں اور میرے ساتھی اپنی طب کو سمجھانے اور چینی طب کو سمجھنے کا مقصد لے کر گئے تھے اور اس کا مشاہدہ کرنے گئے تھے کہ چین میں طبِ چینی (قدیم) کے ساتھ کس طرح کا معاملہ ہے اور یہ کہ اس طبِ چینی میں ریسرچ اور تحقیق کا انداز اور اس کی رفتار کیا ہے اور قدیم و جدید طبوں میں ہم آہنگی کیسے پیدا کی جائے۔ فطری طور پر ہماری دلچسپی اور ہماری توجہ اس مقصد کی تکمیل پر مرکوز رہی۔ وقت بھی کم تھا۔ ایک ماہ کی مدت اور چین جیسا عظیم و وسیع ملک!

خواتین و حضرات!

اِس عظیم ملک نے قومی صحت کے مسئلے کو کس طرح حل کیا ہے، اور اپنے عوام کو بیماریوں کے جنگل سے نکالنے کے لیے کون سی راہ اختیار کی ہے، اور کیا تدابیر اختیار کی ہیں اِس سے ہم سب ہی کو دلچسپی ہونی چاہیے۔ خاص طور پر اس لیے کہ ہم بھی بیمار ہیں، بیماریاں ہمیں دوست رکھتی ہیں، ہمارے عوام بیماریوں کے حملے کا مقابلہ کرنے کے لیے پوری طرح تیار نہیں کیے گئے۔

آزادی سے پہلے چین کی کومن تانگ حکومت نے غیر ملکی اِستعماری طاقتوں کے دباؤ اور اپنی نادانش مند پالیسی کے تحت چین کے قدیم تہذیبی سرمائے یعنی طبِ چینی کو خلافِ قانون قرار دیا اور چینی عوام کو اس مفید طب کے فیض سے محروم کر دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کا انجام اچھا نہیں ہو سکتا تھا۔ اِس عاقبت نااندیشانہ فیصلے کے نتائج نہایت مہلک نکلے! امراض کثرت سے پھیلنے لگے۔ ان کے علاج کی کوئی صورت نہیں تھی۔ جدید غیر ملکی طب محدود اور نہایت گراں تھی۔ عوام کی معاشی حالت نازک تھی، صحت بھی تباہ ہونے لگی۔ چینی طب کے علم بردار معالجین جو تقریباً ۵ لاکھ کی تعداد میں تھے، بے روزگار اور پریشان ہو گئے۔ ایک تہذیبی ورثہ اور ایک قومی دولت بے کار ہو کر رہ گئی۔ موجودہ حکومتِ چین نے دُوسرے کاموں کے ساتھ ساتھ طبِ چینی پر سے بھی پابندیاں ہٹالیں اور اس کے علم برداروں کو طبی خدمت کی پوری آزادی بخشی۔ ملکی جڑی بوٹیاں کام میں آنے لگیں۔ اطبا کا معاشی بحران دُور ہو گیا۔ امراض کم ہو گئے اور عوام نے سکون کا سانس لیا۔

چین پر کون سا غیر ملکی اِستعمار مُسلط تھا، یہ کوئی راز کی بات نہیں ہے۔ سفید قومیں خوب جانتی تھیں اور جانتی ہیں کہ ایشیا میں چین ہی ایک ایسا ملک ہے کہ اگر وہ بیدار ہو گیا تو اِن

سفید قوموں کے لیے باعثِ خطر ہوگا۔ آج جس طرح ایشیا اور افریقہ مغرب کے سفید فاموں کی گرفت میں ہیں ہو سکتا ہے اور ضرور ہو سکتا ہے کہ کل چین کی بیداری اور طاقت اس گرفت کو ڈھیلا ہی نہ کر دے، بلکہ غلامی کی زنجیروں کو کاٹ کر پھینک دے اور ایشیا اور افریقہ آزادی کا سانس لے سکیں۔

چین پر مسلط استعمار اس "خطرے" سے خوب آگاہ تھا اور یہ ضرور اس آگاہی کا نتیجہ تھا کہ چین میں اس نے اپنے اثرات سے کام لیکر اور بالادستی کی بدولت طبِ چینی کو قطعی غیر قانونی قرار دے دیا اور اس دَور کی چینی حکومت (کیومن تانگ) نے اس فیصلے کو بلا چون و چرا قبول کر لیا۔ یہ حکومت اس کے سوا کر بھی کیا سکتی تھی۔

طبِ چینی، چین کی طب ہے اور اس کے حاملین کی تعداد چین میں پانچ لاکھ سے کم نہیں ہے۔ یہ پانچ لاکھ ——— خواتین و حضرات غور فرمائیں ——— یہ پانچ لاکھ معالجین بہ یک جنبشِ قلم معطّل کر دیے گئے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ پانچ لاکھ مُعالجین کروڑوں بیماروں کے دکھ درد کا علاج کرتے تھے۔ چین میں جب بھی - اور آج بھی ——— سب سے بڑا، سب سے زیادہ رائج، سب سے زیادہ مفید اور سب سے زیادہ پسندیدہ طریقِ علاج یہی طبِ چینی ہے۔ اِس جبری تعطّل کا اثر نہ صرف ان طبِ چینی کے حاملین پر کیا پڑا ہوگا اور پورے مُلک کی صحتِ عامہ پر اس کا کیا اثر پڑا ہوگا۔

نتیجہ ظاہر تھا، ملک میں ایک طرف سخت معاشی بحران آیا۔ دوسری طرف بیماروں کے لیے مُعالجہ کی سہولتیں یکسر مفقود ہو گئیں۔ پورا ملک بیماریوں کی آماجگاہ بن گیا۔

خواتین و حضرات!

میں اس باب میں لگی لپٹی بات کرنے کا قطعی قائل نہیں ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ طبِ چینی کا غیر قانونی قرار دینا کسی انسانیت کا نتیجہ نہ تھا۔ نہ یہ چین کی صحت سے کسی ہمدردی کی وجہ سے ہوا تھا، بلکہ یہ اقدام خالصتًا سیاسی تھا۔ اس اقدام کا مقصد آپ ہی بتائیے سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ چین کی صحتِ عامہ کو اس درجہ متاثر کر دیا جائے کہ لوگ بیماریوں کے جنگل میں پھنس جائیں اور آزادی کا دم بھرنا چھوڑ دیں۔

مغربی استعماریت کی یہ سب سے بڑی اور سب سے گھناؤنی مثال ہے، جو پیش کی جا سکتی ہے۔ مقصد برآری استعماریت، غلام بنائے رکھنے کے لیے یہ سب سے بدترین قدم ہو سکتا ہے کہ کروڑوں لوگوں کو صحت سے محروم کر کے بیماریوں میں مبتلا کر دیا جائے۔

خواتین و حضرات! آپ کو یہاں ذرا توقف کرنا چاہیے اور اس پر غور کرنا چاہیے کہ ہمارے ملک

کے وزیرِ صحت (جنرل برکی) اس کے بڑے سرگرم حامی رہے ہیں کہ پاکستان میں طبِ مشرقی کو خلافِ قانون قرار دے کر اس کی پریکٹس کو بالکل ممنوع قرار دے دیا جائے۔ کون ہے جو اس سے ناواقف ہوگا کہ پاکستان کی ۸۰ فیصد دیہی آبادی کے دکھ کی دوا طبِّ مشرقی ہی میں ہے۔ دیہاتوں میں یہ اطبا ہی ہیں کہ خدمتِ خلق میں مصروف ہیں۔ طبِّ جدید کے حاملین بتائیے دیہاتوں میں کہاں ہیں؟ اگر ہمارے وزیرِ صحت کو من مانی کرنے کا موقع مل جاتا اور وہ طبِّ مشرقی کی پریکٹس پاکستان میں ممنوع قرار دے سکتے تو ہمارے ملک کی صحتِ عامہ پر کیا گزرجاتی آپ سب اس کا تصوّر ضرور کرسکتے ہیں۔

وہ تو بڑا غنیمت ہوا کہ ہم بے جگری کے ساتھ ان کے مدِّمقابل کھڑے ہوگئے اور ان کی شخصی پسند یا ناپسند کو ہم نے قانونِ ملک نہ بننے دیا، ورنہ اس کا بڑا پکا ثبوت مل جاتا کہ ہمارے حکّام مغربی نہیں ہیں تو مغرب زدہ ضرور ہیں اور اس مغرب زدگی میں وہ مغربیوں سے بھی آگے بڑھ جاتے ہیں!

صدرِ مملکت فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کی شخصیت نے اس موقع پر بڑا جچا تلا فیصلہ کیا اور طبِّ مشرقی کے خلاف اس مغربی سازش کو ناکام بنادیا۔ ہم اطبا اور ہمارے دیہاتی عوام ان کی اس توجّہ کے ممنون ہیں!

طبِّ چینی: آج کے چین کی عوامی حکومت نے جب یہ محسوس کیا کہ طبِّ چینی شفابخشی کی صلاحیت پوری طرح اپنے اندر رکھتی ہے اور یہ قوم و ملک کا قیمتی سرمایہ ہے اور ایک قومی ورثہ، تو اس نے باور کیا کہ طبِّ چینی پر سے پابندی ہٹانے کے منفی اقدام سے اس کی ذمّہ داری پوری نہیں ہوجاتی بلکہ قوم کے مفاد میں اس سے بھی زیادہ اس کی ذمّے داری ہے۔ چناں چہ اس نے طے کیا کہ مثبت اقدام کی ضرورت ہے اور اس کی پہلی سیڑھی فنّی تعصب کو ختم کرنا ہے، جو قدیم اور جدید طب کے حاملین کے درمیان پایا جاتا ہے۔ اس لیے فنّی تعصب کا قلع قمع کرنا ایک قومی فرض اور ایک مذہبی ذمّے داری سمجھی۔ یہ قومی جذبے کا تقاضا تھا کہ اس کا محرّک اپنی پرانی چیزوں کی حفاظت کا خیال تھا۔ اس کا مقصد ملک کو تعصبات کی دل دل سے نکال کر اجتماعی مفاد کی شاہراہ پر کھڑا کرنا تھا۔ چناں چہ عوامی حکومت نے:

نمبر۱) چینی طب اور جدید دیسی طب کے حاملین کو واضح طور پر عوامی جماعت کا نقطۂ نظر بنادیا۔ کہ اب کسی قسم کا تعصب روا نہ رکھا جائے گا۔ اب باہمی تنافر گوارا نہیں کیا جائے گا، اب کوئی آویزش برداشت نہیں کی جائے گی۔ قدیم و جدید کی تفریق راہ نہیں پاسکے گی۔ دونوں کو مل کر کام کرنا ہے۔ دونوں کو صرف ایک مقصد پیشِ نظر رکھنا پڑے گا اور وہ ہے انسانوں

کی، چینی عوام کی خدمت۔ امراض کے چنگل سے اہلِ چین کو نجات دلانے کے لیے دونوں کو کندھے سے کندھا ملا کر کام کرنا پڑے گا۔

نمبر ۲) جدید طب کے ہسپتالوں میں قدیم طب کا ایک شعبہ لازمی قرار دیا جس میں قدیم مُعالجین جدید مُعالجین کے ساتھ مل کر کام کرتے ہیں۔

نمبر ۳) ہر ڈاکٹر پر طبِ قدیم کا ایک سال کا کورس پڑھنا ضروری قرار دیا گیا ہے۔

نمبر ۴) اِسی طرح قدیم مُعالجین کے لیے جدید طب کا ایک سالہ کورس جاری کیا گیا۔

نمبر ۵) جدید طبی کالجوں میں ہر طالبِ علم کے لیے قدیم طب کو تعلیم کا لازمی جزو بنا دیا گیا۔

نمبر ۶) اسی طرح قدیم طب کے کالجوں میں جدید طب کی ایک سالہ تعلیم ہر طالبِ علم کے لیے ضروری ہو گئی۔

ان اہم اور تعلیمی اقدامات کے ثمرات نہایت اچھے اور ہمت افزا ہیں۔ آج کے چین میں دونوں قسم کے مُعالجین مِل کر کام کر رہے ہیں۔ تعصب کا نام تک نہیں رہا۔ تنافر کا شائبہ تک نہیں رہا۔ دونوں نے بیماریوں کے خلاف متحدہ محاذ بنالیا ہے۔ دونوں سر جوڑ کر بیٹھتے ہیں اور برادرانہ جذبات کے ساتھ اپنے علم سے بھائیوں کی بہتر سے بہتر خدمت کی راہیں سوچتے ہیں۔ غرض اب دونوں شیر و شکر ہیں اور ایک منزل کی جانب تیز گامی سے رواں دواں ہیں۔

طبِ چینی میں ریسرچ: یہ ڈاکٹر اور حکیم نہ صرف علاج مُعالجہ میں باہم معاون ہیں، بلکہ طبی ترقی اور ریسرچ کے میدان میں بھی ہم قدم ہیں۔ غیر مناسب نہ ہوگا اگر میں آپ کی معلومات کے لیے ریسرچ کے طریقے پر بھی تھوڑی سی روشنی ڈال دُوں۔

۱۔ وہ جب بھی اور جو بھی دوا مریض کو استعمال کراتے ہیں، اس کے اثرات و نتائج کا باقاعدہ ریکارڈ رکھتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے وہ مریض کے بیان پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ سائنسی آلات اور مختلف اِمتحانات سے مدد لیتے ہیں۔ وہ خون کا مُعائنہ کرتے ہیں۔ خون کا دباؤ (بلڈ پریشر) دیکھتے ہیں تنفس کا اِمتحان کرتے ہیں۔ جگر کے افعال کا مطالعہ کرتے ہیں۔ پیشاب پاخانہ کا امتحان کرتے ہیں اور یہ سب جدید ترین سائنسی آلات کی مدد سے کرتے ہیں اور ان کے نتائج کی صحت کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔

۲۔ پھر یہ ریکارڈ ریسرچ اسکالروں کے پاس بھیجے جاتے ہیں اور وہ ان پر کام شروع کرتے ہیں۔

۳۔ معملوں (لیبارٹریز) میں اس دوا کا تجزیہ کیا جاتا ہے اور اس کے فعّال جزو (ACTIVE INGREDIENT) نکالے جاتے ہیں اور سائنسی تحقیق کے سارے لوازم پورے کیے جاتے ہیں۔

۴- اِس تمام ریسرچ و تحریک اور کد و کاوش کے باوجود وہ یہ غلطی نہیں کرتے کہ دوا کے جز و عامل کو کافی سمجھ کر اس پر پل پڑیں اور دوا کے باقی حصّے کو بے کار سمجھ کر پھینک دیں (جیسے کہ جدید ریسرچ کا قاعدہ ہے) کہ دوا کے جس جز و کو انھوں نے موثر جانا اس کے ماحصل تیار کرنے پر سارا زور صرف کرنا شروع کر دیا۔ چینی معالجین دوا کو سالم، سادہ اور قدرتی شکل میں بھی استعمال کرتے ہیں۔

اصولِ علاج: آپ ذرا چین کی قدیم طب کی مختلف اقسام بھی سن لیجیے:

۱- ایک قسم سوزن زنی ہے۔ یا AEUMPVRELUIT جس میں سوئیاں چبھو کر مختلف امراض کا دفعیہ کیا جاتا ہے۔

۲- دوسری قسم ماکسی بسچن MOXIBUSTIAN ہے جس میں سوزن زنی کے ساتھ آگ کے ذریعے گرمی پہنچائی جاتی ہے اور متاثر حصّہ جسم کو ٹھیک کیا جاتا ہے۔

۳- تیسری قسم تنفس کا طریقہ علاج ہے۔ اِس میں سانس کی مختلف ورزشوں کے ساتھ نفسیاتی خود مشورتی (آٹو سجیشن) سے بھی کام لیا جاتا ہے۔

۴- چوتھی قسم مالش کے ذریعے علاج کی ہے۔

۵- پانچویں قسم سب سے اہم قسم علاج بالمفردات کی ہے۔

اِس میں وہ ہماری مشرقی طب ہی کی طرح اپنے ملک کی جڑی بوٹیاں اور جوشاندے خیساندے استعمال کرتے ہیں اور زیادہ تر امراض کا علاج اپنی طب کے طریقے سے کرتے ہیں۔ آزادی کے بعد سے اب تک حکومتِ چین نے ۴۳ طبی اسکولوں کو بحال کیا جن کو کومن تانگ حکومت نے بند کر دیا تھا اور ۱۸ نئے طبی کالج قائم کیے، جن میں صرف قدیم طب کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ایک ہزار طلبا ہر کالج میں پڑھتے ہیں اور ہر کالج کے ساتھ ایک ہسپتال بھی ہے۔ معالجین چاہے وہ قدیم طب کے حاملین ہوں یا جدید طب کے سب حکومت کے ملازم ہیں۔ پرائیویٹ پریکٹس کی اجازت نہیں ہے اور نہ وہاں کوئی ذاتی مطب کرتا ہے اور سب معالجین کو حقوق برابر کے حاصل ہیں۔ اختیارات برابر ہیں، مراعات برابر ہیں، تنخواہیں برابر ہیں اور دونوں یکساں مرتبہ رکھتے ہیں۔ دونوں کی یکساں عزت کی جاتی ہے۔ قدیم و جدید کی کوئی تفریق اور نئے پرانے کا کوئی امتیاز نہیں رکھا جاتا۔ تعلیم مفت ہے، کوئی فیس نہیں لی جاتی۔ جو طلبا ہوسٹل میں رہتے ہیں ان سے بھی خوراک کے مصارف بہت معمولی لیے جاتے ہیں۔ علاج بھی تقریباً بلامعاوضہ کیا جاتا ہے۔ اس کی شکل یہ ہے کہ سرکاری ملازمین کا علاج مفت ہوتا ہے۔ کارخانوں اور فیکٹریوں میں کام کرنے والوں یعنی مزدوروں کے لیے جو کارخانے میں دوا خانے قائم ہیں، وہاں

ان کو دوا اور علاج کے لیے کوئی پیسہ دینا نہیں پڑتا۔ کسانوں کے لیے کیمونوں میں بلاقیمت علاج کی سہولتیں فراہم کی جاتی ہیں۔ اگر کسی کارخانے میں دواخانہ قائم نہیں ہے تو سرکاری ہسپتال میں اس کے مزدوروں کا مفت علاج کیا جاتا ہے۔ ہسپتال میں ان کو رجسٹریشن فیس کے صرف دس سینٹ یعنی تقریباً دو آنے دینے پڑتے ہیں۔ پھر ان کو علاج کے لیے کوئی صرفہ نہیں کرنا پڑتا۔ اب رہ گئے ان لوگوں کے متعلقین سو فی الحال ان کو علاج اور دوا کی بڑی معمولی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔

طبی امداد اور تعلیم کے ساتھ ساتھ چین میں تفریح بھی بہت سستی ہے۔ ہر بستی میں بڑی بڑی تفریح گاہیں بھی ہیں۔ ایک ہی احاطے میں ہر قسم کی تفریح گاہ کا سامان مہیا ہے۔ پارک بھی ہیں، اور تیرنے کے لیے تالاب بھی، سینما اور ناٹک بھی۔ بیس سینٹ یعنی چار آنے دے کر آپ اس احاطے میں خوب خوب تفریح کیجیے، آپ کو کوئی روکنے والا نہیں ہے۔ بڑے چھوٹے کا کوئی امتیاز نہیں ہے، سب مساوی ہیں، سب بھائی بھائی ہیں۔

خواتین و حضرات!

طب کے سلسلے میں دو ایک باتیں اور کر کے میں آپ کو وہاں کی چند عام اور دل چسپ چیزیں بتاؤں گا اور پھر آپ سے اجازت لوں گا۔

علاج سوزنی : طبِّ چینی کی ایک قسم سوزن زنی یعنی ACUMPURCTUR کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔ اس کے سلسلے میں یہ اور سن لیجیے کہ یہ طریقہ چین میں اتنا کامیاب ہوا اور اس کی افادیت اتنی واضح ہو گئی کہ دنیا کے دوسرے ترقی یافتہ ممالک نے بھی اس سے فائدہ اٹھانا ضروری سمجھا۔ فرانس، جرمنی، انگلستان اور امریکا میں سوزن زنی کے تجربے کیے جا رہے ہیں اور وہاں اس طریقِ علاج کے ہسپتال قائم ہو گئے ہیں اور قائم کیے جا رہے ہیں۔ گویا چین نے طب کے میدان میں دنیا کو ایک نئی چیز دی۔

مغرب زدگی کی وجہ سے باستثنائے چین تمام ایشیا اور افریقہ کے ممالک کی حکومتیں اپنے ماضی سے کٹ چکی ہیں۔ زیادہ صحیح الفاظ میں یہ کہ مغربی طاقتوں نے ایشیائی اور افریقی اقوام اور بالخصوص مسلمانوں پر بڑی کاری ضرب یہ لگائی ہے کہ انھوں نے ان کو ان کے ماضی سے کاٹ دیا ہے، غیر متعلق کر دیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان کو اپنے ماضی سے تمسخر کے لیے پوری طرح تیار کر دیا ہے۔ آپ دور نہ جائیے، پاکستان کا حال دیکھیے۔ یہاں روایاتِ قدیم بے معنی ہو چکی ہیں۔ یہاں ہماری قدیم تہذیب و تمدن کا مذاق اڑایا جاتا ہے ——— ہم بھی مذاق اڑاتے ہیں ——— ہم اپنے بزرگوں کی تذلیل و اہانت میں فخر محسوس کرنے لگے ہیں۔ ہم اپنے قومی ورثوں کو نہ صرف یہ کہ

کوئی وزن نہیں دیتے، بلکہ ان کو لایعنی سمجھتے ہیں۔ میں اس وقت طب کے میدان سے باہر قدم نہیں رکھوں گا۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ پاکستان میں طبِّ قدیم کے ساتھ ہمارا کیسا سلوک ہے؟

یہی نا کہ ہمارے مغرب زدہ حکام اس پر فرسودگی کی مہر ثبت کرتے ہیں! یہی نا کہ لوگ اسے غیر سائنسی نظامِ طب کہتے ہیں! یہی نا کہ اس کی افادیت کو قطعی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک یہ عظیم قومی ورثہ قطعی بے سود ہے، بے کار ہے طب کا تو خیر بہت بعد میں نمبر آتا ہے۔ ہمارے ہاں تو "روشن دماغ طبقہ" اسلام پر بھی فرسودگی کی تہمت لگانے سے نہیں چوکتا۔

خواتین و حضرات! علاج سوزنی (اکیوپنکچر) ایک قدیم چینی طریق علاج ہے۔ کل ہی کی بات ہے کہ یورپ والے اس کا مذاق اڑاتے تھے اور تمام وہ کلمات استعمال کرتے تھے کہ جو اس کی تحقیر و تمسخر کے لیے ممکن ہو سکتے تھے۔ مگر چین نے اس کی کوئی پروا نہ کی۔ انھوں نے مغربیت سے مرعوب ہو کر اپنے اِس قومی ورثے کو خیرباد نہیں کہا، بلکہ وہ برابر تحقیق اور ریسرچ میں مصروف رہے اور آخر آج چینیوں نے ثابت کر دکھایا کہ علاج سوزنی مفید ہے، سائنٹی فک بنیادوں پر ہے۔ اور کل اس کا تمسخر و تذلیل کرنے والا مغرب آج اس طریقِ علاج کی تعریف کرنے پر مجبور ہے، اور اس طریقِ علاج کے اپنے ہاں بڑے بڑے ہسپتال بنانے پر مجبور رہے۔ ہائے یہ مجبوری!

تین سبق آموز باتیں: (۱) چین میں ایک کارخانے کے مزدور کا ہاتھ کٹ گیا۔ اس کا ہاتھ صرف زخمی نہیں ہوا تھا، بلکہ بالکل کٹ کر الگ جا گرا تھا۔ ایک چینی سرجن نے کہا کہ "یہ نہیں ہو سکتا کہ ہمارا اور ایک مزدور معذور ہو جائے اور زندگی بھر وہ بے دست رہے۔" چناں چہ اس نے اس کا ہاتھ جوڑا اور اس طرح جوڑا کہ وہ پوری طرح کارآمد ہو گیا۔ جب کہ اس سے قبل امریکا وغیرہ کے سرجن اس میں ناکام ہو چکے تھے اور امریکا میں جو ہاتھ جوڑے گئے تھے، دورانِ خون کی کمی کی وجہ سے ان کی انگلیاں سوکھ گئی تھیں۔ غور فرمائیے یہ کاہے کا کرشمہ تھا؟ کیا سائنس کا؟ سائنس تو امریکا میں بھی پیچھے نہیں ہے۔ میرے خیال میں یہ اس انسانی اور قومی جذبے کا کرشمہ ہے جو چینی سرجن کی کوشش میں کارفرما تھا۔

(۲) ہمارے وفد کے ایک رکن نے ایک چینی ڈاکٹر سے، جو بہت قابل تھا اور بہت سی اسناد رکھتا تھا، پوچھا کہ آپ کے پاس بہت اسناد ہیں، آپ کو دوسروں سے زیادہ تنخواہ ملتی ہو گی" چینی ڈاکٹر نے بے چین ہو کر جواب دیا کہ مجھ پر تو قوم نے تعلیم دلانے کے لیے زیادہ مصارف کیے ہیں۔ مجھے تو اور کم تنخواہ ملنی چاہیے۔ زیادہ کیوں ملے؟ خواتین و حضرات دیکھا آپ نے

اس کا احساس واعتراف!

(۳) چین کے وزیر خارجہ اور نائب وزیر اعلا مارشل چن ای سے ہمارے وفد نے ملاقات کی۔ دنیا کے سب سے بڑے ملک کے نائب وزیر اعظم نے ہم سے اس ملاقات میں جو حسنِ سلوک روا رکھا تھا اور جس خوش خلقی اور تپاک کا ثبوت دیا تھا وہ تو چینیوں کی اخلاقی برتری کا ثبوت ہے لیکن ہمارے لیے سب سے دل خوش کن بات یہ تھی کہ انھوں نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا کہ میں طبِّ چینی کا علاج کرتا ہوں اور مجھے اس پر فخر ہے۔ کیوں نہ ہو آزاد قومیں اپنی پرانی چیزوں سے شرماتی نہیں، بلکہ ان پر ناز کرتی ہیں۔

مکھّیاں: خواتین وحضرات! ہمارے ملک میں بھی مکھیوں کی کمی نہیں ہے اور اگر اس محاورے کے لحاظ سے دیکھا جائے تو مکھّیاں مارنے والوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ لیکن چین میں پانچ سال پہلے تک مکھیوں کی کثرت کا یہ عالم تھا کہ لوگ اطمینان سے بیٹھ کر کھانا نہیں کھا سکتے تھے۔ چائے کی ایک پیالی نہیں پی سکتے تھے۔ چناں چہ طے کیا گیا کہ آج سے یہ قومی فریضہ ہے کہ جس شخص کو جہاں مکھی نظر آئے وہ اسے مارے بغیر چین نہ لے اور اسی وقت سے اس قومی فرض کی ادائی شروع ہو گئی۔ بڑا ہو یا چھوٹا، افسر ہو یا ماتحت، صدر جمہوریہ ہو یا مزدور ہر ایک نے مکھیاں مارنی شروع کر دیں۔ ہم مکھیاں مارنے کو بے کاری کی علامت سمجھتے ہیں، انھوں نے اس کو کارنامہ سمجھا اور عمل شروع کر دیا۔ آج چین میں مکھّی نظر نہیں آتی۔ عالم یہ تھا کہ اہم سے اہم موقع پر بڑے بڑے اجلاس میں بڑے سے بڑا حاکم مکھی نظر آتے ہی نچلا نہیں بیٹھتا تھا اور اس کو مار کر ہی مطمئن ہوتا تھا، چاہے اس وقت کوئی غیر ملکی بیٹھا ہو یا بین الاقوامی مذاکرات ہو رہے ہوں۔ یہ ہے قومی جذبہ اور یہ ہے مشکلات و مسائل کو حل کرنے کا طریقہ۔ قوموں کی قسمتیں اسی طرح بنا اور بدلا کرتی ہیں۔ آج چین میں مکھی ہی نہیں مچھر، چوہا، کتّا اور اناج کھا جانے والا پرندہ نیست ونابود ہو چکا ہے۔ اب وہ اپنی متحدہ کوششوں سے انسانی صحت کے ان دشمنوں کو ختم کر چکے ہیں۔

مماثلت طبّی: اکثر حضرات کے ذہنوں میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ طبِّ چینی ہے کیا؟ کیا طبِّ چینی اور طبِ یونانی میں کوئی مماثلت موجود ہے۔ اس کا جواب اختصار کے ساتھ یہ ہے کہ ہاں ان دونوں طبوں میں بڑی مماثلت ہے، بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ دونوں طبیں ایک دوسرے کا عکس ہیں۔ طبّ چینی نے طبِ یونانی کو کیا دیا اور عربوں نے طبِّ چینی پر کیا اثرات ڈالے، یہ ایک بڑی طویل تاریخی داستان ہے، جسے میں اپنی کتاب "مڈیسن اِن چائنا" میں لکھوں گا۔ آپ صرف اتنا جان لیجیے کہ عربوں نے طبّ چینی پر کافی اثرات چھوڑے ہیں۔ اس کا بھی نتیجہ یہ ہے

کہ جو طب ہمارے ہاں رائج ہے وہ بہت سے حالات کا امتزاج ہے۔ چینی طب میں بھی جوشاندے خیساندے موجود ہیں۔ طریقۂ علاج اور طریقہ ہائے تشخیص میں بڑی زبردست ایکتا ہے، مگر ہاں وہاں خمیرہ گاؤزبان جواہر دار نہیں دکھائی دیا۔ کڑوی معجونوں کی گولیاں ضرور تھیں۔
مجھ سے پاکستان واپسی کے بعد یہ سوال اکثر کیا گیا ہے کہ چین میں کون سی چیزیں سستی ہیں؟ آپ بھی سن لیجیے کہ چین میں پانچ چیزیں بہت ارزاں ہیں: ایک غذا۔ دوسرا کپڑا۔ تیسرے مکان۔ چوتھے تفریحات۔ پانچویں صدر ماوزے تنگ کا مجسمہ! چین کے بازاروں میں باسانی و بکثرت صدر ماؤ کے مجسّمے بہت کم قیمت پر ملیں گے۔ شاید یہ قوم کا اپنے قائد اور محسن کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کا ایک طریقہ ہے۔
خواتین وحضرات! چین کا ماضی بھی درخشاں ہے۔ وہاں ولادتِ مسیح سے ڈھائی ہزار سال پہلے ہی حکومت کے بنیادی اصول مرتب ہو چکے تھے۔ حکومت کا دستور موجود تھا۔ حکومت کے پاس مستقل فوج تھی۔ جہازرانی اور آب پاشی کے لیے دریاؤں اور نہروں کا جال بچھا ہوا تھا۔ چینی پانچ ہزار سال سے فنِ تحریر سے واقف ہیں۔ کاغذ اور مطبع کی ایجاد کا سہرا بھی چینیوں کے سر ہے۔ قطب نما سب سے پہلے اہلِ چین نے ایجاد کیا۔ ادب اور سائنس کے ساتھ موسیقی کی تعلیم کے لیے قدیم چین میں باقاعدہ درس گاہیں قائم تھیں۔ چینی ریشم کے کیڑے پالتے تھے، ریشم تیار کرتے تھے اور اس سے اعلا قسم کے کپڑے بنانے اور پہنتے تھے۔ چین نے علمِ نجوم کو بھی بڑی ترقی دی تھی۔ دیوارِ چین فنِ تعمیر اور انجینئرنگ کا نادر نمونہ اور دُنیا کے سات عجائبات میں سے ہے اور بقول انگلستان کے ایک مشہور مصنّف کے ان سات عجائبات میں بھی دیوارِ چین ہی سب سے عجیب ہے۔
میری رائے میں دیوارِ چین قدیم چین کا سب سے عجیب اور سب سے عظیم کارنامہ ہے اور موجودہ چین کا سب سے عجیب اور سب سے عظیم کارنامہ زندگی کا نظام ہے جس میں انسانی مساوات، بھائی چارہ اور امن و انصاف کے ان اصُولوں کو پوری طرح اپنا لیا گیا ہے، جو اسلام نے ہمیں عطا کیے تھے، مگر جنھیں ہم نے بھلا دیا۔

شامِ ہمدرد - لاہور
۲ جنوری ۱۹۶۴ ش

میاں ایم۔ اسلم

۶راگست ۱۸۸۵شمسی

ہرانسان کوئی نہ کوئی صلاحیت لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اگر اس صلاحیت کو پہچان لیا جائے اور اس کے لیے صلاحیت والا ماحول پیدا کر دیا جائے تو وہ جوہر قابل بن جاتا ہے، اور اگر ایسا نہ ہو سکے تو غنچہ بن کھلے مرجھا جاتا ہے۔ جو تو ہیں یہ جانتی ہیں کہ غنچے کھِل کھِلا کر کس طرح ہنستے ہیں اور کیسے پھول بنتے ہیں برتری و تفوق ان کے لیے مقدر ہو جاتا ہے۔ اگر اسلامیہ ہائی اسکول سے میٹرک کرنے کے بعد (۱۹۰۸) اور پھر دو سال گورنمنٹ کالج میں رہنے کے بعد (۱۹۱۰) کشمیری نوجوان اسلم نے ایگریکلچرل کالج میں تعلیم پوری کرلی ہوتی تو وہ ضرور ایک زمیندار ہوتے۔ اور اگر ضلع داری کی تعلیم اور ملازمت پوری کرلی ہوتی تو شاید ضلع دار یا ڈپٹی کمشنر بن گئے ہوتے۔ لکھنے پڑھنے کا شوق ایم۔ اسلم کو اسکول کے زمانے سے تھا۔ اسکول کے زمانے میں شعر و شاعری سے لگاؤ تھا۔ مشہور شاعر چودھری خوشی محمد صاحب ناظر سے اصلاحِ سخن لیتے تھے۔ پھر گورنمنٹ کالج میں ڈاکٹر پروفیسر محمد اقبال (علامہ، شاعرِ مشرق، حکیم الامت) کی شاگردی کا فخر حاصل ہوا۔ اِسی کالج میں ہر سال "نیچرل شاعری" پر ایک انعام دیا جاتا تھا۔ ایم۔ اسلم نے "وسطِ ایشیا" کے عنوان سے ایک نظم پیش کی اور پہلا انعام حاصل کیا۔ نظم کا پہلا شعر تھا:

پھر بلائے اپنے ویرانوں میں وسطِ ایشیا
اب دیارِ ہند میں میرا گزارہ ہو چکا

صلاحیت کو سمجھنے اور رجحان کو دیکھنے کے لیے یہ بہت کچھ کافی تھا۔ اس کے باوجود پانچ سال ضلع داری کی تربیت پاتے رہے۔ خدا بھلا کرے ایک ہندو افسر کا کہ اس نے ان کو پہچان لیا، اور لڑکر ان کو نکال دیا۔ ایسے حوادث سببِ تعمیر بھی بن جایا کرتے ہیں۔ اگر یہ حادثہ پیش نہ آتا تو اُردو ادب میاں ایم۔ اسلم سے محروم رہ جاتا۔

"اسلم نثر لکھا کرو، نظم کہنی چھوڑ دو ـــــــ جو کچھ لکھو قومی نقطۂ نگاہ سے لکھو ـــــــ"



میاں ایم - اسلم

یہ محترم و معظم اُستاد (ڈاکٹر اقبال) کا مشورہ تھا جسے اسلم شاگرد نے قبول کر لیا۔ ابتدا چھوٹے چھوٹے مضامین سے کی، جو "کشمیری گزٹ" (مدیر: منشی محمد دین فوق) میں چھپے۔ پھر افسانے لکھنے شروع کیے، جو "مخزن" (لاہور)، "زمانہ" (کان پور) "ساقی" (دہلی) میں شائع ہوئے۔ اِس کے بعد اصلاحی ناول لکھنے شروع کیے اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ اب تک میاں ایم۔ اسلم کی دو سو سے زیادہ کتابیں چھپ چکی ہیں۔ (۶۰ ہزار صفحات)۔

میاں ایم۔ اسلم کی شخصیت میں کوئی گونا گونیت نہیں ہے، نہ ہی انھیں اس سے دل چسپی ہے کہ کوئی ان کی شخصیت کو پہلو دار کہے۔ وہ بس لکھتے ہیں اور جب تھک جاتے ہیں تو الائچی اور مصری منھ میں ڈال کر پھر لکھنے لگتے ہیں۔ دوسرا شوق ہے انسانوں سے محبت کرنا۔ اور اگر کوئی اِن سے محبت کرنے لگ جائے تو پھر میاں صاحب عشق کرنے لگتے ہیں۔ اِن دونوں مشغلوں سے فرصت مِل جائے تو آپ اِن کو "ہرن مینار" پر پائیے گا۔

کوئی ۱۹۳۶ء سے میاں صاحب سے تعلقات ہیں۔ اب ۳۲-۳۳ سال ہو گئے۔ میں نے تو ان میں کوئی تبدیلی دیکھی نہیں۔ پھر جو تعلق ایک بار جس حد تک قائم ہوا وہ آج تک قائم ہے، اس میں کوئی فرق نہیں ہے۔

مِزاج میں بلا کی سادگی، گفتار میں متانت، رکھ رکھاؤ میں حُسن۔

اس قِسم کے لوگ کم پیدا ہوتے ہیں۔

محمد سعید

رُومانی ادب کا اثر ہمارے مُعاشرے پر

جناب ایم۔ اسلم صاحب

غالب نے کہا تھا ؎

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں مُعاف
آج کچھ درد مرے دِل میں سوا ہوتا ہے

آج میں بھی اپنا مضمون کچھ اسی قِسم کی معذرت کے ساتھ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

میرے مضمون کا عنوان "رُومانی ادب کا اثر ہمارے مُعاشرے پر" ہے۔ ادبی میدان بہت وسیع ہے۔ اس میں فلسفہ، سائنس، طب، نجوم، ریاضی، تاریخ، اِقتصادیات، نظم، غزل، اخلاقیات، کلاسیکل ادب اور رومان وغیرہ سبھی کچھ شامل ہے۔ مجھے جو کچھ کہنا ہے میں صرف رومانی ادب کے متعلق عرض کروں گا۔ کیونکہ آج کل یہی ادب عوامی متصور ہوتا ہے۔ عام طور پر رُومانی ادب سے ناول، افسانہ، داستان اور نظم مراد لی جاتی ہے۔ میں صرف نثری ادب کے متعلق کچھ عرض کروں گا۔ نظم کو زیرِ بحث لانا طوالت کا باعث ہوگا۔ گو نظم نے بھی ہمارے رومانی ادب میں بہت اضافہ کیا ہے۔

اب رہا یہ کہ ناول اور افسانہ کیسے اور کب وجود میں آیا، یا صنفِ ادب میں اس کی ضرورت کیوں محسُوس ہوئی۔ اس موضوع پر اس کثرت سے لکھا جا چکا ہے کہ اسے بار بار بیان کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔

ہمارے ہاں ایک رسم سی ہو گئی ہے کہ ہم جب تک کسی ایجاد کا سہرا مغرب کے سر نہ باندھ

لیں ہمارا ایمان مکمل نہیں ہوتا، لیکن میں اسے ایک احساسِ کمتری سمجھتا ہوں۔ اس کی وجہ ہماری قومی تاریخ سے بے خبری اور لاعلمی ہے۔ اگر ہمیں اپنی اسلامی تاریخ پر عبور ہو تو یہ دیکھ کر حیرت ہوگی کہ آج ہم جن باتوں کا اہلِ مغرب کو موجد سمجھتے ہیں، ان میں سے اکثر مغرب نے مسلمانوں سے مستعار لی ہیں۔ ہاں یہ تسلیم کہ دانش ورانِ مغرب نے اپنی ہنروری اور جدت سے اس میں بہت کچھ اضافہ اور ترقی کی ہے۔ اس میں ناول اور افسانہ بھی شامل ہے۔ ایجاد اور جدت کا مادہ اللہ کی دین ہے اور قدرتِ کاملہ نے اپنی بخششوں میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

کوئی قابل ہو تو ہم شانِ کئی دیتے ہیں
ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

جہاں تک رُومانی ادب کا تعلق ہے، اس میں کلام نہیں کہ مغربی اہلِ قلم نے اسکی نوک پلک سنوارنے میں بڑی کاوش سے کام لیا ہے اور اس کے لیے کچھ اصول وضع کر کے اسے ایک فن کی شکل وصورت دے دی ہے، جس سے ہم مشرق دانوں نے بھی بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ رومانی ادب کا جو مقام ہے وہ ادب سے زیادہ تفریح سے تعلق رکھتا ہے۔ ہر شخص اپنے مذاق کے مطابق تفریح کا سامان تلاش کرتا ہے۔ ایک علم دوست آدمی کو دماغی تفریح یا تسکین کتاب میں ملتی ہے۔ یوں بھی دانش وروں نے کتاب کو مونسِ تنہائی اور بہترین دوست کہا ہے۔

رومانی ادب کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ اس میں حسن وعشق کا بیان بہت نمایاں ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں رومانی کا مطلب کوئی عشقیہ داستان ہی لیا جاتا ہے، جو تاریخی بھی ہوسکتی ہے اور اصلاحی بھی۔ طربیہ بھی ہوسکتی ہے اور المیہ بھی۔ لکھنے والے کا کمال یہ ہے کہ وہ جس دَور کی عکاسی کرتا ہے، اس زمانے کی تہذیب، تمدن اور معاشرت کی ایک واضح تصویر الفاظ میں کھینچ کر دکھا دے۔

اِس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جس صنف ادب کو مغرب نے رُومان کا نام دیا ہے۔ وہ ہمارے ہاں بھی کہانی اور داستان کی شکل میں موجود تھی۔ مغرب کا قصّہ گو چوں کہ لکھ کر اپنا قصّہ بیان کرتا تھا، اِسی لیے وہ ناولسٹ کہلایا اور ہمارے ہاں وہ داستان گو کے نام سے مشہور ہوا۔ ہمارے داستان گو کو جو قصّہ سُنانا ہوتا اسے نوکِ زبان ہوتا۔

افسانہ ہو یا ناول اس میں دل کشی اور دل چسپی پلاٹ اور اسلوبِ بیان سے

پیدا ہوتی ہے اور زبان سونے پر سہاگے کا کام دیتی ہے۔ میں نے ابھی کہا تھا کہ رُومانی ادب یعنی ناول یا افسانے کے متعلق یہ کہنا کہ اس فن میں ہم مغرب کے خوشہ چیں یا شاگرد ہیں، غلط ہے۔ جنگِ آزادی سے پہلے اور اس کے بعد ہمارے ہاں بھی یہ صنفِ ادب موجود پائی جاتی ہے۔ مثلاً میر امّن دہلوی کی "باغ و بہار"، یا "فسانۂ عجائب" یا "طلسم ہوش رُبا" یا الف لیلے یا طوطا کہانی یا "فسانۂ آزاد" وغیرہ۔ یہ سب افسانے اور ناول کی ابتدائی شکلیں تھیں۔ جنگِ آزادی کے بعد جب انگریزی زبان ملک میں عام ہوئی تو ہمارے ہاں مغرب کے رُومانی ادب کو اردو میں ڈھالنے کا کام شروع ہوا۔ اس طرح ہمارے ادیب مغربی افسانے یا ناول سے آشنا ہوئے۔

مغلوں کے آخری دَور میں ہمیں انگریزوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ مغرب کا جادوگر علم دوست اور علم نواز ہونے کے ساتھ ساتھ ایک کائیاں سیاست داں اور نبّاض بھی تھا۔ اس نے ہمیں اپنے جال میں پھنسانے کے لیے اور اپنی مغربی تہذیب اور تمدّن سے مرعوب کرنے کے لیے اپنے جادو کے پٹارے سے عجیب عجیب شعبدے ہمیں دکھائے۔ مجھے مغرب کی سیاسی شعبدہ بازیوں کو اس بحث میں نہیں لانا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مغربی ساحروں نے صرف سَو سال کے عرصے میں بڑے عیارانہ انداز سے ہمیں نہ صرف ہماری سینکڑوں برس کی قابلِ فخر تہذیب و تمدّن اور شاندار قومی روایات سے ہی متنفر کر دیا، بلکہ ہماری ذہنیتوں میں بھی ایک سماجی ہیجان پیدا کر دیا۔ انگریز کے عہد میں جہاں تک مذہبی تصوّرات، سماج اور معاشرت کا تعلق تھا ہمیں پوری پوری آزادی حاصل تھی۔ احتساب تھا تو سیاسی آزادی پر تھا، قید تھی تو زبان پر تھی۔ حکومت کی پالیسی اور حکومت کے اعمال پر نکتہ چینی جرم تھا یعنی بقول علامہ اقبالؒ ؎

یہ دستورِ زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

تو خیر! مغربی تمدّن اور تہذیب نے ہمارے معاشرے میں آزادی کا، یعنی مغرب پرستی کا بیج بو دیا۔ زمین مغربی کھاد یعنی رسم و رواج کی نقالی سے پہلے ہی زرخیز بن چکی تھی۔ بیج پھوٹ کر پودا بن گیا۔ مغربی تعلیم نے اس کی آبیاری کی اور اس میں نئے نئے گل کھلائے۔ گو یہ پھول خوش بُو سے تو محروم تھے، لیکن شکل و صورت بڑی پیاری پیاری اور من موہنی تھی۔ ہم نے انھیں زیبِ گلو بنا لیا۔ مغرب کا ساحر یہ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا کہ اس کے جادو سے اس سرزمین کے رہنے والوں پر اس کا رنگ چوکھا چڑھ آیا ہے، جس سے اس کی گرفت اور

بھی مضبوط ہو جائے گی۔

ہماری گردنوں پر غلامی کا جوا رکھا ہوا تھا۔ مغربی تہذیب اور معاشرت کی ملمع کاریوں سے مرعوب ہو کر ہم اپنی شاندار تہذیب، پُر وقار تمدّن، باعزت معاشرت اور قابلِ فخر قومی روایات سے تہی ہو چکے تھے۔ آخر اس غلامانہ ذہنیت کی لعنت سے احساسِ کمتری کا شکار ہو گئے اور نزلہ اس پر ٹوٹی کہ حکمران کی نقالی شروع کر دی اور اسی ڈگر کو اپنے لیے باعثِ نجات سمجھا جس ڈگر پر حکمران قوم چل رہی تھی۔ گو ہم غلامی کی زنجیروں سے آزاد ہو چکے ہیں لیکن انگریز کے چلے جانے کے بعد بھی اسی پرانی اور خطرناک ڈگر پر گامزن ہیں اور آج بھی مغرب کی کافرانہ تقلید کو ہی اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتے ہیں۔ علامہ اقبال خلد آشیاں نے نوجوانوں کے غیر اسلامی تصورات کو دیکھتے ہوئے بڑے درد سے کہا تھا ؎

خوش تو ہیں ہم بھی جوانوں کی ترقی سے مگر
لبِ خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ
ہم تو سمجھے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ!

یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ مغرب کے ساحر کی جادوگری سے ہمارا دامن اپنی تہذیب و تمدّن، معاشرت اور قومی روایات سے خالی ہو چکا تھا۔ اب رہی سہی کسر انگریزی کے سستے، گندے اور اخلاق سوز لٹریچر نے پوری کر دی۔ حسن و عشق سے وابستگی انسان کی فطری کمزوری ہے۔ ہم حسن و عشق کی داستانیں، جن کا دوسرا نام رومانی ادب یعنی ناول اور افسانہ ہے، ہمیشہ شوق سے پڑھتے ہیں اور ان سے متاثر بھی ہوتے ہیں اور یہی وہ اثر ہے، جو ہمارا معاشرہ تیزی سے قبول کرتا ہے۔ مغربی رُومانی ادب کثرت سے ملتا ہے اور سستا بھی ہے۔ مغربی تہذیب اور تمدّن کا رنگ ہم پر پہلے ہی چڑھ چکا تھا۔ جب یہ گندہ اور سستا لٹریچر ہمارے ہاتھ آیا تو ہم پر پھر وہی مثل صادق آئی کہ ایک تو کریلا دوسرے نیم چڑھا۔ اُدھر انگریزی تعلیم کافی فروغ پا چکی تھی۔ تخلیق اور تفنّن کا مادّہ یہاں بھی موجود تھا۔ ہم جہاں مغربی معاشرے کے مقلد تھے، وہاں ہمارے ادیبوں نے ادب میں بھی مغرب کی تقلید شروع کر دی اور بتدریج ایسا رُومانی ادب تخلیق ہونے لگا جو پورا مغرب پرست تھا اور ہمارے ہونہار ادیبوں نے مغربی معاشرے کی تمام عریانیوں، بے باکیوں اور سُوقیانہ رَوِش کو اپنانا شروع کر دیا اور ہوتے ہوتے فحاشی اور عریانی بھی آرٹ میں داخل ہو گئی۔

یعنی ؎ ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

یہاں یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ ہمارے قدیم لٹریچر میں بھی اس قسم کی خرافات پہلے سے موجود تھی، مثلاً گلستان کا بابِ پنجم یا سعدی کی ہزلیات، یا قآنی کی کتاب "پریشاں"۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس قسم کا لٹریچر اس خیال یا مقصد سے نہیں لکھا گیا تھا کہ ادب میں فحاشی کو فروغ حاصل ہو۔ یہ مصنف کی ایک مجبوری تھی اور اس لٹریچر یا ادب کی نوعیت فرمائشی تھی جو بادشاہِ وقت کے تفنن اور خوشنودی کے لیے وجود میں آیا۔ خصوصیت سے "سعدی کی ہزلیات"۔

لیکن یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس صنفِ ادب میں پڑھنے والے کو ایسے رمز و اشارات اور نکات بھی ملتے ہیں جس سے کوئی نہ کوئی سبق اخذ کیا جا سکتا ہے۔ اس قسم کے ادب کو اس ہیئت کے اعتبار سے ایک تمثیلی انداز کہہ سکتے ہیں جس میں مصنف کا اصل مقصد رندانہ انداز میں اصلاحی اور تعمیری ہو اور معاشرے کو نقصان کے بجائے کچھ فائدہ حاصل ہو۔ وہی اصلاح اور تعمیر ہمارے ہاں کے رومانوں میں بالکل مفقود ہے۔ کیونکہ ہمارا ادیب جہاں تک رومان کا تعلق ہے اصلاح اور تعمیر کو ناول یا افسانے کی تکنیک کے خلاف سمجھتا ہے۔

ہمارے ہاں جو رومانی ادب لکھا جاتا ہے وہ صرف ذہنی عیاشی کے لیے لکھا جاتا ہے یعنی ذرا منھ کا مزا بدلنے کو۔ ہم چوں کہ مغرب کے مقلد ہیں ہماری تحریر اور تصنیف میں مغربی رنگ جھلکتا نظر آتا ہے۔ مغرب میں اس صنفِ ادب پر نہ کوئی قید ہے نہ بندش۔ انگریز جو کچھ کہے اور جس راہ پر چلے ہمیں بھی اس کے نقشِ قدم پر چلنا چاہیے، ورنہ ہمیں ترقی یافتہ کون کہے گا۔ اکبر نے خوب کہا ہے ؎

انسان کا علم کامل سابق میں تھا نہ اب ہے
لیکن نئی طرح کا اک تجربہ رہا ہے
مرزا غریب چپ ہیں، ان کی کتاب ردی
بدھو اکڑ رہے ہیں صاحب نے یہ کہا ہے!

ہمارے ہاں زیادہ تر جس قسم کا رومانی ادب یعنی افسانہ یا ناول لکھا جاتا ہے گو اس کی فضا مشرقی ہوتی ہے اور کردار بھی مشرقی آب و ہوا میں پروان چڑھتے ہیں لیکن پلاٹ میں مغربی تہذیب اور معاشرے کی اخلاق سوز جھلکیاں قدم قدم پر نظر آتی ہیں اور ہمارا معاشرہ بڑی شدت سے ان سے متاثر ہوتا ہے۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ اس فن میں ہم مغربی اہلِ قلم کے خوشہ چیں ہیں، تاہم یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ہمارے ناول اور

افسانہ لکھنے والوں نے بھی مشق اور سوچ بچار سے اس میں کچھ نہ کچھ جدّت اور اجتہاد سے کام لیا ہے لیکن اس کا کیا علاج کہ اس جدّت اور اجتہاد میں بھی مغربی معاشرے کی کافرانہ شوخیاں بڑی نمایاں ہوتی ہیں، جو ہمارے معاشرے کو داغ دار کر دیتی ہیں۔

سر سید رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ وہ قومیں جن کے سلف کی تاریخ یاد رکھنے کے قابل تھی لیکن انھوں نے بھلا دی، زمانے نے اس جرم کی پاداش میں انھیں چشمِ جہاں میں ذلیل اور رسوا کر دیا، لیکن وہ قومیں جن کے سلف کی تاریخ یاد رکھنے کے قابل نہ تھی اور اسے انھوں نے کبھی فراموش نہ کیا، زمانے میں سرفراز ہوئیں۔

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ جہاں تک ہمارے سلف کی تاریخ کا تعلق ہے اس آئینے میں ہمیں اپنی ہی شکل و صورت نظر آتی ہے۔ قومی تہذیب، قومی تمدّن اور قومی معاشرت کا نگہبان اور ذمّے دار سب سے زیادہ ایک ادیب یا مورخ ہوتا ہے۔ اگر قوم کی نگاہ ان چیزوں پر ہوگی تو معاشرہ بھی کندن کی طرح دمکتا نظر آئے گا، لیکن جب ہی تہذیب اور تمدّن مغرب کی چوکھٹ پر بھینٹ چڑھتا ہے تو معاشرہ اپنی اقدار کھو بیٹھتا ہے اور احساسِ کمتری گلوگیر ہونے لگتا ہے۔ لیکن ہم نے اس احساسِ کمتری سے گلوخلاصی کا یہ علاج سوچا کہ مغرب پرستی اختیار کر لیں۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اسی مغرب پرستی سے بیزار ہو کر کہا تھا ؎

پھر یہ غوغا ہے کہ لا ساقی شرابِ خانہ ساز!
دل کے ہنگامے مئے مغرب نے کر ڈالے خموش

ملک کے پڑھے لکھے طبقے کا رجحان مغرب کی طرف دیکھ کر ناخدائے قوم سر سیّد احمد خاں اور ڈپٹی نذیر احمد خاں دہلوی کو یہ کھٹکا ہوا کہ اس کا ہمارے اسلامی معاشرے کے لیے خطرناک ہونے کا اِحتمال ہر وقت موجود ہے۔ چناں چہ اس کی روک تھام کے لیے سر سید نے تہذیب الاخلاق میں ایسے مضامین لکھنے شروع کیے جن کا موضوع قومی، ملّی، اخلاقی اور معاشرتی تھا۔ اس کے علاوہ مولانا حالی سے مسدّس، جس کا نام رہتی دنیا تک اردو ادب میں تابندہ رہے گا، لکھوایا۔ ڈپٹی نذیر احمد خاں دہلوی نے اس خطرے کے تدارک کے لیے کچھ اصلاحی اور معاشرتی ناول لکھے، لیکن معاشرے پر چوں کہ مغرب کا جادو چل چکا تھا، یہ کوششیں کچھ ایسی بارآور ثابت نہ ہو سکیں۔

مغربی نگینوں کی جھوٹی چمک نے چوں کہ کھوٹے اور کھرے کی تمیز مٹا دی تھی، لوگ ایسا ادب پسند کرتے تھے جو صرف تفریح کے لیے ہو اور جس سے جذبات برانگیختہ ہوں،

اِس قسم کی تسکین کے لیے ہمارے کچھ ادیبوں نے مغربی مصنّفین کی پَیروی شروع کر دی اور ایسے افسانے اور ناول کا جو رنگ ہم دیکھ رہے ہیں، دُوسری جنگِ عظیم تک ایسا نہیں تھا۔ اس کی وجہ یا تو حکومت کے ڈنڈے کا ڈر تھا یا یوں سمجھیے کہ ہماری اخلاقی اقدار کو اس حد تک پھپھوندی نہیں لگی تھی۔ بادۂ کہن کی تلچھٹ کچھ باقی تھی، لیکن دوسری جنگ کے بعد رُومانی ادب کچھ اچانک ہی چمک اٹھا اور ناول تو بہت کم، لیکن افسانوی ادب میں عُریانی اور فحاشی بہت راہ پاگئی۔ معاشرے کا اس سے متاثر ہونا بھی لازمی تھا۔

اسی زمانے میں ایک ایسا دَور بھی آیا، جسے ہم جاسوسی اور سنسنی پیدا کرنے والے ناولوں یعنی جاسوسی ناولوں کا دَور کہہ سکتے ہیں اور جو حقیقت میں رُومان کی ایک بگڑی ہوئی شکل تھی۔ ان جاسوسی ناولوں کا پلاٹ سو فی صد مغرب کے سَستے اور بازاری ناولوں سے مستعار ہوتا، لیکن یہ دَور جلد ہی ختم ہوگیا۔ جاسوسی ناولوں کے بعد ناول نویسوں میں سنسنی خیز ناول لکھنے کا ہسٹیریا پیدا ہوگیا اور "مسٹری" کے ہسٹریا میں یار لوگوں نے اپنے ہاں کا شاید ہی کوئی بڑا شہر ہوگا جس کی مسٹری نہ لکھ ڈالی ہو۔

ان ناولوں کا موضوع کسی لڑکی کا گھر سے اچانک غائب ہو جانا، یا عاشق کا اپنی محبوبہ کو بدمعاشوں کے تعاون سے اغوا کرلینا یا جھوٹی سچی کسی کے قتل کی افواہ یا کسی نادر چیز کا پُراسرار طور پر گم ہو جانا، کچھ ایسا ہی ہوتا۔

اس وبا کو عام کرنے میں آنجہانی منشی تیرتھ رام فیروز پوری کا نام سرِفہرست نظر آتا ہے۔ انھوں نے اس قسم کے انگریزی کے اور ناولوں کے علاوہ "مسٹری آف لندن" اور "مسٹری آف کورٹ آف لندن" کو اُردو کا جامہ پہنایا۔ جاسوسی ناولوں کی تحریک کینن ڈائل کے مشہور رومانی کیرکٹر شرلاک ہومز سے ہوئی، لیکن غور کرنے کا مقام یہ ہے کہ اس کے اس قسم کے رُومانی ادب سے ہمارے معاشرے نے کیا اثر لیا: صرف جرم کرنے کا شوق، اور جرم کے فن میں نئی نئی جدّتیں۔ خدا خدا کر کے یہ دَور بھی آخر ختم ہوگیا، لیکن اس کا کیا علاج کہ ؎

ہر بلائے کز آسماں آید گرچہ بر دیگرے قضا باشد
بر زمیں نارسیدہ پُرسد خانۂ انوری کجا باشد

اب وہ زمانہ تھا جب دنیا میں روس کے سرخ سویرے کا چرچا زوروں پر تھا۔ اشتراکیت کے قدم مضبوطی سے جم رہے تھے۔ اشتراکیت کے اصُول ہی کچھ ایسے ہیں کہ خصوصیت سے نوجوان طبقے کو اس سے بہت آسودگی حاصل ہوتی ہے۔ جہاں زندگی کی دوسری نئی نئی اقدار کے ساتھ

یہ بھی ہو کہ کھاؤ پیو اور عیش کرو، ہمارا نوجوان طبقہ اس سے کیسے علیحدہ رہ سکتا تھا۔ ہمارے منچلے ادیبوں کے لیے تو وہی بات ہوئی جیسے بلّی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ ایک بڑی تعداد نے سرخ سویرے کو اپنا ایمان بنالیا۔ اب اٹھتی جوانیوں کے سامنے نئے نئے ولولے تھے، نئے نئے شوق تھے، نئی نئی آرزوئیں اور راہیں تھیں۔ زندگی کے لیے ایک ایسا پروگرام موجود تھا جس میں کیف زیادہ اور فکر کم تھا۔ سب سے زیادہ یہ کہ سرخ سویرے سے مذہب خارج تھا۔ کیوں کہ اشتراکی نقطۂ نظر سے مذہب ترقی کے راستے میں ایک رکاوٹ ہے اور زندگی میں سکون اور امن کی نسبت خلش اور کاوش کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ اس لیے مذہب کو شات سلام۔ حالانکہ انسان کی شان اگر قائم ہوتی ہے تو مذہب سے ہوتی ہے۔ رہا خدا کا تصور تو وہ بس ایک تصور تھا، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ یہ سب باتیں ہمارے خدا ناآشنا ادیبوں کے شوق کے لیے ایک تازیانہ ثابت ہوئیں۔ چناں چہ وہ سرخ سویرے کے علمبردار بن کر زندگی کی ان اشتراکی اقدار پر رُومانی ادب کی داغ بیل ڈالنے لگے جو اسلامی تعلیم، اخلاق اور اسلامی مزاج کی ضد تھا۔ اس سے بھی انکار نہیں کہ سرخ سویرے والے اکثر ادیبوں کی تحریر میں زورِ بیان بھی تھا اور حسنِ بیان بھی۔ افسانہ ہو یا ناول، اس کے پلاٹ میں ندرت بھی تھی اور جدت بھی۔ ان فن کاروں نے اس قسم کے ادب کو ادب برائے زندگی کے نام سے پیش کیا لیکن دیکھنا تو یہ ہے کہ اس ادب برائے زندگی سے معاشرے کو کیا ملا۔ یہی فحاشی، عُریانی اور جنسی تسکین کی تحریک۔ اسلامی اور اخلاقی تصورات سے فرار یا کچھ اور بھی؟ انقلاب اور آزادی کے غلط تصورات نے ہمارے ترقی پسند ادیبوں کو جن کا مقصد اشتراکیت کی اصلی رُوح کے مطابق صرف حقیقت نگاری ہونا چاہیے تھا، رُومان کے گڑھے میں جا گرایا۔ حالانکہ اشتراکیت رومان کی ضد متصور ہوتی ہے اور یہ لوگ اپنے ناولوں اور افسانوں میں حقیقت کو نظر انداز کر کے سستی اور سطحی لذت پرستی کا پرچار کرنے لگے۔ اور ستم تو یہ ہے کہ عورت کی حمایت کرنے کے بجائے اس غریب کو چشمِ جہاں میں رُسوا کر دیا۔ اس قسم کا ادب حقیقت نگاری کے برعکس تعیش پرستی ہے۔ رہا معاشرہ تو اس نے اس قسم کے رومانی ادب سے جو اثر لیا ہے، آج وہ سب کے سامنے ہے اور یہ بھی اسی رومانی ادب کی کرامت ہے کہ افراد قوم میں قومی کیریکٹر کا خوف ناک فقدان نظر آرہا ہے۔ اس ترقی پسند ادب میں جس میں ناول کم اور افسانے کثرت سے لکھے گئے ہیں، مَردوں کے دوش بدوش کچھ منچلی عورتوں کے نام بھی نظر آتے ہیں اور یہ محترم ہستیاں اس فن میں مَردوں سے بھی زیادہ آزاد اور بے باک نظر آتی ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے اس قسم کے ترقی پسند ادب میں کوک شاستر کا رنگ خوب

نکھرانکھرا نظر آتا ہے، خصوصیت سے افسانوی ادب میں۔ یعنی وہ ادب برائے زندگی جس نے زندگی کی صحیح اقدار اجاگر کرنے اور سیدھا اور آسان راستہ بتلانے کے بجائے ملک کے نوجوان طبقے کے اندر اخلاقی انتشار پیدا کر دیا ہے۔ شروع شروع میں ہمارا معاشرہ مغرب کی نقالی پر اُدھار کھائے بیٹھا تھا۔ اب مغربی لٹریچر کی تقلید کو بھی ہمارے نوجوان ادیبوں نے جزوِ ایمان بنا لیا اور دوسری باتوں کی طرح مغرب کے رومانی ادب کی پیروی بھی فیشن میں داخل ہو گئی اور اس نے ہماری معاشرت کو اور بھی مضحکہ خیز بنا دیا۔

اکبرؔ نے کیا خوب پتے کی بات کہہ دی ہے ؎

لیلیٰ نے سایہ پہنا مجنوں نے کوٹ پہنا
ٹوکا جو میں نے بولے بس بس خموش رہنا
حُسن و جنوں بدستور اپنی جگہ ہیں لیکن
ہے لطف بہرِ ہستی فیشن کے ساتھ رہنا

جس طرح بازار میں کبھی کبھی جوتا چل جاتا ہے، یہاں پاکستان میں فیشن چلتا ہے جس کی زندہ مثال یہ آج کا ٹیڈی ازم ہے۔ معاشرے کی یہ ایک خوف ناک کمزوری ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کے رسم و رواج سے جلدی مرعوب ہو جاتا ہے۔ چونکہ مغربی معاشرے میں فحاشی یا عُریانی جرم نہیں سمجھا جاتا، اِس لیے وہاں اِس پر کوئی قانونی حد عائد نہیں، لیکن ہمارے ہاں یہ ایک ایسا جرم ہے جو قانون کی گرفت میں آتا ہے۔ یہاں فحاشی یا عُریانی کا رومان میں تو ذکر ہونا ہی رہتا ہے لیکن اب خاکم بہ دہن حضور علیہ الصلواۃ والسّلام کی ذاتِ اقدس پر بڑے سوقیانہ انداز میں ایسی خوف ناک گندگی اُچھالی جاتی ہے کہ آسمان پر شاید کرّوبیاں بھی کانپ جاتے ہیں لیکن ہمارے ہاں حکومت صرف کتاب ضبط کر لینا ہی کافی سمجھتی ہے۔ مصنّف کو صاف چھٹی دیدیتی ہے۔ اِنَّ لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ اِس قسم کی خرافات ہمارے ایمان کی کمزوری ہے۔ معاشرے کی کمزوری ہے۔ اسلامی تصوّرات کا نقص ہے اور اس کا ذمّے دار ہمارا آج کا رُومانی ادب ہے۔ وہ ادیب جو اِس قسم کے ادب کو ادب برائے زندگی کہتے ہیں، میرے نقطۂ نظر سے یہ ادب قوم و ملّت اور معاشرے کے لیے ایک ایسا زہر ہے جس کا تریاق صرف اسلامی تصوّرات کی پختگی ہو سکتی ہے جو حالات کو دیکھتے ہوئے مشکل سی بات نظر آتی ہے۔ اکبرؔ نے کیا خوب کہا ہے ؎

تمام دُنیا نئی روش میں جو چھوڑ بیٹھے گی دینِ حق کو ۔۔۔ جو ایک مومن بھی ہو گا زندہ تو ہم سے ایسا نہ ہو سکیگا
دوا ترقی کی گرچہ ہی ہے بصد ادب ہے مری گزارش ۔۔۔ مرض ترقی کرے گا اس سے مریض اچھا نہ ہو سکے گا

(تیسرے مصرع میں جو خفیف سا تغیر ہے اس کے لیے میں حضرت اکبر کی رُوح سے مُعافی کا طلب گار ہوں)۔ اِس قسم کے رُومانی ادب کا سب سے بڑا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان قومی اقدار سے جو معاشرے کے لیے قابلِ فخر ہوتی ہیں۔ نوجوانوں میں بغاوت کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ عورت کے لیے اللہ تعالٰی نے جو احکام دیے ہیں ان کا مذاق اڑایا جائے اور قومی تصورات کو قدامت پسندی کہا جائے اور سوسائٹی کو آزادی کی اس راہ پر ڈالا جائے جس کا نام بے راہ روی ہے۔ مجھے افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ ایسے رومانی ادب سے ہمارا طبقۂ نسواں خوف ناک حد تک متاثر ہوا ہے۔ کسی قوم کے معاشرے کی تخلیق اور گھریلو نظامِ زندگی میں مرد سے زیادہ عورت کا حصّہ ہوتا ہے، کیونکہ اس پر بہت سی خانگی اور سماجی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ قدرت نے عورت کو ایثار، حیا، شرم اور محبت کی نعمت عطا فرمائی ہے اور اسی نعمت سے کارزارِ حیات میں وہ عزّت اور احترام کی نظروں سے دیکھی جاتی ہے لیکن ہمارے رومانی ادب کے خالقوں نے اپنے قلم کی بے باکیوں اور رنگیں بیانیوں سے ان اعلیٰ جذبات کو ملیامیٹ کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ ان لوگوں نے عورت کے سامنے معاشرے کی ایک ایسی تصویر پیش کی ہے جو پھول کی طرح خوب صورت تو ہے، لیکن خوش بُو سے بالکل خالی ہے۔

زلیخا کو جو عشق نے پردۂ عصمت سے باہر کھینچ نکالا تھا تو وہ ایک فطری جذبہ تھا، لیکن ہمارے رُومانی ادب نے جس میں ناول کم اور افسانے کثرت سے ہیں، عورت کو جذبات نگاری کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا کر ملک و ملت پر ایک خوف ناک ظلم کیا ہے اور اپنے مُعاشرے کو بھی اغیار کی نظروں میں مضحکہ خیز بنا دیا ہے۔

اِس تماشہ گاہِ عالم میں مَرد کے لیے عورت قدرت کا ایک ایسا عطیّہ ہے، جس کی قدر و قیمت کا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا۔ اس عورت کے لیے ایک مقام ایسا بھی آتا ہے، جہاں وہ ماں کہلاتی ہے۔ وہی ماں جس کے قدموں کے نیچے اسلام نے جنّت بتائی ہے۔ اس کی محبت شوہر کے لیے ہو یا اولاد کے لیے یا ملک و ملت کے لیے ایک ایسا بحرِ بے کنار ہے جس کی وسعتوں کا اندازہ انسان کا ادراک نہیں لگا سکتا۔

کہا جاتا ہے کہ نظامِ کائنات جب مکمل ہو گیا تو خالقِ کون و مکان نے فرشتوں سے اس کے متعلق ان کی رائے پوچھی۔ فرشتوں نے سجدہ ریز ہو کر عرض کیا کہ خداوندا! تیری صنعت گری ہر تعریف سے بالاتر ہے، لیکن ایک چیز نظر نہیں آتی۔ ارشاد ہوا، وہ کیا؟ فرشتوں نے عرض کیا، بارالٰہا! محبت! ارشاد ہوا، محبت ماں کے سینے میں مضمر ہے۔ خیال فرمائیے! جس

عورت کا یہ مرتبہ اور اتنا بلند مقام ہو، ہمارے ادیب کا اپنے شوق کی تسکین کے لیے اس کے جذبات سے کھیلنا کتنا ظلم ہے۔

سوال یہ ہے کہ معاشرہ کیا ہے؟ معاشرہ نہ تو مٹّی کا کوئی خوب صورت کھلونا ہے، نہ کسی بلوری کنٹر کا نام ہے، نہ یہ بھان متی کا تماشہ ہے، بلکہ یہ ایک ایسا نظام ہے جس میں قوم کی تہذیب، تمدّن، ادب، زبان، سیاست، اقتصادیات، مذہبی تصوّرات، تعلیم، رسم و رواج اور رہن سہن کا طریق سب شامل ہیں لیکن جہاں تک رومانی ادب کا تعلق ہے، ناول ہو یا افسانہ اس میں ان چیزوں پر کبھی بھولے سے بھی اظہارِ خیال نہیں کیا جاتا۔ کیوں کہ یہ سب کچھ ناول اور افسانے کی تکنیک سے خارج ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ تکنیک آسمان سے اتری ہے تو خیر! لیکن اگر یہ انسان کی بنائی ہوئی ہے تو پھر انسان کو یہ حق بھی ہے کہ وہ زمانے کی ضرورت کے مطابق اس میں ردّ و بدل کر سکے۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ اگر رومانی ادب میں مذہب اور سیاست کا ذکر آ جائے تو پڑھنے والے کے پیٹ میں مروڑ اٹھنے کا خوف ہوتا ہے۔ ایسا مروڑ جس کا علاج شاید جناب حکیم محمّد سعید صاحب ایسے حاذق طبیب کے پاس بھی نہ ہو۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ گزشتہ سولہ سال سے کشمیر کا قضیہ ہم پاکستان والوں کے لیے موت اور زندگی کا مسئلہ بنا ہوا ہے۔ ہر دردمند انسان کو کشمیر کے چالیس لاکھ مظلوم مسلمانوں سے جو بھارتی فوج کی سنگینوں کے سائے میں زندگی کا سانس لے رہے ہیں، ہمدردی ہے، لیکن اگر اس سے کوئی بے پروا ہے تو ہمارا ادیب ہے۔ اِس نازک مسئلے پر گزشتہ سولہ سال میں مشکل سے ہی ایک آدھ ناول ایسا لکھا گیا ہے جس میں کشمیر کا سوال بھی زیرِ بحث آیا ہو۔

لارڈ لٹن کا قول ہے: انسان کی حکومت میں ایک ادیب کا قلم تلوار سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ اگر ہمارے رومانی ادب کے خالقوں کے دل میں مذہب کا احترام ہو اور قوم اور ملت کا درد ہو تو وہ قلم سے قوم کے دل میں ایک ایسا جذبہ پیدا کر سکتے ہیں جس سے کشمیر کا مسئلہ جو سولہ سال سے حل نہیں ہو سکا، دنوں اور مہینوں میں حل ہو سکتا ہے۔ یہ ادیب کا قلم ہی ہے جو معاشرے کی اصلاح کر سکتا ہے۔ قوم میں یہ ایمان افروز جذبہ پیدا کرنے کے لیے واعظ کی پختہ خیالی اِتنی کار آمد اور مفید نہیں ہو سکتی جتنا ایک افسانہ یا ناول ہو سکتا ہے، لیکن یہ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے ادیبوں کا رُجحان تعمیر سے زیادہ تخریب کی طرف ہے۔ قوم اور قوم کے درد سے انھیں کچھ واسطہ نہیں۔ شاید ایسے ہی رجحانات دیکھتے ہوئے حکیم الامّت حضرت اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے کہا تھا کہ ؎

کسی بُت کدے میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی ہَری ہَری
گلۂ جفا و فا نما کہ حرم کو اہلِ حرم سے ہے

حکیم الامت عرش آشیاں کا ارشاد ہے کہ انسان جب مذہب سے کورا ہوتا ہے تو اس کا اثر اس کے اخلاق پر پڑتا ہے اور جب کوئی قوم اپنے اخلاق سے تہی دست ہوتی ہے تو اس سے ایک بڑی خوف ناک حد تک معاشرہ متاثر ہونا شروع ہوتا ہے اور جب معاشرہ بگڑتا ہے تو قوم کو زوال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

آج ہماری بھی کچھ ایسی ہی حالت ہے۔

یہ سو بار تسلیم کہ ادب کو برائے زندگی ہی ہونا چاہیے لیکن جب بھی ادب زندگی کی اعلا اخلاقی اقدار سے بغاوت پر آمادہ کرے۔ حبُ الوطنی کا مذاق اڑائے۔ اور تو اور پاکستان کے قیام کو بھی مضحکہ خیز سمجھے۔ فرمایئے اس قسم کے ترقی پسند ادب سے خود ادب اور معاشرے کو کیا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے؟ قدرت کا یہ عجیب قاعدہ ہے کہ جہاں مذہب کا تازیانہ نہ ہو اور قوم کی اخلاقی اقدار پر احتساب نہ ہو وہاں غلط روی اور سوقیانہ پن کو جلدی فروغ حاصل ہوتا ہے۔ انسان کا ضمیر ہی کچھ ایسا ہے کہ وہ نئی تحریک کو بلا سوچے سمجھے لبیک کہنے لگتا ہے۔ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد بھی قومی اقدار اور مذہبی تصورات جس طرح مجروح ہوئے ہیں، انھیں دیکھ کر افسوس بھی ہوتا ہے اور حیرت بھی۔ مذہب سے بیزاری اور اخلاقی اقدار کے ضعیف ہونے سے ہمارا قومی لٹریچر بھی اپنی افادیت کھو چکا ہے اور اس کا اثر سب سے زیادہ ہمارے معاشرے نے قبول کیا ہے۔ ہر قوم کا ایک کوڈ آف آنر ہوتا ہے۔ کوڈ آف آنر سے میرا مطلب انسان کی وہ اعلا اخلاقی اقدار ہیں جو صرف مذہب کا دامن تھامنے سے حاصل ہوتی ہیں یا قومی معاشرہ انھیں پروان چڑھاتا ہے۔ ہمارا کوڈ آف آنر آج صرف مغرب پرستی ہے جس سے ہمارے ادیب کا قلم بھی خوف ناک حد تک متاثر نظر آتا ہے۔ ہمارا ادیب آج جس قسم کا رُومانی ادب ہمیں عطا کر رہا ہے وہ ہمارے مزاج اور قومی تقاضوں کے بالکل خلاف ہے۔ ہم اپنے رُومانی ادب میں جو فضا پیدا کرتے ہیں، جن اقدار کی نمائندگی کرتے ہیں، جس قسم کے کیرکٹر پیش کرتے ہیں، جس تہذیب اور تمدّن کی وکالت کرتے ہیں، یہ ہمارے اسلامی یا پاکستانی معاشرے کے لیے بہت خطرناک ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہمارے اکثر ادیب نہ مذہبی تصوّرات کے قائل ہیں۔ نہ وہ پاکستان کی فلاح و بہبُود کے لیے کوشش کرتے ہیں، نہ انھیں پاکستان کو مضبُوط بنانے کی فکر ہے۔ یوں تو وہ مسلمان بھی ہیں اور پاکستانی بھی، لیکن ان کا دل اسلامی تصوّرات سے خالی ہے۔ ان کے دل کی ترجمانی ان کا قلم کرتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے کیا خوب کہا ہے۔

جو میں سر بہ سجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

میں لارڈ لٹن کا مقولہ ابھی ابھی درج کر چکا ہوں یعنی ادیب کا قلم تلوار سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ ادب اور ادیب ایک زبردست طاقت کے دو نام ہیں۔ ادیب کا قلم توپ و تفنگ سے زیادہ زوردار ہوتا ہے۔ ادیب کو اگر اپنی قومی روایات پر فخر ہو، مذہب سے وابستگی ہو، وطن سے محبت ہو، دل میں قوم کا درد ہو تو وہ اپنے رومانی ادب سے بھی قوم کی کایا پلٹ کر سکتا ہے، معاشرے کو چار چاند لگا سکتا ہے۔ وہ اپنے قلم سے چاہے تو پاکستان کیا ایک دنیا کو اپنے قلم کا گرویدہ بنا سکتا ہے۔ یہ کہنا کہ رومانی ادب میں مذہب، سیاست اور اخلاق کا ذکر پسند نہیں کیا جاتا، محض غلط ہے۔ ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ وہ رومانی ادب جس میں اصلاحی اور تعمیری نقطۂ نظر پیش کیا جائے، اس رومانی ادب سے جس کا مطلب صرف ذہنی عیاشی ہو، آج زیادہ کامیاب ہے۔ بہرکیف یہ دیکھ کر کچھ اطمینان بھی ہوتا ہے کہ کچھ ناول ایسے بھی نظر آتے ہیں، جن میں مغربی نظریات اور تمدن کی عکاسی کے بجائے مشرقی فضاؤں میں مشرقی اور اسلامی معاشرے کی ترجمانی کی جاتی ہے اور کہیں کہیں معاشرے کی اصلاح کا جذبہ بھی نظر آتا ہے۔ یہ ناول ان کے ناشر کی زبان میں اردو کی آبرو تو ہو سکتے ہیں لیکن ہمارے قومی مسائل کا حل یا تعمیری نقطۂ نظر ان میں کہیں نظر نہیں آتا۔ آج پاکستان کو ایسے رومانی ادب کی ضرورت ہے، جس کے مطالعے سے دماغی آسودگی کے ساتھ ساتھ معاشرے کی اصلاح پر زور دیا جائے۔ قومی مسائل کو زیرِ بحث لایا جائے۔ قوم کی اخلاقی اقدار بلند ہوں۔ تفریح کے ساتھ تعمیر کا پہلو بھی نمایاں ہو۔ گو آج کا ادبی رجحان دیکھتے ہوئے ہر طرف سے مایوسی ہی نظر آتی ہے، لیکن پھر بھی ؎

نہیں ہے نا امید اقبالؔ اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

شامِ ہمدرد۔ لاہور
مارچ ۱۹۶۴ شمسی



جوش ملیح آبـادی

[شام همدرد کراچی ، ۲۰ مارچ ۱۹٦٤ شمسی]

جوشؔ ملیح آبادی

۵ر دسمبر ۱۸۹۸ شمسی

حضرت جوشؔ ملیح آبادی اُن عظیم انسانوں میں سے ہیں، جن کو ہم بلا تامل قوم کی دولت کہہ سکتے ہیں۔ وہ ایک عہد آفریں شاعر ہی نہیں بلکہ ایک عظیم شخصیت بھی ہیں۔ اُن شخصیت میں ہمہ گیری، ان کی شاعری میں گہرائی، اِن کی فکر میں گہرائی اور ان کی زندگی میں بے ترتیبی ہے، جو اپنی جگہ ایک حسن ہے۔ جوشؔ صاحب کا مشرب وسیع، نظر وسیع اور قلب بھی وسیع ہے۔ جوشؔ صاحب کو نقصان کی فکر نہیں ہوتی اور ہر اُس آدمی کو نہیں ہوتی، جو اپنی اقدار کو قیمتی سمجھتا ہے اور دنیاوی نقصان کی صورت میں اعلا اقدار کی قیمت ادا کرتا ہے۔

حضرت جوشؔ ملیح آبادی کی سیرت بڑی پہلو دار، ان کی زندگی سادہ اور ان کی شاعری بڑی متنوّع ہے۔ ان کی شاعری کے موضوعات براہِ راست زندگی سے پیدا ہوئے ہیں، کتابوں اور نظریات سے نہیں۔ وہ شاعری میں پروپیگنڈے کے قائل نہیں، بلکہ ادب کی دَوامی اقدار میں یقین رکھتے ہیں۔ زندگی کا کون سا حسن اور زندگی کا کون سا عیب ہے، جس کو جوشؔ صاحب نے شعر کے سانچے میں نہ ڈھالا ہو۔

جوشؔ صاحب کے کردار کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ وہ نڈر، جری اور بے باک واقع ہوئے ہیں اور صاف گوئی ان کی نمایاں خصوصیت ہے۔ وہ چھوٹوں کی غلطیوں سے توچشم پوشی کر لیتے ہیں یا معاف کر دیتے ہیں، لیکن کسی بڑے کی غلطی کو اپنے قول و عمل سے محسوس کرا کر مانتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ خصوصیت معمولی نہیں ہے اور اس کو باقی رکھنے کے لیے قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ جوشؔ صاحب نے قربانیاں دی ہیں، نقصانات اٹھائے ہیں اور متوقع فائدوں کو ٹھکرایا ہے۔ ان کی طبیعت میں جہاں ایک طرف خود داری، بے نیازی اور بے باکی ہے، وہاں اخلاق، مروّت، تواضع اور تپاک بھی ان کی سیرت کا جزو ہیں۔ وہ

تکبر اور تصنّع سے کوسوں دور ہیں۔ وہ اپنے ہر ملنے والے سے چاہے وہ چھوٹا ہو یا بڑا، ایک ہی طرح ملتے ہیں، لیکن حفظِ مراتب کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ جوش صاحب کے ملنے کے انداز میں بڑی بے ساختگی اور بے تکلفی ہے، لیکن اس بے تکلفی میں پوری شائستگی ہوتی ہے۔ یہی وہ صفات ہیں جو ہر ایک کو ان کا گرویدہ بنا دیتی ہیں۔

جوش صاحب کے کردار کے یہی پہلو شاعری میں بھی نمایاں ہوتے ہیں۔ ہمیں ان کی شاعری میں ان کی زندگی کی واضح چھاپ ملتی ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ان کی شاعری اردو فارسی شاعری کی بہترین روایات کی حامل ہے اور انھوں نے ان روایات کو آگے بڑھایا ہے۔

محمد سعید

کیا غزل ایک فطری صنفِ سخن ہے؟

حضرت جوشؔ ملیح آبادی

قدما نے غزل کی تعریف کی ہے "سخن گفتن با زنان" یعنی عورتوں سے باتیں کرنا۔ ماں بہن سے نہیں بلکہ معشوقوں سے حرف و حکایت میں مشغول ہونا۔ ظاہر ہے کہ معشوقوں سے سائنس، سیاست، ریاضی یا حکمت کے مسائل پر باتیں نہیں کی جاتیں، اپنے ارمانوں کا اظہار کیا جاتا ہے اور معشوقوں کو ابھارا جاتا ہے کہ وہ عاشق پر رحم کریں اور اس کی مرادیں بر لائیں۔ جس کے اس کے سوا اور کوئی معنی ہو ہی نہیں سکتے کہ غزل کی بنیاد جنسی جذبے کی زمین پر رکھی جاتی ہے یعنی غزل کی پشت پر لذتِ جسمانی اور افزائش نسل کا تصور سوار رہتا ہے، جس کے یہ معنی ہیں، غزل کا پودا خام کار و برق شعار جوانی کی زمین پر اُگتا اور پھبکتا ہے اور جس وقت کہ جوانی ڈھل جاتی ہے، یہ پودا بھی خشک ہو کر رہ جاتا ہے۔ لیکن ہماری قوم میں یہ عجیب صفت ہے کہ جوان ہی نہیں، ستر ستر اسی اسی برس کے بوڑھے تک غزلیں کہتے ہیں اور غزلیں کہتے کہتے مر جاتے ہیں، جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ ہمارے ملک کے غزل گویوں کا ذہنی موسم ہمیشہ یکساں رہتا ہے اور ان کی جوانی پر کبھی زوال ہی نہیں ہے۔ غور کرنا اس بات پر چاہیے کہ آیا ہمارے غزل گویوں کے عناصرِ ترکیبی ہی ایسے ہوتے ہیں کہ پیری ان پر اثر نہیں کر سکتی یا پھر صورتِ حال یہ ہے کہ دراصل غزل میں تاثیر ہے کہ ان کو بوڑھا نہیں ہونے دیتی۔

اگر غزل کی یہ تاثیر ہے تو ہمارے طبیبوں، ویدوں اور ڈاکٹروں کا یہ فرض ہونا چاہیے کہ وہ

اعادۂ شباب یا بقائے جوانی کی تمام تدابیر سے دست کش ہو جائیں اور ہر فرد کو غزل گوئی کے میدان کی طرف ہانک دیں۔

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا، میں ابھی یہ کہہ رہا تھا کہ غزل جنسی جذبے کی پیداوار ہوتی ہے اگر کوئی صاحب یہ سن کر یہ فرمائیں کہ نہیں، غزل سراسر ذوقِ جمال اور حسن پرستی پر مبنی ہوتی ہے تو اس کے جواب میں یہ عرض کروں گا کہ حسن پرستی بھی جذبۂ جنس ہی کی ایک شاخ ہوتی ہے، لیکن بات کو طوالت سے بچانے کی خاطر یہ بات مان بھی لی جائے کہ غزل جنس پر نہیں جمال پر مبنی ہوتی ہے تو میں یہ کہوں گا کہ حُسن صرف عورت تک محدود نہیں، حُسن تو ذرّوں سے لے کر تاروں تک جاری و ساری ہے اور زمین سے لے کر آسمان تک پھیلا ہُوا ہے۔ اگر غزل مبنی بہ حُسن ہے تو اس میں کائناتی حُسن کی پرستش کا فقدان کیوں ہے؟ کیا غزل میں طلوع و غروب، شمس و قمر، قوس و کہکشاں اور روزِ ابر و شبِ ماہ کی عکاسی پائی جاتی ہے۔ کیا کوئی غزل دریا کی رَوانی، برکھا کے پانی اور پھولوں یا تتلیوں کے الوان کو کبھی بھول کر بھی پیش کرتی ہے۔

اس ایک بات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ غزل گو کائناتی جمال کو آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا اور صرف عورتوں کے خال و خط پر نگاہیں جمائے رہتا ہے۔ میں جذبۂ جنس کو بُرا کہنے کی تاب نہیں لا سکتا، اِس لیے کہ یہ قدرت کا ایک ایسا عطیّہ ہے اور موت کے مقابلے میں حیات پیدا کرنے کا ایک ایسا آلۂ کار ہے کہ اگر یہ نہ رہے تو دنیا ویران ہو کر موت کے قبضے میں چلی جائے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہوں گا کہ اس کرّۂ ارض کا ہر ذرّہ ہر آن پکار پکار کر التجا کر رہا ہے کہ اے شاعر، مجھ کو اپنا موضوعِ سخن بنا لے، لیکن یہ تمام شور غزل گو کے کانوں تک نہیں پہنچتا اور وہ جوان عورت کے پیچھے بھاگا چلا جا رہا ہے۔

جوان تو جوان ہمارے بوڑھے غزل گو بھی جو قبروں میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں ؏

خیالِ زلفِ جاناں کب ہمارے دل سے نکلے گا

کے نعرے لگا رہے ہیں اور مرتے دم تک یہی نعرے لگاتے رہیں گے۔

آخر یہ معاملہ کیا ہے؟ یہ بے وقت کی راگنیاں کیوں چھیڑی جاتی ہیں؟

بندہ پرور ہر چند کہ قدما نے غزل کی تعریف "معشوقوں سے باتیں کرنا" کی ہے، لیکن غزل اس تعریف کے معیار پر بھی پوری نہیں اترتی، اس لیے کہ ہماری ایک غزل بھی مطلع سے لے کر مقطع تک "معشوقوں سے بات چیت" پر مشتمل نہیں پائی جاتی۔

معلوم ہونا چاہیے کہ غزلوں میں دنیا کی بے ثباتی کا رونا رویا جاتا ہے، زاہدوں کی مذمت کی جاتی ہے، کوثر و تسنیم کو شراب کے ایک پیمانے پر قربان کیا جاتا ہے، اپنے گناہوں پر استغفار ہوتا ہے، اللہ کی رحمت پر ناز کیا جاتا ہے، حمد و نعت و منقبت کے شعر کہے جاتے ہیں، ساقی کی قصیدہ خوانی ہوتی ہے، ایمان سے گریز اور کفر کا میلان پایا جاتا ہے، امرا و حکام پر چوٹیں کی جاتی ہیں اور دشمنوں کو جی بھر کر برا کہا جاتا ہے اور اس تمام انبار میں چند شعر معشوقوں سے مخاطب ہو کر بھی کہہ دیے جاتے ہیں، جس کے یہ معنیٰ ہیں کہ غزل کسی جذبے، کسی تاثر، کسی مشاہدے یا کسی فکر سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں رکھتی، بلکہ مصرع طرح اور قافیہ و ردیف کو ٹھونک بٹھا کر اس لفظی کھلونے کو تیار کیا جاتا ہے۔

یہ نہ آپ بیتی ہوتی ہے نہ جگ بیتی۔ یہ تو سراسر قافیہ بیتی ہوتی ہے۔ قافیہ غزل گو کی انگلی پکڑ کر جدھر چاہتا ہے لے جاتا ہے۔

فرض کیجیے ایک طرح دی گئی ہے کہ "ہم کو ہجومِ شوق نے بیمار کر دیا" اب غزل گو یہ کرے گا کہ اس کے قافیے "ستار، جبار، قہار، سرشار ایک پرچے پر درج کرلے گا یا یوں کہہ لیجیے کہ قوافی کی ان چڑیوں کو مختلف شاخوں پر بیٹھا دے گا اور پھر ایک ایک چڑیا کمپا مار کر شعر کی پھٹکی میں بند کرے گا اور "ستار" والی چڑیا کو مقطع کی پھٹکی میں ڈال کر پوری غزل تیار کریگا۔ اور جب یہ کاروبار جذبات و احساسات کا سرے سے ہے ہی نہیں اور یہ سارا کھیل قافیوں کی چڑیمار کا ہی ہے تو پھر بچے، جوان اور بوڑھے کا کوئی سوال ہی نہیں۔ ہر شخص اپنی مشق کی حد تک غزل کہہ سکتا ہے۔

غزل دراصل ایک قمار خانہ ہے، جس میں قافیے اور ردیف کے پانسے پھینکے جاتے ہیں۔ پوبارہ اور تین کانے کے اس ہنگامے میں کبھی کبھی اچھے شعر نکل آتے ہیں۔ کبھی قافیے اور ردیف کے ٹکراؤ سے بدبو پیدا ہوتی ہے اور کبھی خوش بو، اور اس تمام کھیل میں اس قوت کو ذرہ برابر بھی دخل نہیں ہوتا، جس کو شعری صلاحیت کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس مسئلے کو ایک دوسرے رخ سے بھی دیکھیے۔ آپ کو معلوم ہے کہ فیاض قدرت کی تمام نعمتیں اور صلاحیتیں اس پورے کرۂ ارض میں پھیلتی ہوئی ہیں ہر ملک کو پھولوں، پھلوں، عالموں، شاعروں اور موسیقاروں وغیرہ سے نوازا گیا ہے، لیکن غزل وہ تنہا عطیۂ قدرت ہے، جو ہند، ایران اور پاکستان کے لیے مختص کر دیا گیا ہے اور دنیا کی کسی قوم کو اس کی ہوا تک لگنے نہیں دی گئی ہے، جس کے یہ معنیٰ ہوں گے کہ غزل گو ممالک قدرت کے چہیتے بیٹے ہیں اور

دَوَاوِین میں سے اشعار پیش کر کے یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ غزل میں حقیقت نہیں، صرف روایت کام کرتی ہے اور اس امر پر بھی روشنی ڈالی جا سکتی ہے کہ غزل کی مجذوبانہ آزادی اس کی خوردہ اندیشیوں، خوردہ فروشیوں اور اس کی قافیہ پرستیوں نے ہمارے شعری معیار، ہمارے اخلاقی اقدار اور قومی افکار کو کس قدر زبردست نقصان پہنچایا ہے۔ لیکن اس مختصر سے اور وہ بھی رَوا رَوی کے سرسری مقالے میں ان تمام امور کی گنجائش نہیں نکالی جا سکتی، اِس لیے اِس مقالے کو ختم کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔

شامِ ہمدرد - کراچی
۲۰ مارچ ۱۹۶۴ء



مولانا صلاح الدین احمد

[شام ہمدرد لاہور ، اپریل ۱۹٦٤ شمسی]

مولانا صلاح الدین احمد

۱۹۰۱ شمسی

آج کی شامِ ہمدرد کے مہمانِ خصوصی جناب مولانا صلاح الدین احمد صاحب ہیں جن کی پوری زندگی بے لوثی اور خلوص کی آئینہ دار ہے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آج مولانا کے ساتھ ہمیں یہ شام گزارنے کا موقع مل رہا ہے اور ایک ایسے موضوع پر ان کے خیالات و افکار سے ہم استفادہ کر رہے ہیں، جو ان کی زندگی کا مقصد ہے اور جس کے لیے جدّوجہد میں مولانا نے پوری عمر صرف کی ہے۔

مولانا صلاح الدین احمد صاحب اِس صدی کے آغاز یعنی سنہ ۱۹۰۱ اش میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ مولانا کے والد ایک صاحبِ علم، نیک اور ایثار پیشہ بزرگ تھے جن کی پوری عمر درس و تدریس میں گزری اور تعلیم کی اشاعت کے لیے انھوں نے بڑی قربانیاں دیں۔ افسوس کہ مولانا اُن کے سایۂ عاطفت سے جلد ہی محروم ہو گئے لیکن مولانا نے اپنی والدہ محترمہ کی زبانی والد بزرگوار کی سیرت کے بارے میں جو کچھ سُنا اس کا اثر مولانا کے کردار میں نمایاں نظر آتا ہے۔ والد کے انتقال کے بعد مولانا کے بڑے بھائی مولانا ضیاءُ الدین احمد صاحب نے ان کی پرورش و تربیت کی۔ مولانا نے اپنی تعلیمی زندگی کی ابتدا ہی میں قومی تحریک میں حصّہ لینا شروع کر دیا اور مولانا ظفر علی خاں کے ساتھ قومی خدمات میں شرکت کی۔ اس کے بعد مولانا نے اسلامیہ کالج لاہور سے ایف۔اے کا امتحان پاس کیا۔ تحریکِ ترکِ موالات کے زیرِ اثر پھر سلسلۂ تعلیم منقطع ہو گیا، مگر اس تحریک کے زیرِ اہتمام قومی یونیورسٹی قائم کی گئی۔ مولانا نے اس یونیورسٹی سے بی۔اے کی سند حاصل کر لی۔ مولانا نے دورانِ تعلیم ہی میں لکھنا شروع کر دیا تھا اور ابھی کالج ہی میں تھے کہ انھوں نے "نخلستان" کے نام سے ایک رسالہ شائع کرنا شروع کیا۔ "نخلستان" میں علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خاں کا کلام بھی شائع ہوا اور رسالہ مقبول ہوتا گیا۔ اِس رسالے کے سارے کام مولانا خود کرتے تھے، بلکہ مصارف کے لیے دوسرے رسالوں اور اخباروں میں کام کرنا پڑتا تھا۔ تعلیمی مشاغل تو تھے ہی۔

اِن حالات میں اور ایسی مشکلات میں مولانا کی آتشِ شوق سرد نہ ہوئی، بلکہ لگن بڑھتی گئی اور تجربات میں اضافہ ہوتا رہا۔

۱۹۳۵ اش میں مولانا نے "ادبی دنیا" جاری کیا، جو الحمدُللہ کہ راہ کی ہر رکاوٹ کو دور کرتا ہوا آج

بھی زندہ اور تابندہ ہے اور اردو ادب و صحافت میں ایک روایتی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ اندازہ فرما سکتے ہیں کہ چوتھائی صدی سے زیادہ کی اِس طویل مدت میں ایک معیاری ادبی رسالے کو قائم و جاری رکھنے میں کیا مشکلات نہ پیش آئی ہوں گی اور کن کن خارزاروں سے نہ گزرنا پڑا ہوگا لیکن مولانا نے تند و تیز ہواؤں میں اس ادبی چراغ کو جلائے رکھا اور اکثر و بیشتر اس کا اوّل سے آخر تک سارا کام خود ہی انجام دیا۔ سینکڑوں موضوعات پر ہزاروں صفحات لکھے، اردو ادب کو مالا مال کیا اور اردو زبان کی حفاظت کی۔

مولانا صلاح الدین احمد گنتی کی ان چند شخصیتوں میں سے ہیں جنھیں اردو سے سچا پیار ہے اور جو اُردو کی بقا و ترقی کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھتے ہیں اور اس مقصد کو ہر چیز سے بالاتر سمجھتے ہیں یہ جذبہ وقتی اور ہنگامی نہیں ہے۔ مولانا کی پوری عمر اس مقصد کی تحصیل میں صَرف ہوئی ہے اور اس کے لیے آپ نے بڑی سے بڑی قربانی سے بھی گریز نہیں کیا ہے۔ مولانا نے ہمیشہ ترقی کے مقابلہ میں قربانی کو اور آرام و آسائش کے مقابلے میں محنت و مشقّت کو پسند کیا ہے۔ مولانا اب بھی جتنے کام اور جتنی محنت کرتے ہیں وہ ہمارے ملک کے کم کوش نوجوانوں کے لیے سبق آموز ہے۔ صبح سے شام تک کام ہی کام ان کا معمول ہے اور ان کے کاموں میں لوگوں کی پُر خلوص خدمت تو شامل ہے لیکن اپنی خدمت شامل نہیں ہے، حالاں کہ ان جیسا باصلاحیت آدمی اگر مادّی ترقی کو اپنا مقصدِ زندگی بناتا تو یقیناً آج اعلا مناصب پر ہوتا، لیکن مولانا کو اُردو کی ترقی سے محبت ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہم اردو کو واقعی اپنی زبان سمجھیں اور زندگی کے تمام شعبوں میں اُردو ہی کو اِستعمال کریں۔

مولانا نے اردو سے اپنی محبت کا ثبوت اردو فاؤنڈیشن قائم کرکے اور اس کے لیے اپنا تمام سرمایہ وقف کرکے بھی دیا ہے۔ مولانا کے پیشِ نظر ایک ایسا عظیم الشّان ادارہ ہے، جو ادیبوں کے لیے تصنیف و تالیف، مطالعہ و تحقیق، سکون و اطمینان کے تمام وسائل و مواقع فراہم کرے اور وہ اس مقصد کے لیے تمام دنیا سے بے نیاز، خاموشی کے ساتھ شب و روز مصروف ہیں۔ ان کے سامنے منزل کا تصوّر ہے۔ راستے کے کانٹوں کو وہ خاطر میں نہیں لاتے۔

جب مولانا سے اس شام کے لیے مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی درخواست کی گئی تو مولانا نے اپنی انکسار کی عادت کے مطابق تامّل فرمایا لیکن میرے اصرار پر ازراہِ کرم دعوت قبول فرمائی۔ میں اس کے لیے ممنون ہوں اور دل کی گہرائیوں سے مولانا کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

محمد سعید دہلوی

اُردو کے چند مسائل

از جناب مولانا صلاح الدین احمد ایڈیٹر ادبی دُنیا - لاہور

جب کسی قوم کے بھلے دن آتے ہیں تو وہ خود بخود اُن راستوں پر چلنے لگتی ہے، جنھیں اللہ تعالٰی نے قرآنِ حکیم کی زبان میں "سُبُلَنَا" ہمارے اپنے راستے کہہ کر یاد فرمایا ہے، بلکہ ان پر چلنے والوں کی ہدایت و قیادت کی ذمّہ داری بھی خود ہی قبول فرمائی ہے

اِسلامیانِ ہند کی تاریخ میں رُشد و ہدایتِ ربّانی کا ایک ایسا ہی لمحۂ نایاب ہمیں اس صدی کے آغاز میں ارزانی ہوا، جب اِستعمارِ فرنگ نے ہماری سلطنت چھیننے کے بعد ہماری تہذیب بھی چھیننی چاہی اور ہم نے محسن الملک و الملت کے جھنڈے تلے جمع ہو کر بلدۂ فرخ نہاد ڈھاکہ میں کہ آج پاکستان کا قلبِ ثانی ہے سر انیو میکڈانل لیفٹیننٹ گورنر یو۔پی کو یہ دنداں شکن جواب دیا کہ اُردو پر اگر کوئی آنچ آئی تو ہم اس کے تحفظ کے لیے اپنے سروں پر کفن باندھ کر کھڑے ہو جائیں گے اور اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے، جب تک وہ خطرہ ٹل نہیں جاتا، جو اردو اور اسلام کے دشمنوں کی مِلی بھگت سے اس کے سر پر منڈلا رہا ہے۔

حضرات! اللہ تعالٰی نے ہمارے ارادوں اور عزائم کو سرفراز فرمایا اور وہ خطرہ واقعی ایک عرصے کے لیے ٹل گیا، لیکن وہ بے حد قیمتی اور مبارک نتیجہ جو اس کے ورود سے برآمد ہوا، یہ تھا کہ مِلّتِ اِسلامیۂ ہندیہ جو مفلوک اور منتشر تھی اور جو سیاسی غلامی کے ساتھ ساتھ غیروں کی ذہنی غلامی بھی قبول کرتی چلی جا رہی تھی، یک بہ یک چونک اٹھی اور اسے یہ احساسِ نایاب ارزانی ہوا کہ اِسلام کے علاوہ مسلمانانِ ہند کا باہمی اِتّحاد جس قدرِ مشترک پر قائم ہے، وہ ہماری قومی زبان

اردو ہے، جو نہ صرف ہمارے ارتباطِ باہم کا سب سے موثر اور زندہ ذریعہ ہے، بلکہ جو ہندوستان میں ہمارے ہزار سالہ تمدن کی امین اور ہماری مذہبی، ثقافتی علمی روایات کی سرمایہ دار ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم اردو کو ایران یا عرب یا وسطِ ایشیا سے اپنے ساتھ نہیں لائے تھے، لیکن مشرقی زبانوں میں یہ فخر اسی زبان کو حاصل ہوا کہ اس نے اپنے عدیم المثال جوہرِ انتخاب کی بدولت وہ تمام خوبیاں اور دل آویزیاں اپنے اندر جذب کرلیں، جو اس خطۂ عظیم میں بسنے والی قوموں کی زبانوں میں پائی جاتی تھیں، جس کے ایک طرف بحیرۂ قلزم اور دوسرے ساحل کو خلیج بنگال کی موجیں چومتی تھیں اور جس کی وسعتیں ایک طرف البرز کی چوٹیوں کو اور دوسری جانب دکن کی وادیوں کو اپنے دامنِ کشادہ میں لیے ہوئے تھیں۔ اور حضرات! یہ ایک لسانی نکتہ ہے کہ زبانِ اردو نے اپنی پیدائش کے روز ہی سے اپنی وسیع النظرفی، اپنی گرم دلی اور اپنی مہماں نوازی کی بدولت السنۂ عالم کی محفل میں ایک مقامِ امتیاز حاصل کر لیا ہے اور راز بس کہ یہ تینوں صفات یعنی وسیع النظرفی، گرم دلی اور مہماں نوازی ہم مسلمانوں سے ایک نسبتِ خصوصی رکھتی ہیں، اس لیے اردو ہمیں کو زیادہ عزیز ہوئی اور ہماری ہی آغوش میں پروان چڑھی۔ اگرچہ اس میں کوئی کلام نہیں کہ برادرانِ وطن کے ایک جوہر شناس طبقے نے بھی اپنی قوم کی عام مخالفت کے باوجود اسے اپنے سینے سے لگایا، اس میں نظم و نثر کے چمن کھلائے اور ان بوستانوں کی آراستگی میں بھی ہمارے دوش بدوش اور قدم بہ قدم حصہ لیا۔ آج کون ہے جو سرشار اور چکبست، سرور اور محروم، پریم چند اور نگم اور سری رام اور نولکشور کے احسانات سے انکار کر سکتا ہے؟ اور کون ہے جو کرشن چندر اور فراق اور ملا اور آزاد کی اردو دوستی کو محلِ نظر ٹھیرانے کی جرأت رکھتا ہے۔ یقیناً کوئی نہیں، لیکن اپنی جگہ یہ حقیقت بھی مسلم ہے کہ ہندستان میں اردو سیاسی مصالح اور تعصبات کی نذر ہو گئی اور کوئی دن کی بات ہے کہ وہاں اس کے مزار پر کوئی چراغ جلانے والا بھی باقی نہیں رہے گا۔ اس میں کلام نہیں کہ اردو ہندستان کی چودہ مسلمہ زبانوں میں آج بھی شمار ہوتی ہے اور ملک میں بیسیوں اخبار اور رسائل آج نکل رہے ہیں اور اس بدنصیب زبان کے کلاسیکی کتب خانے آج بھی آباد ہیں اور یونی ورسٹیوں میں اس کی تدریس کا آج بھی انتظام ہے، لیکن زندگی کے ایوانوں سے اسے خارج کیا جا چکا ہے اور یہ رہروِ عدم اب شہرستانِ زندگی کے مسافر خانے میں مقیم ہے۔ عدالت ہائے دیوانی و فوج داری اور دفاترِ سرکاری و غیر سرکاری کا دروازہ اردو پر بند ہو چکا ہے۔ ریل تار اور ڈاک خانے اب اس کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں۔ بازار، منڈیاں اور کارخانے جو کبھی اس کے گہرے آشناؤں میں سے تھے، اب اسے قطعاً غیر

سمجھتے ہیں۔ معاش کے تقاضوں اور روزگار کی مجبوریوں نے خود مسلمانوں کی نئی نسلوں کو اردو سے جُدا کرکے ہندی کی طرف دھکیل دیا ہے اور وہ زبان جس کا خمیر فارسی کی فصاحت، عربی کی بلاغت اور ہندی کی سلاست سے اٹھا تھا، اب خود اپنے دیس میں اجنبی ہوکر رہ گئی ہے۔

میں ابھی ابھی اس مبارک عہد کا ذکر کر رہا تھا۔ جب اُردو ہماری قومی زندگی اور ہماری ملّی تہذیب کا نشان بن کر نمودار ہوئی اور ہم نے اسلام کے بعد اُردو کو اپنی عزیز ترین تمنّاؤں کا مرکز بنایا، لیکن جب اِقبالِ فرنگ کا آفتاب سرزمینِ ہند میں غروب ہوا اور پاکستان ایک حقیقتِ ثابتہ بن کر افقِ ہستی سے ابھرا تو بادی النظر میں ان تمنّاؤں کی تکمیل کی وہ ساعتِ سعید آگئی جس کا ڈیڑھ سو برس سے اِنتظار کیا جا رہا تھا۔ پاکستان کا ایوانِ عظیم الشّان ہم جن محکم ستونوں پر قائم کرنا چاہتے تھے، وہ تعداد میں چار تھے: اسلام، اتّحاد، آزادی اور اردو۔ اور جب ہمارے قائدِ اعظم نے ہمیں اپنی منزلِ مقصود کی طرف پکارا تھا تو ایوانِ مملکت کے اِنھی چار ستونوں کی نشان دہی فرمائی تھی۔ ۱۹۰۶ء سے ۱۹۴۶ء تک یعنی پورے چالیس برس ہم نے اس ویرانے کی خاک چھاننے میں بسر کیے تھے، جس کا ہر بگولہ ہمارے لیے گردشِ تقدیر کا ایک نیا پیغام لے کر آتا اور ہر سراب سلسبیلِ زندگانی کی ایک نئی جھلک دکھاتا تھا۔ بالآخر رحمتِ حق جوش میں آئی اور اس نے ہمیں ایک بے مثال قائد عطا فرمایا۔ یہی قائد ہمیں ظلمتِ شب میں لے کر نکلا اور جب وقتِ سحر قریب آیا اور منزل کامرانی کے کنگرے ہمیں نظر آنے لگے تو اُس نے اپنی انگلی ان کی طرف اٹھائی اور ہم سے فرمایا کہ وہ دیکھو ہم اپنی منزل پر آن پہنچے ہیں۔ ہمیں اس کی برکتیں اور آسائشیں مبارک ہوں، لیکن یاد رکھو کہ جہانگیری کے دور کے بعد جہاں بانی کا مشکل تر دور آتا ہے۔ میں تمھارے درمیان زیادہ عرصے تک نہیں رہوں گا، لیکن جن چار ستونوں پر اس مملکتِ خداداد کا ایوانِ رفیع الشّان قائم ہوا ہے، ان کے قیام ہی سے تمھاری زندگی کو قیام و دوام حاصل رہے گا۔ تم اس ملک میں اسلام کی اقدارِ عالیہ نافذ کرکے حیاتِ جاوداں پاؤ گے۔ تم عوام کی آزادیٔ فکر و اظہار ہی سے ملک کی عزّت و آبرو برقرار رکھ سکو گے۔ تمھارے لیے اِتّحاد ہی زندگی کی ضمانت ثابت ہوگا اور خداوند تعالےٰ نے تمھیں جو بے مثال زبان عطا کی ہے اور جو تمھاری روایات، تمھاری تہذیب اور تمھارے علمی خزانوں کی امین ہے، وہی تمھاری قومی زبان ہوگی اور تمھارا شجرِ اتحاد اسی کی قیادت افروز زمین میں برگ و بار لائے گا اور تمھاری علمی ترقی اور ادبی فروغ اور تہذیبی سطوت کی شاہراہیں اسی کے بلند و بالا دروازے سے عرصۂ عالم کی طرف رواں ہوں گی اور تمھیں دنیا کی زندہ، کام یاب اور باعزّت قوموں کی صف میں شامل کریں گی۔

قائدِ اعظم نے یہ اقوالِ زریں بارہا اپنی زبانِ مبارک سے دُہرائے اور یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ وہ بلدۂ حسن و خوبی کہ ڈھاکہ جس کا نام ہے اور جہاں محسن الملک بہادر نے اردو کا اتحاد پَرور پودا اپنے دستِ مبارک سے اِس صدی کے آغاز میں نصب کیا تھا وہیں حضرت قائدِ اعظم نے پبلک طور پر اردو کو پاکستان کی واحد قومی زبان قرار دیا اور قلوب کا حال تو اللہ بہتر جانتا ہے، لیکن سر اُن کے ارشاد کے سامنے جھک گئے اور کاروانِ اردو کی ایک بہت بڑی منزل بہ ظاہر طے ہو گئی۔

حضرات! آج قائدِ اعظم کو فردوس آشیاں ہوئے کم و بیش پندرہ برس گزر چکے ہیں۔ میں اس محفل میں اِس امر کا جائزہ نہیں لوں گا کہ ہمارے معاشرۂ جدید میں اِسلام کی بنیادی اقدار کا کیا حشر ہوا۔ میں یہ بات بھی نہیں پوچھوں گا کہ وہ قدرِ عالی جسے آزادیٔ فکر و اظہار کہتے ہیں، کِس گوشے میں جا چھپی ہے؟ میں اس دھندلی فضا میں اتحادِ ملی کے سایۂ گریزاں کا تعاقب بھی نہیں کروں گا، لیکن میرے دوستو! مجھے بتاؤ کہ وہ نازنین ہزار شیوہ کہ زبانِ اردو کہلاتی تھی، وہ سیم تن جس کا جادو سر پر چڑھ کر بولتا تھا، آج کس طلسمی بُرج میں قید ہے اور کیوں قید ہے؟ کیا اس لیے کہ اس کا باپ، اس کا محافظ مر گیا اور اس کی وصیت پارہ پارہ کر دی گئی۔ کیا اِس لیے کہ فرنگی نے چلتے چلتے جادُو کی جو پڑیا ہماری فضا میں بکھیری تھی، اس نے ہمارے حواس، ہمارے عزائم اور ہماری حمیت پر قابو پا کر ہمارے دست و پا شل کر دیے اور ہمارے بچے ہمارے دیکھتے دیکھتے اس کی زبان اور اس کی تہذیب کے جال میں پھنس گئے اور ایسے پھنسے کہ وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ آج وہ اسی زبان کے گیت گاتے ہیں، اسی کا سرمہ اپنی آنکھوں میں لگاتے ہیں اور اسی کی روشنی میں زندگی کا راستہ تلاش کرتے ہیں اور اس ملک کی سب سے بڑی اسلامی انجمن اپنے نیک کاموں میں یہ کارنامہ بھی گِنواتی ہے کہ آج اس کی سرپرستی میں بچوں کے تین "اِنگلش میڈیم" اسکول بڑی کامیابی سے چل رہے ہیں۔ انجمن کو تو اپنے اس فخر پر کیا شرم آئے گی، حیرت یہ ہے کہ ہمارے کسی ادارے، کسی اخبار اور کسی ماہرِ تعلیم نے اس جسارت کو قابلِ توجہ نہیں سمجھا۔

برادرانِ گرامی! یہ سچ ہے کہ مایوسی اور بے یقینی کی اِس شبِ تار میں کہیں کہیں کوئی چراغ جل رہا ہے۔ کِسی یونیورسٹی نے بعض درجوں کے اِمتحانوں میں سوالات کے جواب اردو میں لکھنے کی اجازت دے دی ہے۔ اگرچہ اس درجے میں ذریعۂ تعلیم ابھی تک انگریزی ہی ہے۔ کسی ثانوی تعلیم کے بورڈ نے اردو کو ایک مستقل مضمون کا اعزاز بخش دیا ہے۔ کسی جامعہ نے کسی خاص کالج کے طلبا کے لیے یہ رعایت کر دی ہے کہ وہ اپنے مضامین اردو ہی میں تیار کر لیں اور ان کا

اِمتحان بھی اردو ہی میں دے لیں۔ اگرچہ اردو کے ان گریجویٹوں کا مسئلۂ روزگار حل نہیں ہوسکا۔ اس میں بھی کوئی کلام نہیں کہ حکومتِ عالیہ نے اپنے تعلیمی بجٹ کے سمندر کے چند قطرے بعض سرکاری اور نیم سرکاری انجمنوں کو دیے ہیں، لیکن تاکید یہ ہے کہ خبردار کہیں اپنے کام میں رفتار کے نام سے کوئی چیز پیدا نہ کرلینا، مبادا کہ ہماری چہیتی انگریزی پریشان ہوجائے غرض کہ اردو کے لیے جو کچھ بھی ہورہا ہے، وہ کیفیت اور مقدار دونوں کے اعتبار سے ایک عظیم قومی مقصد اور ایک سنجیدہ قومی منصوبے کے ہرگز شایانِ شان نہیں اور کام کی موجودہ رفتار ہمیں ایک صدی میں بھی کسی اہم سنگِ میل سے گزرنے کی امید نہیں دلاتی۔ پھر یہ بھی ہے کہ بعض کام کرنے والوں کی نگاہیں تو دور دور تک جاتی ہیں، لیکن انھیں قدم قدم پر مخالفت اور مشکلات کا سامنا ہے اور بے بسی اور نارسائی کی ایک عجیب کیفیت ان کے عزائم کو کمزور اور ان کے ولولوں کو سرد کیے دیتی ہے۔ ایسی صورتِ حال میں اگر کہیں کہیں کامیابی کی کوئی جھلک نظر آتی ہے تو وہ بسا غنیمت معلوم ہوتی ہے۔

جنابِ صدر! آپ نے ہزارہا مریضوں کے بخار اتارے ہوں گے۔ کیا آپ کے پاس کوئی ایسا نسخہ نہیں ہے، جس کی مدد سے قوم کو زندگی کا بخار چڑھایا جاسکے؟ ایک ایسا بخار جس کی حرارت حیات افروز ہو اور جو مریض کی ہڈیوں تک سرایت کر جائے۔ میرا ایمان ہے کہ جب تک قوم زندگی اور حمیت کے بخار میں مبتلا نہیں ہوتی، اس سے کوئی بڑا کام سرانجام نہیں پائے گا۔ ہمارا خون سرد ہوچکا ہے، ہماری غیرت سوچکی ہے اور بڑوں کو ہوسِ زر اور حُبِ جاہ اور چھوٹوں کو طلبِ عیش و نشاط نے غافل و مفلوج کررکھا ہے۔ ایسے میں یہ کیوں کر ممکن ہے کہ وہ مقاصد ہمارے پیشِ نظر رہیں جن کے حصول کے لیے ہم نے یہ مملکت حاصل کی تھی اور اپنے خدا اور اپنے قائد سے وعدہ کیا تھا کہ ہم اسے ایک ایسا ملک بنائیں گے، جو نہ صرف ملتِ اسلامیہ بلکہ کُل اقوامِ مشرق کے لیے ایک مثالی ملک ہوگا اور اس میں کیا کلام ہے کہ اگر ہم اصولوں پر تھوڑا سا عمل بھی کرتے، جو پہلے دن ہمارے سامنے رکھے گئے تھے، تو آج ہم کم از کم مضحکۂ روزگار نہ بنتے۔ ذرا غور فرمایئے کہ ہماری قومی زبان، بولنے والوں کی تعداد کے اعتبار سے دُنیا بھر میں تیسرے نمبر پر ہے اور اپنی آسانی کے لحاظ سے مشرق میں پہلا درجہ رکھتی ہے اور بیدار اہلِ مغرب جب یہ سنتے ہیں تو وہ اُس سے آشنا ہونے کے لیے کشاں کشاں ہمارے ملک میں آتے ہیں، لیکن چند ہی روز میں وہ پریشان ہوکر یہ کہتے ہوئے لوٹ جاتے ہیں کہ یہاں تو اردو نہیں بلکہ غلط قسم کی انگریزی بولی جاتی ہے۔ پھر ہم ان لوگوں کے درمیان رہ کر اپنی انگریزی بھی کیوں بگاڑیں چینی وزیرِ اعظم یہاں آئے تو یار لوگوں نے چاہا کہ وہ اُن سے انگریزی بُلوائیں، لیکن انھوں نے یہ کہہ کر ہماری

قومی غیرت کے مُنھ پر ایک تھپّڑ رسید کیا کہ چین گونگا نہیں ہے ۔ بلاشبہ چین گونگا نہیں، لیکن ہم ضرور گونگے بھی ہیں اور اندھے بھی، کیونکہ ہم انگریزی کے دُھندلکے ہی میں ٹکریں مارتے پھر رہے ہیں اور زندگی کے آفتاب کی کوئی کرن ہماری بے بصر آنکھوں تک نہیں پہنچتی ——— چین کا ذکر آیا ہے تو ایک لطیفہ بھی سنتے چلیے ——— میرے ایک عزیز دوست باری مرحوم ملازمت کے سلسلے میں دو بار برما گئے۔ وہ سُناتے ہیں کہ میں ایک دفعہ رنگون کے ایک قہوہ خانے میں بیٹھا تھا کہ ایک چینی داخل ہوا اور اس نے آتے ہی خادم لڑکے سے فرمائش کی کہ لڑکا چا، لاؤ، میٹھا کمتی ۔ میں یہ سنتے ہی چونک پڑا اور سوچنے لگا کہ یہ قہوہ خانہ چینی ہے اور اس کا مالک اور اس کا ملازم بھی دونوں چینی ہیں، پھر چینی گاہک ملازم لڑکے سے چینی میں بات نہیں کرتا، اردو میں کیوں کرتا ہے؟ کچھ دیر مَیں یوں ہی سوچتا رہا، آخر مجھ سے نہ رہا گیا اور میں اپنی جگہ سے اٹھ کر مالک کے پاس چلا گیا اور اس سے اپنی الجھن کا ذکر کیا۔ وہ مجھے کچھ کچھ جانتا تھا مسکرایا عینک کے پیچھے سے اپنے گول گول دیدے گھما کر بولا" صاحب! وہ اوپر والے چین کا ہے اور ہم نیچے والے چین کے ہیں۔ وہ ہماری بولی نہیں جانتا، ہم اس کی بولی نہیں سمجھتے ۔ تو پھر ہم ہندستانی نہ بولیں تو کیا کریں" ——— میرے صاحبو! رنگون میں جو معاملہ دونوں چینیوں کے درمیان گزرا، وہ دُنیا کے بیشتر بڑے شہروں اور بندرگاہوں میں ہر روز پیش آتا ہے۔ طنجہ سے چلیے اور سنگاپور سے ہوتے ہوئے ہانگ کانگ تک چلے جائیے ۔ آپ کو ہر بندرگاہ میں اُردو بولنے والے ملیں گے۔ افریقہ کے ساحلی علاقوں، بحرالکاہل کے شاداب جزیروں، مارشس کے زرخیز کھیتوں اور زنجبار کے معطر باغوں میں آپ کو اردو کی خوش بو دوشِ صبا پر ہر جگہ سوار ملے گی۔ اِدھر دُنیا کی چھت پر یعنی تبت اور لداخ کے دشوار گزار خطوں میں بھی اردو کا پھریرا نسیم صبح گاہی میں لہراتا اور امن وآشتی کا پیغام دوشِ ہوا پر وادیٔ گنگ وجمن اور رودبارِ سندھ و سُتلج تک پہنچاتا ہے۔ چند روز ہوئے میں ہندستان کا ایک رسالہ پڑھ رہا تھا۔ اس میں اس کا ایک سیاح مضمون نگار لکھتا ہے" یوں تو لداخیوں کی زبان سپیرا ہے، لیکن اردو وہاں کثرت سے بولی جاتی ہے اور زیادہ تر لوگ اردو لکھنا پڑھنا بھی جانتے ہیں۔ وہاں کے اسکولوں میں بھی سپیرا کے ساتھ اردو پڑھائی جاتی ہے۔ دکانوں کے بورڈ، دفتروں کے نام، اشتہار اور دیواروں پر لگے ہوئے پوسٹر عام طور پر اردو ہی میں نظر آتے ہیں۔ ڈاک اور آمد ورفت کا بہتر انتظام نہ ہونے کی وجہ سے رسائل و اخبارات وہاں باقاعدگی سے نہیں پہنچ پاتے، لیکن پھر بھی اگر کسی گھر یا دکان پر کوئی اخبار یا رسالہ نظر آتا ہے تو وہ اردو ہی کا ہوتا ہے۔ یہاں بودھ اور مسلمانوں میں شادیاں بھی عام ہوتی ہیں اور شادی کرنے کے لیے مذہب تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی ۔ مذہب کے

نام پر کبھی کوئی اِختلاف کی مثال ان کی تاریخ میں نہیں ملتی اور اُردو وہاں کی مقبول ترین زبان ہے۔"

لداخ سے لاہور ہزاروں میل دور ہے لیکن کل ہی ہمارے ایک دانش مند وزیر نے پنجابی نوجوانوں کو نصیحت فرمائی ہے کہ اٹھتے بیٹھتے پنجابی زبان بولا کرو اور اگر پنجابیوں، خصوصاً تعلیم یافتہ پنجابیوں نے پنجابی زبان سے قطع تعلق کیا تو وہ مرجائیں گے۔ پھر فرمایا اور بڑی حسرت سے فرمایا کہ جب دو پٹھان آپس میں ملتے ہیں تو پشتو میں بات کرتے ہیں، دو سندھی یک جا ہوتے ہیں تو سندھی کو گفتگو کا وسیلہ بناتے ہیں لیکن جب دو پنجابی ملتے ہیں تو وہ انگریزی اور پنجابی کے ایک ایسے ملغوبے کو بطور زبان استعمال کرتے ہیں، جس پر افسوس کا اِظہار کیے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔

پھر کہا کہ پنجابی ہماری مادری زبان ہے۔ مادری زبان سے محبت نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں اپنی ماں سے پیار نہیں اور اگر پنجاب کے عوام نے اپنی مادری زبان کو اپنی روزمرّہ کی زندگی سے خارج کر دیا تو اس سے نہ صرف علاقے کی ثقافتی ترقی رک جائے گی، بلکہ پنجابی عوام کی انفرادیت بھی ختم ہو جائے گی"۔ —— وزیر صاحب کے اِس ارشاد سے اِس حد تک ہمیں کلی اتفاق ہے کہ کسی زبان سے کسی دوسری زبان کو ملا کر ان کا ملغوبہ نہیں بنانا چاہیے، مگر جناب صدرِ مملکت اور ان کے تعلیمی مشیر اور ماہر تو یہ چاہتے ہیں کہ اردو، پنجابی، سندھی اور پشتو کے ملغوبے میں بنگالی کا اضافہ بھی کر دیا جائے —— اس تضاد آرا کا وزیر صاحب کے پاس کیا علاج اور کیا جواب ہے؟

ہمیں اِس امر میں بھی کوئی قباحت نظر نہیں آتی کہ پنجابی اپنی مادری زبان سے محبت کریں، لیکن ہم یہ ہرگز ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ اگر وہ دن رات پنجابی نہیں بولیں گے تو وہ مرجائیں گے اور ان کی انفرادیت ختم ہو جائے گی۔ پنجابی اگر اہلِ پنجاب کی مادری زبان ہے تو اردو خود مادرِ ملّت کی زبان ہے اور کوئی انسان ملّت میں گم ہو کر مر نہیں جایا کرتا۔ ہائے اقبال نے کیا خوب کہا تھا ؎

بتانِ رنگ و خوں کو چھوڑ کر ملّت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی، نہ افغانی

یاد رکھنا چاہیے کہ ہم نے اپنے پنجابی پن کا بت اُسی وقت توڑ دیا تھا جب ہم نے قائدِ اعظم کے جھنڈے تلے جمع ہو کر پاکستانی بن جانے کی قسم کھائی تھی اور آج ہم اوّل بھی پاکستانی ہیں اور آخر بھی پاکستانی اور اسلام ہمارا دین ہے اور اردو ہماری زبان ہے اور اُسی کی ثقافت اور اُسی کی تہذیب ہماری ثقافت اور ہماری تہذیب ہے اور ہماری تمام ضروریات کے لیے خواہ وہ اجتماعی ہوں یا انفرادی تعلیمی ہوں یا تفریحی، ادبی ہوں یا فنّی یہی زبان اور یہی تہذیب کافی بلکہ کافی سے بہت زیادہ ہے۔ آپ کو اِختیار ہے کہ گلہریاں نچائیں اور میلوں ٹھیلوں پر

ناقابلِ شنید بولیاں بولیں، ہم آپ کو منع نہیں کرتے ـــــ لیکن خدا کے لیے یہ نہ کہیے کہ اگر پنجابیوں نے اردو کو اپنا کر اسے اپنے گھروں میں رائج کیا یا باہمی ملاقاتوں میں ذریعۂ اظہار بنایا تو وہ مر جائیں گے یا اپنی انفرادیت کھو بیٹھیں گے۔ یاد رکھیے کہ اردو پنجاب ہی کی بیٹی ہے، وہ یہیں پروان چڑھی، دیکھیے سرآمد اولیائے پنجاب جناب بابا نانک کا ایک شبد ؎

نانک ننھے ہو رہو، جیسے ننھی دُوب
پیڑ بڑے گر جائیں گے، دُوب سو خوب کی خوب

بابا نانک رحمۃ اللہ علیہ نے فاتح ہندوستان ظہیر الدین بابر کا زمانہ پایا ہے۔ پنجاب میں اس وقت یہی پنجابی رائج تھی ـــــ پھر جب ہماری یہ زبان فاتحینِ اسلام کے ساتھ مشرق میں آسام تک اور جنوب میں میسور تک پہنچی اور اس کا ڈنکا ہندوستان کے گوشے گوشے میں بجنے لگا اور بازاروں کی رونق اور درباروں کی زینت نے اسی کے دم قدم سے فروغ پایا تو فطری طور پر یہ اور بھی نکھری اور اپنے غیر معمولی جوہرِ طبعی کی بدولت اس نے اظہار و بیان کی وہ منزلیں برسوں میں طے کیں، جو دوسری زبانیں صدیوں میں بھی طے نہیں کر پائیں ـــــ پھر جب زمانے کی گردش سے پنجاب کی یہ بیٹی رانڈ ہو کر واپس اپنے میکے میں آئی تو اس کی آنکھوں میں اگرچہ آنسو تھے لیکن دل میں اس امید کا چمن لہلہا رہا تھا کہ میرے میکے والے، اللہ انھیں سلامت رکھے، مجھے ہاتھوں ہاتھ لیں گے اور ہر طرح سے میری دل جوئی کریں گے، لیکن ہم نے جو کچھ کیا وہ دنیا کے سامنے ہے۔ رستم پر ستم یہ ہے کہ آج ہم اسے پہچانتے بھی نہیں اور اسے غیر سمجھ کر اور اس کے اوّلین رُوپ کو پنجابی کہہ کر اپنے سینے سے لگائے پھرتے ہیں۔ دانش مند وزیر نے مادری زبان کو ماں کا درجہ تو دے دیا لیکن یہ نہیں سوچا کہ بیٹی، خصوصاً بیوہ بیٹی کا بھی کوئی مقام ہے۔ پھر اس بیٹی کا جسے مادرِ ملت نے بھی اپنی بیٹی بنا لیا ہو۔

اب آخر میں مَیں اپنے ہم خیال اصحاب سے ایک خاص بات کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ بابائے اردو تو اپنے دل میں اُردو یونی ورسٹی کے قیام کی حسرت لیے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ بظاہر قوم بھی ان کا دَم بھرتی تھی اور حکومت بھی، لیکن دونوں میں سے کسی کو بھی یہ توفیق نصیب نہ ہوئی کہ ان کی سب سے بڑی اور آخری آرزو پوری کرنے کے لیے کوئی قدم اٹھائے۔ میرا اندازہ ہے کہ اردو یونی ورسٹی کا خواب ایک عرصۂ دراز تک خواب ہی رہے گا اور اسے حقیقت کا جامہ پہنانے کا شرف مستقبل قریب میں نہ حکومت کو حاصل ہو گا، نہ قوم کو، اور یہ مسئلہ وہیں کا وہیں رہے گا، جہاں آج سے دس سال پہلے تھا ـــــ ایک بات البتہ نسبتہً بہت آسان اور قابلِ عمل ہے اور وہ ہے ایک وزارتِ زبانِ قومی کا قیام۔ ۱۹۶۰ء میں ہم سے

کہا گیا تھا کہ آج سے بارہ برس کے بعد یعنی ۷۲ء میں حکومت ایک کمیشن قائم کرے گی، جو اس امر کا جائزہ لے گی کہ قومی زندگی کے مختلف شعبوں میں اردو کس حد تک انگریزی کی جانشین بن سکتی ہے۔ یہ ظاہر بارہ برس کا یہ عرصہ قومی زبان کے تکلیف دہ مسئلے سے ایک آرام دہ اور سکون بخش فرار حاصل کرنے کے لیے مقرر کیا گیا تھا لیکن بعض دفعہ عمل کی گرانی حُدی کو تیز تر کر دیتی ہے۔ پس اے یارانِ قوم اور معمارانِ ملت اپنی حُدی کو تیز تر کیجیے اور میرے ساتھ مل کر حکومت سے یہ مطالبہ فرمائیے کہ قومی زبان کی ایک مخصوص وزارت فوراً قائم کر دی جائے اور کم از کم دس کروڑ روپے کی رقم اس کے تصرف میں دے دی جائے، تاکہ وہ ہر طریقے اور ہر انداز سے اور پوری تن دہی اور سرعت کے ساتھ وہ تمام اقدامات کرے، جو ۱۹۷۲ء تک اردو کو مسلمہ طور پر ہماری قومی زندگی میں انگریزی کی جانشین بنا دیں۔ نیز مجوزہ وزارت کو اس امر کا ذمے دار ٹھیرایا جائے کہ وہ انگریزی سے اردو کی طرف انتقالِ اقتدار کے تمام لوازم ۱۹۷۲ء کی صبح طلوع ہونے سے پہلے پہلے مکمل کر دے اور اس غرض سے اپنے کام کی شش ماہہ روئداد قوم کی خدمت میں برابر اور مسلسل پیش کرتی رہے۔ موجودہ حکومت اگر سچے دل سے اور حُسنِ نیت کے ساتھ یہ مطالبہ مان لے اور اس پر پورے جوش کے ساتھ عمل درآمد بھی کرتی رہے تو ہم سمجھیں گے کہ صبح کا بھولا بالآخر شام کو گھر آ گیا۔ ؏ اور یہ نہیں تو بابا پھر سب کہانیاں ہیں

والسلام

شامِ ہمدرد۔ لاہور
اپریل ۱۹۶۴ش

ڈاکٹر بُرہان احمد فاروقی

۲۲ نومبر ۱۹۰۵ شمسی

فلسفہ اور اسلامیات کے معلّم اور محقّق کی حیثیت سے جناب ڈاکٹر بُرہان احمد فاروقی صاحب ہمارے ملک کی جانی پہچانی شخصیت ہیں اور اپنے عِلمی کاموں کی بنا پر قابلِ احترام۔ ڈاکٹر صاحب ۲۲ نومبر ۱۹۰۵ شمسی کو امروہہ میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم اپنے وطن ہی میں حاصل کی اور ۱۹۲۵ شمسی میں الہ آباد بورڈ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ علی گڑھ سے ۳۲ش میں ام۔ اے اور ۳۸ش میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ فلسفہ اور اسلامیات آپ کے خاص مضامین ہیں۔ چناں چہ آپ نے مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ اور اسلامیہ کالج جالندھر میں اِنھی مضامین کی تعلیم دی۔ ۴۴۔ ۱۹۴۵ش میں علی گڑھ میں قائدِ اعظم کی قائم کردہ تعلیمی کمیٹی کے تحت اسلامیات کی سب کمیٹی میں کام کیا، اور 'مسلمانوں کی تعلیم' پر ایک اہم مقالہ لکھا۔

علی گڑھ سے ڈاکٹر صاحب اسلامیہ کالج لاہور کے شعبۂ تحقیق میں آگئے۔

قیامِ پاکستان کے بعد ڈاکٹر صاحب پنجاب یونی ورسٹی کے شعبۂ اسلامیات سے متعلق ہو گئے اور آپنے مسلم فلسفے کے موضوع پر سات نہایت محققانہ لکچر دیے، پھر ام۔ اے۔ او۔ کالج میں ۱۹۵۴ش سے ۱۹۶۵ش تک فلسفے کی تعلیم دی۔

ڈاکٹر فاروقی صاحب نے ڈاکٹریٹ کے لیے انگریزی میں جو مقالہ لکھا تھا اس کا عنوان تھا "حضرت مجدّدؒ کا نظریۂ توحید"۔ نیز آپ نے پنجاب یونی ورسٹی کے ام۔ اے کے طلبہ کے لیے ریسرچ پیپرس بھی لکھے۔

آج کل ڈاکٹر صاحب محکمۂ اوقاف کے لیے دو اہم کتابیں ایڈٹ کر رہے ہیں، پہلی کتاب "باقیاتِ خواجہ باقی باللہ" ہے، جس میں حضرت خواجہ باقی باللہ کی تمام تصانیف مع مقدمہ وحالات شامل ہوں گی۔ دوسری کتاب خواجہ محمّد ہاشم صاحب کی تصنیف "زبدۃ المقامات" ہے۔ دونوں کتابیں فارسی میں ہوں گی۔

محمّد سعید



ڈاکٹر برہان احمد فاروقی

[شام ہمدرد ، ٤ جون ١٩٦٤ شمسی]

اِسلام کی نتیجہ خیزی
اور
مسلمان

ڈاکٹر بُرہان احمد فاروقی - ایم اے - پی ایچ - ڈی (علیگ)
ایم اے او کالج - لاہور

آج کی نشست میں جس موضوع پر مجھے اِظہارِ خیال کرنا ہے وہ ہے "اسلام کی نتیجہ خیزی اور مسلمان"۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کو اپنی تعلیمات کے حتمی اور یقینی طور پر نتیجہ خیز ہونے کا دعوا ہے، یعنی اس بات کا دعوا کہ اسلام جو نتائج پیدا کرنا چاہتا ہے وہ پیدا ہو کر ہی رہیں گے۔ مگر مسلمانوں کا یہ اِعتماد کہ اِسلامی تعلیمات اسی درجے میں نتیجہ خیز ہیں اور وہی نتائج پیدا کرتی ہیں مضمحل ہو کر رہ گیا ہے۔ مسلمانوں کا یہ اِعتماد کن موثرات کی بنا پر مضمحل ہوا ہے اور اسلام کی نتیجہ خیزی میں یہ اِعتماد کیسے بحال ہو سکتا ہے، اِس مسئلے پر غور کرنے کے لیے ہمیں اس عنوان کا تجزیہ یوں کرنا چاہیے:

اِسلام کیا ہے؟
نتیجہ خیزی کا کیا مطلب ہے؟
مسلمانوں کی حالت کیا ہے؟
کن موثرات کی بنا پر نتیجہ خیزی کا اِعتماد مضمحل ہوا ہے؟
اِن موثرات کا تدارک کیسے ہو سکتا ہے؟

اِسلام کی نسبت یہ سوال اٹھانے سے کہ اسلام کیا ہے؟ میرا مطلب یہ نہیں کہ مسلمان اِسلام کے معنی سمجھتے نہیں اور مجھے اپنی نسبت یہ غلط فہمی بھی نہیں کہ میں سمجھ سکتا ہوں بلکہ میں صرف یہ

چاہتا ہوں کہ میں نے جن احوال میں اسلام پر از سرِ نو غور کرنے کی ضرورت محسوس کی ہے، اس کا اندازہ آپ بھی فرمائیں۔

مجھے ایک مرتبہ پنجاب یونیورسٹی کے اسلامیات کے ایم۔ اے کے طلبا سے یہ سوال کرنے کی ضرورت پیش آئی کہ وہ صرف ایک جملے میں جواب دیں کہ اسلام کیا ہے؟ پچیس تیس کے قریب سب طلبا نے اپنا جواب لکھ دیا اور کسی کا جواب ایک دوسرے سے نہ ملتا تھا۔ اگر ہمارے سوچنے کے انداز میں یہ پراگندگی ہو تو کیا ہم اس ذمّے داری سے عہدہ برا ہو سکتے ہیں، جو اسلام کی طرف سے ہم پر عائد ہوتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انتہائی درجے کا یقین اور انتہائی درجے کی بے یقینی دونوں انسان کو سوچنے اور غور و فکر کرنے سے بے نیاز کر دیتے ہیں۔ یقین کی وجہ سے سوچنے سے بے نیازی اس لیے پیدا ہوتی ہے کہ نورِ یقین کی بدولت ہر حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے اور بے یقینی کی بنا پر سوچنے سے بے نیازی اس لیے پیدا ہوتی ہے کہ خاطر خواہ نتائج کے پیدا ہونے کی ہر امید مٹ چکی ہوتی ہے اور سوچنا بے فائدہ معلوم ہوتا ہے۔ دُنیا کی کسی ہیئت عمرانی میں کوئی فرد جس میں زندگی کی کوئی امنگ باقی رہ گئی ہو غور و فکر سے اس درجہ بے پروا نہیں ہو سکتا جتنے ہم ہیں۔ یقین کی بنا پر سوچنے سے بے نیازی اور مصروفِ عمل رہنے کی شان صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین ہی میں پائی جاتی ہے۔

آپ صاحبان مجھے مُعاف فرمائیں گے اگر میں یہ کہوں کہ ہم نے یہ سوچنا چھوڑ دیا ہے کہ جو اختلال ہماری عمرانی ثقافتی زندگی میں پایا جاتا ہے اس کا مداوا اور ایک معاند تہذیب کے اختلال انگیز اثرات کا تدارک ہم کیسے کر سکتے ہیں اور یہ کہ دُنیا کی کوئی ہیئت اجتماعی اپنی بقا اور ترقی کے شرائط سے اس درجہ بے پروا کیسے ہو سکتی ہے؟

ہماری اس بے پروائی کا سبب یہ ہے کہ ہم اسلام سے مایوس ہو گئے ہیں اور ہمارا یہ اعتماد متزلزل ہو گیا ہے کہ اسلام کے اتباع سے زندگی میں خاطر خواہ نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔

علم و حکمت کے موجودہ انداز میں ہمیں جاننا چاہیے کہ اگر کسی شخص میں طب سیکھنے کی طلب پیدا ہو تو اُسے طبیب ہی کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور وہ طب سیکھنے کے لیے کسی انجنیر کے پاس نہیں جا سکتا۔ اور اگر کسی شخص میں شعر و شاعری کے سمجھنے کا تقاضا اُبھرے تو اس کا شاعر ہی کی طرف رجوع کرنا سب سے زیادہ علمی بات ہو گی۔ بعینہٖ اسی طرح اگر کوئی شخص مذہب کو سمجھنا چاہے تو اسے صاحبِ مذہب علیہ الصلوٰۃ والسلام ہی کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ اس ذاتِ گرامی کے بجائے کسی فلسفی، سائنس دان یا طبیب یا انجنیر کی طرف رجوع کرنا بالکل غیر علمی طرزِ عمل ہو گا جس

کا جواز کسی طرح پیدا نہیں ہو سکتا۔
مذہب کو سمجھنے کے لیے ہمیں سب سے پہلے اِس اِحتیاج کی طرف رجوع کرنا چاہیے جس کی بدولت مذہب کو اِختیار کرنے کا تقاضا پیدا ہوتا ہے۔
اگر انسانی فطرت پر غور کریں تو ہم پائیں گے کہ اس میں گوناں گوں تضاد پائے جاتے ہیں۔ ایک طرف اس کے جبلّی داعیات ہیں اور دوسری طرف ان کی غایات مثلاً بھوک کا تقاضا انسان میں جبلّی طور پر پایا جاتا ہے۔ اس کا مقصود "تغذیہ" ہے، مگر کھانے کی خواہش "تغذیہ" کے پیدا ہونے سے کہیں زیادہ غیر متناسب انداز میں پائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان اپنی عقل اور اپنے تخیّل کی مدد سے غیر ضروری طور پر اچھّے کھانے کی لذّت کے تصوّر سے اپنے اندر کھانے کی خواہش کو پیدا کر سکتا ہے۔
اس کے علاوہ انسان کے مختلف داعیات بیک وقت بیدار ہو کر اپنی اپنی طلب میں ایک دوسرے کے خلاف جا سکتے ہیں، مثلاً اس کے داعیہ اُبوّت کا تقاضا یہ ہو گا کہ وہ بچوں سے نرمی اور شفقت کا برتاؤ کرے اور اس کے داعیہ تحکّم کا تقاضا یہ ہو گا کہ اس کی فرمانبرداری کی جائے۔ یہ دونوں تقاضے بیک وقت بیدار ہو کر ایک دوسرے کے خلاف ہو سکتے ہیں۔
صرف یہی نہیں بلکہ جبلّی داعیات اور عقل کے درمیان بھی تضاد واقع ہوتا ہے: مثلاً اس کا جنگ جوئی کا جبلّی داعیہ اس کے صلح جوئی کے اخلاقی فرض سے جو اس کی عقل اس پر عائد کرتی ہے متصادم ہو سکتا ہے۔ محض یہ نہیں بلکہ اس کے شعورِ علمی، شعورِ جمالی اور شعورِ اخلاقی کے تقاضے ایک دوسرے کے خلاف جا سکتے ہیں: مثلاً شعورِ علمی کی طلب زندگی کے اخلاقی عمرانی فرائض سے غافل کر دینے کی حد تک شدید ہو سکتی ہے اور شعورِ جمالی کی یہ طلب کہ جمالیاتی سرور میں دوام و استمرار پیدا ہو اُسے اخلاقی فرائض سے بے پروائی کی حد تک لے جا کر شعورِ جمالی اور شعورِ اخلاقی کے تقاضوں میں تضاد پیدا کرنے کا موجب ہو سکتی ہے۔ نیز یہ کہ انسان کی بنیادی صورِ شعور میں سے ہر ایک میں ایک نصبُ العین مضمر ہے اور اس کی استعداد کی کمی حصولِ نصبُ العین میں رکاوٹ بن سکتی ہے۔ مثلاً انسان کا شعورِ علمی علم کے ایک نصبُ العین کو حاصل کرنے پر مُصر ہے۔ وہ نصبُ العین یہ ہے کہ یہ پوری کائنات مع اس تمام کثرت کے جو اس میں پائی جاتی ہے کسی اصولِ واحد کے تحت اس طرح منظّم ہو سکے کہ ساری کثرت ایک اصولِ واحد سے منطقی طور پر منتزع ہوئی ہو۔
انسان کے شعورِ اخلاقی میں یہ نصبُ العین مضمر ہے کہ یہ ساری کائنات ایک اخلاقی نظام میں تبدیل ہو جائے جس میں کسی نیک آدمی کو کبھی ناکامی نہ ہو اور کوئی بُرا آدمی کبھی کامیاب

نہ ہو سکے اور ہر نیک آدمی کو بقدر اپنی نیکی کے مسرت حاصل ہو اور ہر بُرے آدمی کو بقدر اس کی برائی کے ضرور رنج پہنچے۔

انسان کے شعور اخلاقی میں یہ نصبُ العین مضمر ہے وہ یہ ہے کہ انسان کا ظاہر و باطن جمال سے آراستہ ہو جائے اور اس کا پورا ماحول مجموعی طور پر اور اس کا ایک ایک جز فرداً فرداً حسن و جمال سے مزیّن ہو جائے۔

انسان کے شعورِ مذہبی میں جس نصبُ العین کے حصول کی طلب پائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کی پوری زندگی حقیقتِ حقّہ کے قرب اور اس کی حضوری کے لیے دائمی شعور میں بسر ہو۔

ان سب فطری داعیات اور ان تمام عقلی غایات اور صور شعور کے اندر مضمر تمام افراد میں ہر نصبُ العین کے مختلف انداز سے نشو و نما پانے کا اثر یہ ہے کہ ہر فرد اپنی اپنی جگہ ایک خاص نمونے پر ڈھل گیا ہے اور نتیجہ یہ ہے کہ ایک فرد اور دوسرے فرد کے درمیان تضاد پایا جاتا ہے۔ یہ تضاد ایک واقعہ ہے جس سے اِنکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تضاد افراد ہی تک محدود نہیں بلکہ ہر فرد اور معاشرے کے درمیان بھی ایک تضاد واقعے کے طور پر پایا جاتا ہے۔ دَورِ جدید کے تحلیلِ نفسی (سائکو انالیسس) کے ماہرین میں سے ایک کا خیال ہے کہ معاشرہ فرد کے لیے ایک چیلنج ہے اور دوسرے کے نزدیک فرد معاشرے کے لیے ایک چیلنج ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ایک معاشرہ دوسرے معاشرے کے لیے، ایک قوم دوسری قوم کے لیے، ایک ریاست دوسری ریاست کے لیے اور ایک تہذیب دوسری تہذیب کے لیے ایک چیلنج ہے۔ اس تضاد اور کشمکش کے باوجود انسان چاہتا ہے کہ وہ اپنی فطرت اور اس کی طلب کے مناسب کمال حاصل کرے۔

اِس گوناگوں تضاد اور کشمکش کے ہوتے ہوئے انسان کی کامیابی اور اس کے حصُولِ کمال کی شرائط یہ ہیں کہ وہ اپنے حصُولِ کمال کی جدّ و جہد کرنے کے لیے صَاحِبِ اختیار ہو۔ اس کا ارادہ ہر اندرونی اور بیرونی موثر سے آزاد ہو لیکن اگر وہ اپنے ارادے میں صاحبِ اختیار ہو بھی تو اس کی کامیابی متصوّر نہیں ہو سکتی کیونکہ عمرِ طبعی کے محدود وقفے میں مذکورہ موانعات اور مزاحمتوں کے پیشِ نظر ایسے عظیم الشّان مقاصد کے حصُول کی جد و جہد نتائج تک نہیں پہنچا سکتی۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ہر انسان نہ صرف اپنی جدّ و جہد میں صاحبِ اختیار ہو، بلکہ مرنے کے بعد بھی زندگی ہونی چاہیے، تاکہ انسان فضائلِ عالیہ کے حصُول کے لیے اپنی جدّ و جہد تمام کو پہنچا سکے۔ لیکن اگر یہ کائنات اپنی بناوٹ اور اپنی سَاخت میں بنیادی طور پر انسان کی

کامیابی سے سازگار نہ ہو تو بھی انسان کا اپنی غایات کو پانا متصوّر نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ضروری ہے کہ یہ کائنات انسان کی کامیابی سے سازگاری کے طور پر پیدا کی گئی ہو، لیکن جو تضاد انسان کو اپنی غایات اور اس کائنات کے ظاہری انداز میں نظر آتا ہے اس کے پیشِ نظر اس کی کامیابی قرینِ قیاس نہیں۔ اندریں صورت روحِ انسانی کی گہرائی سے ایک پکار اٹھتی ہے "کاش!! خدا ہوتا اور اس کی مدد فرماتا!! مگر انسان کے حواس، اس کی عقل، اس کا گمان، اس کا قیاس، اس کا وجدان غرض اس کی کوئی استعداد حتمی اور قطعی طور پر خدا کی ہستی کا اثبات نہیں کر سکتی۔

اب انسان کے فائز المرام ہونے کی شرط صرف یہ ہے کہ اگر خدا ہو تو وہ اپنے ہونے کا، اپنی حفاظت کا اپنی ہدایات کا اور اپنے فضل کا یقین انسان کو خود دلا دے۔ اس کی صورت "وحی" اور "رسالت" ہے۔ وحی کے تین متضمنات ہیں: ایک صاحبِ وحی جس پر ہدایت نازل ہو۔ اسے ایک تاریخی شخصیت ہونا چاہیے۔ دوسرے فرشتے کا توسّل۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ دل میں کسی خیال کے گزرنے کی صورت میں ہدایت آنے کے بجائے کسی ذات کا متمثل ہو کر سامنے آنا اور پیغام پہنچانا زیادہ یقین انگیز ہے۔ تیسرے مشمولاتِ وحی۔

وحی کے مشمولات

کتاب۔ سنّت۔ تاریخ

کتاب مشتمل ہے تصوّرِ کائنات، غایت، زاویۂ نگاہ، معیار، دعوت اور لائحۂ عمل پر۔

تصوّرِ کائنات عبارت ہے ماضی، حال اور مستقبل سے وابستہ توقعات کے جائزے پر مشتمل قضایا سے۔ غایت وہ منتہائے مقصود ہے جس کے حصول سے ہر قسم کا کمال وابستہ ہے۔ زاویۂ نگاہ عبارت اس موقف سے ہے جہاں سے حقائق پر نظر کرنا سب کے لیے قابلِ قبول ہو۔ معیار سے مراد پرکھنے کے ایسے اصول اور اس کے ساتھ مطابقت رکھنے والے نمونۂ کمال سے ہے، جس کے حوالے سے ہر عمل کو پرکھا جا سکے۔ دعوت وہ مقصود ہے جس کے حصول کی جدّ و جہد کے لیے کوئی جماعت اپنے آپ کو مامور سمجھتی ہو۔ لائحۂ عمل پہلے سے متعیّن کیا ہوا فرائض و اعمال کا وہ گوشوارہ ہے جس کے مطابق عمل کرنے میں غایت کے حصول کی حتمی ضمانت ہو۔

اس لیے تصوّرِ کائنات میں انسان کا اپنے ارادے میں صاحبِ اختیار ہونا جو اس کے فائز المرام ہونے کی پہلی شرط ہے۔ قرآنِ مجید کی رُو سے مسلّم ہے۔ کیونکہ انسان کی مسئولیت جواب دہی اور جزا و سزا کے لیے مکلّف ہونے کے واسطے انسان کا صاحبِ اختیار ہونا ضروری ہے، جیسا کہ اس آیۂ پاک سے ظاہر ہوتا ہے: فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ

فَلْیَکْفُرْ یعنی جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے۔ اور مرنے کے بعد زندگی ہے جس پر نہ صرف جزا و سزا کے ناگزیر ہونے کی خاطر ایمان ضروری ہے بلکہ اس کے لیے بھی کہ آخرت کا عقیدہ اس زندگی کی اصلاح پر اثر انداز ہو جیسا کہ اِس آیۂ پاک سے معلوم ہوتا ہے: کَیْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ کَفَرْتُمْ یَوْمًا یَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِیْبًا ـــــ تم کیسے صاحبِ تقویٰ اگر اس دن کا انکار کرو جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا! مطلب یہ ہے کہ یومِ آخرت پر اعتقاد کا اس زندگی پر یہ اثر مرتب ہونا چاہیے کہ یہ زندگی تقوے سے مزین ہو جائے ـــــ اور یہ کہ کائنات انسان کی کامیابی سے سازگار اصول پر عدم محض سے پیدا کی گئی ہے تاکہ اس کی کوئی خاصیت ایسی نہ ہو جو خدا کے تصرف میں رکاوٹ بن سکے ـــــ اور یہ کہ خدا ایک مجتمع صفات کمال ذات ہے۔ وہ انسان کو اس کے کمال پر فائز کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، وہی رَبّ اور رَزّاق اور رحمٰن ہے۔ وہ انسان کی تمام حاجات پوری فرماتا ہے۔ وہی ھَادِی ہے صراطِ مستقیم پر ہدایت فرماتا ہے۔ اور وہی غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ہے جو اسے ناقابلِ برداشت بارِ گناہ اور گناہوں سے بھری فطرت سے نجات دیتا ہے لیکن وہ اس کی پوری اور حقیقی مدد جب ہی فرما سکتا ہے جب تمام واقعات آشکارا و پنہاں گزشتہ و آئندہ کو جانتا ہو، لہٰذا وہ سَمِیْعٌ و بَصِیْرٌ اور عَالِمُ الْغَیْبِ وَالشَّھَادَۃِ ہے۔ علاوہ ازیں وہ قادر ہے اور "فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ" ہر اس بات کا کرنے والا ہے جس کا ارادہ کرے۔ وہ عالم اور انسان کا خالق ہے اور انسان کو اس کے کمال پر پہنچانے کا ارادہ رکھتا ہے، وہ ذُوالْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ہے اور اپنی ذات میں خیرِ کامل ہے قُدُّوْسٌ ہے اور اس کی مدد اور ہدایت فضلِ محض ہے انسان اس کے مستحق ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

خدا کی بھیجی ہوئی ہدایت کے تحت جس غایت کے حصول سے انسانی کمال وابستہ ہے وہ ایک ایسے معاشرے کا قائم کرنا اور اسے ترقی دینا ہے جو نوعِ انسانی کی وحدت کے تصور پر مبنی ہو۔ اخلاقی جدّوجہد کرنے والے اور روحانی الذّہن افراد پر مشتمل ہو جن کی جدّوجہد کا رُخ یہ ہو کہ فرد اور معاشرہ ہر قسم کے خوف و غم سے محفوظ رہیں اور ایسے معاشرے کے قیام و بقا کی آرزومند قیادت (یعنی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات) سے وفاداری اس معاشرے کے استحکام کی اساس ہو۔

اگر آج ہم ایسے احوال سے گزر رہے ہوں جن میں زندگی کے موثّرات بدل گئے ہیں تو ہمیں قرآنِ مجید کی روشنی میں غور کرنا ہوگا کہ ایسا معاشرہ کیسے قائم رہ سکتا ہے اور کیسے ترقی کر سکتا ہے۔ اخلاقی جدوجہد کرنے والے اور روحانی الذّہن افراد کس طرح پیدا ہوتے ہیں اور کیوں کر اس سیرت پر استوار رہ سکتے ہیں۔ خوف و غم سے کیوں کر مصئون رہ سکتے ہیں۔ جو لوگ سوچنا

چھوڑ دیتے ہیں وہ بدلے ہوئے حالات میں اپنی بقا اور ترقی کے شرائط پورے نہیں کرسکتے۔
رحمت کا زاویۂ نگاہ ہی وہ زاویۂ نگاہ ہے جس کی بدولت انسان اپنے انفرادی انہماک سے نکل کر عمرانی تقاضے پورے کرتا ہے۔ دراصل ہر فرد اس فطرت پر مجبول ہوا ہے کہ اس کے معاملے پر رحمت کی نظر کی جائے۔ اگر وہ خطا کار ہے تو چاہتا ہے کہ اس کے قصور سے درگزر کی جائے اور اگر وہ اپنے اندر کچھ کوتاہیاں رکھتا ہے تو چاہتا ہے کہ اس کی کوتاہیوں سے صرفِ نظر کی جائے اور اگر اسے کسی قسم کی احتیاج درپیش ہو تو وہ چاہتا ہے کہ اسے پورا کیا جائے، اس کی آرزو ہے کہ اسے سازگار عمرانی فضا میسّر آئے۔ یہ آرزو، عطا اور قبول سے پوری ہوسکتی ہے۔ وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ کی رو سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زاویۂ نگاہ "رحمت" ہے۔ "رحمت" ہی کے زاویۂ نگاہ کو اختیار کرکے لوگوں کو اس انفرادیت سے نکالا جاسکتا ہے جس پر غالب آئے بغیر معاشرہ وجود میں نہیں آسکتا۔ اسی لیے قرآن مجید "ذوی القربیٰ، مساکین، یتامیٰ، ابنائے سبیل" وغیرہ کی کفالت کو لازم قرار دیتا ہے اور ان تمام اسباب کا ازالہ ضروری ہے جو کسی قسم کے خوف و غم کا موجب ہوسکتے ہیں۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کو ازروئے قرآن معیار اور نمونۂ کمال کی حیثیت حاصل ہے۔ اس حقیقت پر قرآن مجید واضح ترین الفاظ میں یوں اصرار کرتا ہے: فَلَا وَرَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَھُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَ یُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا۔ وَمَا کَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَۃٍ اِذَا قَضَی اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗٓ اَمْرًا اَنْ یَّکُوْنَ لَھُمُ الْخِیَرَۃُ مِنْ اَمْرِھِمْ۔ لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ لِّمَنْ کَانَ یَرْجُوا اللّٰہَ وَالْیَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَکَرَ اللّٰہَ کَثِیْرًا ؕ

اخوتِ انسانی وہ دعوت ہے جس پر اسلامی معاشرے کی بقا کا انحصار ہے۔ کیوں کہ قومیں بھی افراد کی طرح بچپن، جوانی، کہولت اور بڑھاپے سے گزر کر بالآخر موت سے ہم کنار ہو جاتی ہیں، مگر موت صرف ان عمرانی ہیئتوں کے حق میں متصور ہے جن میں اجتماعیت کی اساس، نسلی، جغرافیائی یا معاشی مفاد کی وحدت پر قائم ہو اور جو معاشرہ نظامِ افکار کی وحدت پر قائم ہو اس کی تبلیغ کی بدولت دائمی زندگی میسّر آسکتی ہے۔ بشرطے کہ نظامِ افکار کی ہمہ گیری زندگی کے مجموعی تقاضوں کی تکمیل کی کفالت کرسکے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان اسلامی تہذیب کے حاملین کی حیثیت سے اگر ایک دور میں ایک خطۂ زمین میں روبہ زوال ہوگئے تو دوسرے دور میں دنیا کے کسی اور حصے میں نمایاں ہوگئے۔

حیاتِ عمرانی کے مختلف ادارے مثلاً خاندان، مسجد، مدرسہ، ریاست، بیت المال وغیرہ

اور ان کے عمل کو منظم رکھنے کے لیے اوامر و نواہی کا وہ نظام جس کی بدولت وحدتِ کردار کا شعور کسی ہیئتِ اجتماعیہ میں راسخ ہوتا ہے۔ لائحہ عمل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے اسلام میں نظامِ شریعت کو بہت زیادہ اہمیت حاصل رہی ہے، کیوں کہ اس کے بغیر اسلامی زندگی میں یکسانی کا نمونہ برقرار نہیں رہ سکتا۔

اسلامی نظامِ افکار جب نظامِ عمل کی حیثیت اختیار کرے تو اس کا نام "سنّت" ہو جاتا ہے۔ سنت فی الاصل معمول بہٖ دین کی وہ صورت ہے جسے نمونۂ کمال کی حیثیت حاصل ہے، جو معیارِ کمال کے بالکل مطابق ہے۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور نزولِ وحیِ قرآنی کا مقصود یہ تھا کہ اسلام کو بین الاقوامی سطح پر غلبہ حاصل ہو۔ اس غلبے کا انحصار سیاسی غلبے سے بڑھ کر اسلامی تہذیب کی برتری کے شعور اور اعتراف پر تھا۔ قرآنِ مجید کی یہ آیت اس مقصود کی نشان دہی کرسکتی ہے۔

هُوَ الَّذِىْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ط

اس آیۂ پاک میں قرآنی تعلیمات کے نتیجہ خیز ہونے کا دعویٰ اس تحدّی کے ساتھ کیا گیا ہے کہ اس میں کسی مبالغے کی گنجائش نہیں ہے۔

فتح مکّہ کے بعد نازل ہونے والی یہ آیت: اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ اس کی نشان دہی کرتی ہے کہ غایتِ بعثت میں چیلنج موجود تھا۔ وہ پورا ہو کر رہا اور کفّار کی مایوسی کا سبب یہ ہے کہ اب ہم غالب نہیں آسکتے اور اسلام مغلوب نہیں ہو سکتا۔ جن اصولوں میں اس چیلنج کے پورا ہونے کی ضمانت تھی ان کو منکشف کرنا ہی تکمیلِ دین ہے۔ ہم میں سے اکثر کو اسلام کے دینِ کامل ہونے کا دعویٰ ہے، لیکن اس دعوے کے سچا ہونے کی شرط یہ ہے کہ تاریخ نے جو نتائج ہمارے خلاف پیدا کیے ہیں ان کا حتمی تدارک کیا جاسکے اور بین الاقوامی زندگی میں مسلمان اس مقام و منصب پر فائز ہو سکیں جہاں پہنچ کر وہ مسلمانوں کی زندگی کو وہ رُخ دے سکیں جس کا مطالبہ اسلام مسلمانوں سے کرتا ہے۔ اِس مقصد کے لیے جدّوجہد جب ہی ہو سکتی ہے جب اسلام کی نتیجہ خیزی میں ہمارا اِعتماد بحال ہو۔

تاریخ دراصل قوموں اور تہذیبوں کے عروج و زوال کی توجیہہ کا علم ہے اور قرآنِ مجید میں جگہ بہ جگہ اُممِ سابقہ کے عروج و زوال کی طرف متوجّہ کیا گیا ہے۔ انبیائے سابقین کے اخبار کے قرآن مجید میں بار بار آنے کا مقصد یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کے قلب مبارک کو تسکین حاصل ہو۔ ان اخبار سے تسکین صرف اسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے جب امم سابقہ سے متعلق ہر قصہ یہ ثابت کرے کہ قوموں اور تہذیبوں کے اعمال کے نتائج کسی قانون سے متیقن ہوتے ہیں اور ہمیشہ حق و باطل کے تصادم میں حق ہی غالب رہتا ہے۔

تاریخی عمل جس قانون سے متعین ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ دو گروہ ہوں، ان کے دو مقاصد ہوں، ان کے پیچھے دو وفاداریاں ہوں، ان کے دو منظم ارادے ہوں۔ ان ارادوں کے درمیان تصادم ہو، اس تصادم کو کام یاب بنانے کے لیے دو پروگرام ہوں جن میں ایک مزعومہ مفاد کو محفوظ کرنے کے لیے ہو اور دوسرا مفادِ عامّہ کی راہ کھولنے اور عام نفع بخشی کے لیے۔

کسی تہذیب اور اس کی حامل قوم کے عروج کا مطلب یہ ہے کہ ان کی معیشت کامل ہو، وہ معاشی اعتبار سے خود کفیل ہوں۔ زراعت، تجارت اور صنعت میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہوں۔ قومی غایت اور ثقافتی مقاصد کی پوری بصیرت انھیں حاصل ہو۔ بحیثیت ایک سیاسی وجود کے خوب منظم ہوں۔ عمرانی نظام کی حیثیت سے ان میں کامل ضبط و انقیاد پایا جاتا ہو۔ زندگی کے ہر پہلو میں انھیں معیاری قیادت میسر ہو۔ تعلیمی اعتبار سے ترقی یافتہ ہوں۔ سب اعلا صلاحیتیں رکھنے والے افراد کے لیے ترقی کر کے اعلاترین مناصب پر فائز ہونے کی راہیں کھلی ہوئی ہوں۔

قومی اور تہذیبی زوال کا مطلب یہ ہے کہ معیشت نامکمل ہو، زراعتی، تجارتی اور صنعتی اعتبار سے پس ماندہ ہوں۔ قومی غایت اور ثقافتی نصب العین کی نسبت ان کی نظر خیرہ ہو کے رہ گئی ہو، ضبط و انقیاد سے محروم ہوں۔ عمرانی ادارے غیر منظم ہوں اور نااہلوں کے ہاتھوں میں ہوں۔ زندگی کے کسی پہلو میں موثر قیادت میسر نہ آئے۔ اجتماعی زندگی کے تمام پہلو مزعومہ مفادات رکھنے والی سازشی ذہن کی محدود جماعتوں کے تسلط و تصرف میں ہوں، جنھوں نے عام لوگوں کی ترقی کی تمام راہیں مسدود کر رکھی ہوں اور کوئی فرد چاہے کیسا ہی لائق اور قابل کیوں نہ ہوں، مگر وہ اپنی صلاحیت کے مطابق کسی مقام و منصب پر فائز نہ ہو سکتا ہو۔

معاشرے میں مثبت اور منفی، تعمیری اور تخریبی دونوں عمل جاری رہتے ہیں۔ جب تعمیری جدّ و جہد کرنے والوں کا غلبہ ہو تو قوم اور اس کی تہذیب کو عروج حاصل ہوتا ہے اور تخریبی جدّ و جہد کرنے والوں کو غلبہ ہو تو زوال یقینی ہو جاتا ہے۔

جب تاریخ میں زندگی کو کتاب و سنّت کے مطابق ڈھالنے کی سعی ہوتی رہے تو اس جدوجہد کے انحراف عن السنۃ اور بے راہ روی کے استعمال سے پاک نہ ہونے کے باوجود کتاب و سنّت

کے مطابق ہونے کی حد تک تاریخ بھی اسلام ہے۔

نتیجہ خیزی سے کیا مراد ہے؟ نتیجہ خیزی کا مطلب یہ ہے کہ اسلام اپنی تعلیمات سے جن نتائج کو بروئے کار لانے کا دعویٰ کرتا ہے وہ نتائج پیدا ہو کر رہے ہیں۔ جب ایک طرف ہم اسلام کی تعلیمات کے اس دعوے پر نظر کرتے ہیں اور دوسری طرف اپنی زندگی کو ان نتائج سے محروم پاتے ہیں تو ہمارے ذہن میں طرح طرح کی الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔ کبھی ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام کی تعلیمات کے نتیجہ خیز ہونے کا دعویٰ پورا ہو چکا ہے اور اب ہمارے زوال و انحطاط کا دور ہے اور ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ قرآنِ حکیم زندگی کی ضمانت دیتا ہے اور یہ بھول کر قرآنِ مجید کی ان تنبیہات کے پیشِ نظر جن کے مخاطب ہم ہیں کہ تم پچھلی امتوں کی طرح بے راہ نہ ہو جانا، اپنے آپ کو باور کرانا چاہتے ہیں کہ ہمارا بے راہ ہو جانا ہی مقدّر تھا۔

کبھی ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام اور مسلمان دو جداگانہ حقیقتیں ہیں اور مسلمانوں کا عمل اسلام پر نہیں ہے۔ یہ فیصلہ وہ ہے جو دشمنانِ اسلام نے صادر کیا ہے اور اس کے زیرِ اثر ہم اپنی پوری تاریخ کو اسلام سے ابا، انحراف، انکار، سرکشی اور بغاوت کی تاریخ کہتے میں بھی تامل نہیں کرتے اور یہ بھول جاتے ہیں کہ اگر ہم اسلام سے اتنے ہی منحرف ہو چکے ہیں، جتنا کہ ہم اپنی سادہ لوحی سے سمجھے ہوئے ہیں تو پھر دشمنانِ اسلام مسلمانوں کی دشمنی میں اتنے راسخ العقیدہ کیوں ہیں جس کی شہادت ماضی اور حال کی تاریخ مہیا کر رہی ہے۔

ہم مسلمان کیا ہیں؟

ہم اسلام کے دعوے دار ہیں اور بطور ورثے کے آبائی اسلام کے حامل ہیں۔ عام مسلمانوں کے لاشعور میں اسلام بہ حیثیت ایک زندہ قوم کے اس سے زیادہ قوی تر انداز میں موجود ہے، جتنا شعوری سطح پر ہمارے عمل میں نمایاں ہے۔ مگر اپنے عظیم الشّان ماضی سے اپنے حال کا موازنہ کر کے ہم اس شبہے میں گرفتار ہو جاتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں بھی یا نہیں؟ کیوں کہ اسلام کے جو موثّرات ہماری زندگی پر مرتّب ہونے چاہییں وہ ہمیں نظر نہیں آتے اور دوسری طرف جب ہم آیاتِ قرآنی پر نظر کرتے ہیں تو ہماری زندگی ان نتائج سے خالی نظر آتی ہے جن کا دعوےٰ آیاتِ قرآنی میں پایا جاتا ہے مثلاً: لَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ ۔ غم نہ کھاؤ۔ غالب تم ہی رہو گے اگر تم مومن ہو ــــ غلبے سے اپنے آپ کو محروم پا کر ہمارے دل میں یہ خطرات گزرتے ہیں کہ ہم دراصل ہیں بھی یا نہیں!

ہمارا حال یہ ہے کہ ایک طرف عام مسلمان ہیں، جن کے اندر مسلمانوں کے ہر دورِ ابتلا میں ایسے افراد ابھرتے ہیں جنھوں نے اسلام کے تقاضوں کو پورا کیا ہے جن میں سرفروشی و جاں سپاری

کا جذبہ اب بھی موجود ہے۔ جو قوم جان کی قربانی دے سکتی ہے اس کی نسبت یہ سوچنا کہ وہ زوال پذیر ہو گئی ہے، بالکل غلط ہے۔

اسی سوادِ اعظم ہی سے تاریخی تقاضے سے وہ قیادت بھی ہر دور میں اُبھری ہے، جس نے مسلمانوں کے مسائل کو حل کرنے کی ذمّے داری پورے عزم کے ساتھ اٹھائی ہے اور وہی قیادت اس ذمّے داری سے عہدہ برآ ہوئی ہے۔

عام مسلمانوں کے علاوہ آج کی دُنیا میں دو اور محدُود گروہ مسلم معاشرے میں پائے جاتے ہیں جو اپنے آپ کو عام مسلمانوں سے وابستہ نہیں کرتے۔ جن میں ایک ذہن وہ ہے جسے جدید ہونے کا دعویٰ ہے اور دوسرا وہ ہے جو اپنے آپ کو راسخ العقیدہ کہتا ہے۔ دونوں طرف کے ذہن مسلم معاشرے میں قیادت کا دعویٰ رکھتے ہیں اور اپنے آپ کو ایک دوسرے سے مختلف سمجھتے ہیں۔

یہ نام نہاد راسخ العقیدہ ذہن مسلمانوں کی مذہبی قیادت کا دعوے دار ہے اور زندگی کے باقی پہلوؤں کی قیادت سے محروم ہو چکا ہے، لہٰذا اس گروہ کی مذہبی قیادت بھی بے نتیجہ ہو کر رہ گئی ہے۔ یہ گروہ اسلامی فضائل سے تو انکار نہیں کرسکتا اور ماضی میں بین الاقوامی سطح پر برسرِاقتدار رہ چکا ہے، اِس لیے اپنے آپ کو ایک بہتر جماعت اور لہٰذا اقتدار کا حقدار سمجھتا ہے۔ مگر بین الاقوامی سطح پر اسلام اور مسلمانوں کے مضمحل ہو جانے اور مخالفینِ اسلام کے غالب ہونے کی وجہ سے یہ تلقین کررہا ہے کہ حق کو شکست ہو گئی اور باطل غالب آگیا ہے۔ اس کا ردِّعمل نام نہاد جدید ذہن پر یہ ہے کہ حق تو ہونا ہی وہ ہے جو غالب رہے۔ لہٰذا آج اسلام دورِ جدید کے مسائل کو حل نہیں کرسکتا اور موجودہ دور کی زندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر ہے۔ اس لیے یا تو ہمیں اسلام سے دست بردار ہو جانا چاہیے یا اس کی ایسی تعبیر لانی چاہیے جو اِسلام اور دورِ جدید کی تہذیب سے سازگاری پیدا کرنے میں رکاوٹ نہ بن سکے۔ اس مقصد کے پیشِ نظر اجتہاد کی ضرورت اور جدید مغربی تہذیب اور اسلام کے درمیان کشمکش کو نمایاں کرکے اجتہاد کی ضرورت کے شعور کو گہرا کرنے کی سعی کی جارہی ہے اور اس اِحتیاج سے قطع نظر کرکے کہ اِجتہاد کتاب و سنّت کے مطابق ہونا چاہیے اور اجتہاد کرنے والوں کو صفتِ تقویٰ سے متّصف ہونا چاہیے اور یہ کہ جن کی اسلام کے ساتھ وفاداری ہر شک وشبہے سے بالاتر نہ ہو اور جن کا فکر و عمل اسلام کے باب میں سَند کا درجہ نہ رکھتا ہو انھیں اجتہاد کی ذمّے داری نہیں سونپی جاسکتی، یہ کوشش کی جارہی ہے کہ وقتی مسائل کو حل کرنے کے لیے "اِسلامیت" کا ہر مدّعیِ اِسلام کے مفاد کے علی الرغم اپنا حق سمجھتا ہے کہ جو رائے چاہے وہ قائم کرے اور اس کی تبلیغ کرے۔

یہ وہ ذہن ہے جو مستعمراتی نظام کے زیرِ اثر وجود میں آیا۔
جن موثرات کی بنا پر اسلام کی نتیجہ خیزی میں ہمارا اِعتماد مضمحل ہوا ہے وہ دو طرح کے ہیں: ایک داخلی، دوسرے خارجی۔

داخلی اثرات میں خود مسلمانوں کا وہ ذہنی التباس ہے جو معیاری دین اور معمول بہ دین کے اِمتیازات سے صرفِ نظر کر لینے سے ان میں پیدا ہو گیا ہے اور ہمارا جدید ذہن معمول بہ دین کے نتیجہ خیز ہونے کی نسبت اپنا اِعتماد کھو چکا ہے اور راسخ العقیدہ ذہن معیارِ دین کی روشنی میں معمول بہ دین پر تنقید کرنے اور ایسی بے اِطمینانی کے پیدا ہونے سے جو اِصلاحِ حال کی موجب ہو اس لیے گھبراتا ہے کہ ہم دین سے بالکل ہی محروم ہو جائیں۔ اس لیے وہ ذہن چند مابعد الطبیعی عقائد، چند اخلاقی اسباق، چند تمدّنی ضوابط، چند معاشرتی اصولوں، چند عدالتی قواعد اور چند رسوم و ظواہر کو دین کامل سمجھ کر اس پر قناعت کیے ہوئے ہیں اور پورے دین کو محض اخلاقی فضیلت کی تمثیل پر اس انداز سے اپنائے ہوئے ہیں کہ اخلاقیات سے کوئی نتیجہ پیدا ہو یا نہ ہو وہ اپنی جگہ فضیلت ہے اور بالذّات مقصود ہے۔

یہ اندازِ فکر بھی زندگی کے وحدت ہونے سے صرفِ نظر کرنے کی بنا پر اور لہٰذا اخلاق اور معیشت کو اس انداز سے باہمی جوابی اور وجوبی طور پر ایک دوسرے سے مربوط نہ سمجھنے کی بنا پر پیدا ہوا کہ جس ربط کی طرف قرآن مجید ان الفاظ میں نشان دہی فرماتا ہے: لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ "تم ہرگز نیک نہیں بن سکتے جب تک وہ خرچ نہ کرو جو تمھارے نزدیک پسندیدہ ہے"۔ ربط دونوں کے درمیان یہ ہے کہ اتّفاق کرنے والے کے حق میں انفاق نیکی ہے اور اس سے مستفید ہونے والے کے حق میں وہی نیکی معیشت ہے۔ اس ضروری ربط سے صرفِ نظر ہو جانے کے باعث ہماری توجہ نظریاتی سطح پر صرف اخلاقیت پر مرکوز ہو کر رہ گئی ہے اور اس بات سے ہم غافل ہو گئے ہیں کہ محمدی معیشت بھی اسی درجے میں دین ہے جس درجے میں محمدی اخلاق علی صاحبہ الصّلوٰۃ والتسلیم دین ہے اور ہم صرف آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث پر اپنی توجہ مرکوز رکھتے ہیں۔ اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ۔ جس سے مراد وہ فقر ہے جو اپنے اوپر خود لازم کیا جاتا ہے کہ دوسروں کی زندگی سے اس فقر کو دُور کیا جا سکے، جس کی نسبت کہا گیا ہے کہ کَادَ الْفَقْرُ اَنْ یَّکُوْنَ کُفْرًا۔ "افلاس قریب ہے کہ کفر کو پہنچا دے"۔

اسلام کی نتیجہ خیزی میں سے ہمارے اِعتماد اور یقین کو مضمحل کرنے میں سب سے اہم اور موثر مستعمراتی نظامِ معیشت کا وہ دور ہے جب ہم اپنے ملک میں اِقتدار سے محروم ہو گئے تھے اور ہماری ساری دولت غیر ممالک میں منتقل ہو جانے سے ہمارے خواص اور عوام کے لیے ایک جیسا معاشی ابتلا پیدا

ہوگیا تھا اور اس ابتلا میں خواص کا شعار دھوکہ دینا اور کسی طرح دولتمندی کے ایک معیار کو برقرار رکھنا بن گیا تھا اور آج وہ سب اور ان کے اتباع سے جسے میسّر آسکے وہ دولت پیدا کرنے کے معاملے میں "جلد دولت مند بنو" کے نعرے پر عمل کر رہا ہے اور ہر ملک کے دریافت شدہ معاشی وسائل کے محدود ہونے کی بنا پر اس کے حصولِ دولت میں کامیابی کا انحصار اوروں کی محرومی پر ہے اور اس مستعمراتی نظام کے تحت سوڈیڑھ سو سال غلامی کی زندگی بسر کرنے اور معاشی ابتلا میں گھرے ہوئے ہونے کے باعث عوام کی نفسیات یہ ہے کہ انھیں حضورِ قلب سے نفرت ہوگئی ہے، وعظ ان کے لیے بے اثر ہوگیا ہے، بے ضمیری اور بدی کے درمیان کوئی حد فاصل باقی نہیں رہی، مفاد پرستی کے نظام سے سازگاری کرنے پر ان کا دل مائل ہوگیا ہے اور طلبِ زر میں دھوکا کھانا ان کا شعار بن گیا ہے۔

بین الاقوامی سطح پر دو نظاموں کا غلبہ ہے: مشینی صنعتی سرمایہ داری اور اشتراکیت اور دنیا دو نہایت متخاصم گروہوں میں بٹ گئی ہے جو انتہائی مہلک اسلحہ سے مسلح ہیں اور انھیں ہرگز اپنی طاقت پر اعتماد نہیں ہے۔

یہ دَور وسیع تر اجتماعی تنظیمات کا دَور ہے۔ دونوں نظاموں کے حامل گروہوں کے درمیان قوی تر عالمی تنظیم پیدا کرنے کے سلسلے میں رسّہ کشی ہو رہی ہے۔ صدرِ محترم پاکستان کا یہ اقدام کہ عالمِ اسلام کا اتحاد قائم ہو، ایک نہایت اہم اقدام ہے۔ اگر ہم بہ حیثیت مسلمان کے زندہ رہنے کی آرزو سے دست بردار نہ ہوں گے تو متضاد مفادات کے باعث معاند گروہوں میں بٹی ہوئی انسانیت کا مسئلہ صرف اسلام سے حل ہو سکتا ہے۔ عالمِ اسلام کے باہمی مفادات کی تکمیل کی سعی کی جائے تو یہ اتحاد زیادہ مضبوط ہو سکتا ہے اور اسلام سے پیدا ہونے والے شعورِ وحدت کی بنا پر وسیع تر بین الاسلامی تنظیم کی سعی کے بغیر ان دو غالب نظاموں میں سے کسی ایک کے اندر ضم ہو جانے سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکیں گے۔

عالمِ اسلام کے لیے اسلام جس قدر مضبوط اور صحت مند تنظیم کی بنیاد بن سکتا ہے، اس کی برابری کسی اور تصور کی حامل کوئی اور عالمی تنظیم نہیں کرسکتی، اس لیے ہمیں اس کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ اس کے وجود میں آنے سے ہی ہمارے بیشتر مسائل کے حل ہونے کا انحصار ہے۔ ہمارے حق میں اسلام ہی ایک حیات بخش نظامِ زندگی ہے، اس کی نتیجہ خیزی کو آزمانے ہی سے ہمارا یقین اسلام کی نتیجہ خیزی میں بحال ہو سکتا ہے۔ اللہ پاک ہمیں اسے بہ تمام و کمال اپنانے کی توفیق عطا فرمائے۔

"شامِ ہمدرد"
۴ر جون ۱۹۶۴ شمسی

کرنل مجید ملکؒ

"شام ہمدرد" (لاہور) کی آج یہ دسویں مجلس ہے اور اس کے "مہمان مقرر" مشہور ادیب اور صحافی جناب کرنل مجید مَلک صاحب ہیں۔ میدانِ صحافت اور دنیائے ادب میں مَلک صاحب کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں، اور یقینی طور پر ان کا شمار پاکستان کی ان شخصیتوں میں ہے جو متاثر ہونے والا قلب اور سوچنے والا دماغ رکھتی ہیں۔ جن لوگوں نے "مسلم آؤٹ لک" "ایسٹرن ٹائمز" "اسٹیسمین" "کارواں" کے اداریے اور تحریریں پڑھی ہیں، وہ ان جرائد کے مُدیر کرنل مجید ملک کے اندازِ فکر سے اچھی طرح واقف ہیں۔ پھر وہ اپنی شارٹ اسٹوریز، ڈراموں اور نظموں میں کھل کر سامنے آجاتے ہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ ان کو اپنے ماحول سے کیسی محبت اور اپنے لوگوں سے کیسا انس ہے اور انھوں نے اپنے قلم کو اصلاحی تحریرات کے لیے اٹھایا ہے اور حزم و احتیاط کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔

بلاشبہ یہ ممکن نہیں ہے کہ ہمارے حسبِ خواہش ارض و سما میں ایسا انقلاب آجائے کہ گزری ہوئی کل ہمیں واپس مل جائے اور گیا ہوا وقت ہاتھ آجائے، لیکن ہم گزری ہوئی باتوں کو یاد تو کر ہی سکتے ہیں: کرنل صاحب نے ماضی میں اور کیا کیا کیا ہے اس میں تنوع ضرور ہو مگر اصول و مقصد کی یکسانیت کی شان پائی جاتی ہے اور صرف ایک ہی چیز ان کی شخصیت و کردار پر روشنی ڈالتی ہے:

۱۹۴۰ - ۴۱ : اورگنائزر کاؤنٹر پروپگینڈا - انڈیا
۱۹۴۲ - ۴۴ : چیف انڈین پبلک ریلیشنز آفیسر، مڈل ایسٹ اینڈ سنٹرل میڈیٹیریشن فورسس۔
۱۹۴۵ - ۴۶ : ڈائرکٹر آف پبلک ریلیشنز۔ انڈیا
۱۹۴۷ : ڈائرکٹر آف پبلک ریلیشنز۔ مسلم لیگ
۱۹۴۷ - ۴۸ : آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی وزیر اعظم پاکستان کے ساتھ
۱۹۴۸ - ۵۰ : پاکستان کی طرف سے یونائیٹڈ نیشنز میں خصوصی فرائض کی انجام دہی۔
۱۹۵۰ - ۵۹ : پبلسٹی ایڈوائزر اینڈ پرنسپل انفرمیشن آفیسر۔ حکومتِ پاکستان
۱۹۵۹ - ۶۲ : کولمبو پلان آفیسر
۱۹۶۳ : ڈائرکٹر سنٹرل اُردو ڈیولپمنٹ بورڈ۔



کرنل مجید ملک

[شام ہمدرد لاہور ۲ جولائی ۱۹٦٤ شمسی]

جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے کرنل صاحب کو پاکستان سے بڑی محبت ہے اور اپنے ماحول سے انس ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ ایک مستقل ملازمت کو خیرباد کہہ کر مسلم لیگ کی تنظیم میں شریک نہ ہوتے اور جب ۱۹۵۰ء میں فارن سروسز کی آسامیوں کو پُر کرنے کا مرحلہ آیا تو باوجودیکہ اِن کا ۵۴ منتخب لوگوں میں چھٹا نمبر تھا انھوں نے پاکستان سے باہر جانے کے بجائے وطن میں رہنا ہی پسند کیا۔ یہ انکی خوش قسمتی ہے کہ فرائضِ مفوضہ کی انجام دہی کے سلسلے میں انھوں نے دنیا دیکھ لی اور دنیا والوں کو دیکھ لیا اور اِن تجربات سفر و سیاحت نے ان کی فکر و تحریر میں پوری اثر اندازی کی ہے۔ ان ہی تحریروں کو پڑھ کر میں نے یہ غلط اندازہ نہیں لگایا ہے کہ کرنل صاحب اب تک چین نہیں گئے ہیں!

کرنل مجید ملک بڑے باغ و بہار انسان ہیں اور ان باغ و بہار شخصیتوں کے ساتھی رہے ہیں اور ساتھی ہیں جن کی بدولت نہ معلوم کتنی علمی، ادبی اور ثقافتی مجلسیں قائم ہوئیں اور ملت کے مزاج پر اثر انداز ہوئیں۔ مولانا عبدالمجید سالک مرحوم، مولانا چراغ حسن حسرت مرحوم سے کون ناواقف ہے۔ سید امتیاز علی تاج، فیض احمد فیض، ابوالاثر حفیظ جالندھری، عبدالرحمٰن چغتائی آج بھی ہم میں موجود ہیں۔ ان سب سے کرنل صاحب گھلے ملے ہیں، ان کا اثر قبول کیا ہے اور ان پر اثر انداز ہوئے ہیں۔

آج کرنل مجید ملک صاحب جو کہانی ہمیں سُنانے آئے ہیں، میرا خیال ہے کہ صحافت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے اور اچھا ہے کہ نہیں ہے کیوں کہ صحافت اب کوئی ایسی باوقار چیز رہی بھی نہیں ہے اور جو لوگ صحافت کو باوقار رکھنا چاہتے ہیں اور ایسا کرنے کا عزم کر چکے ہیں ہم جانتے ہیں کہ ان کو کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آج تو کرنل صاحب ہم سب کو پکڑ کر ماضی کے کسی دور کونے میں لے جائیں گے اور کسی ایسی ستھری مجلس میں لے جائیں گے جس سے دل و دماغ کو ایک ایسی طمانیت و اطمینان حاصل ہوگی جو اَب ناپید ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ حال دکھا کر کرنل صاحب کا منشا یہ بھی ہو کہ ہم "شامِ ہمدرد" کے بارے میں بھی غور کریں کہ کیوں کر اس مجلس کو اور زیادہ مفید و کارآمد بنایا جاسکتا ہے۔

محمد سعید

ایک یادگار علمی صحبت

جناب کرنل مجید ملک۔ ڈائرکٹر سنٹرل اردو بورڈ لاہور

یہ ۱۹۳۳ء کے اواخر کی غالباً دسمبر ۱۹۳۳ کے ابتدائی دنوں کی، بات ہے۔ میں علامہ اقبال کے درِ دولت پر حاضر ہوا۔ عصر کا وقت تھا، اور آپ خلافِ توقع اور خلافِ معمول اکیلے بیٹھے تھے۔ اتفاق سے اسی دن میری نگاہ سے فارسی کا ایک شعر گزرا تھا جس نے میرے دل پر گہرا اثر کیا تھا۔ میں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور عرض کیا کہ آپ اجازت دیں تو ایک شعر سناؤں جو میرے خیال میں بہت اچھا ہے۔ جوانی کا زمانہ تھا۔ اچھا شعر دل میں ایسا تلاطم پیدا کر دیتا تھا کہ بار بار پڑھے اور سنائے بغیر سکون میسر نہ ہوتا تھا۔ علامہ اقبال غالباً بلکہ یقیناً میری اور میرے بعض دوستوں کی اس کمزوری سے واقف تھے۔ چناں چہ فرمایا سناؤ۔
میں نے عرض کیا:

کدام خرمنِ گل را کشید در آغوش
کزاب آئینہ بوئے گلاب می آید

فرمایا اچھا شعر ہے۔ کس کا ہے؟ میں نے عرض کیا ابو طالب کلیم کا۔ پھر فرمایا اچھا شعر ہے۔ ہر شاعر اپنے اپنے خیال اور فہم کے مطابق محبوب کے حسن و جمال کی تعریف و توصیف کرتا ہے۔ لیکن اس شعر میں ایک پرانے مضمون کو ایک نئے اور شگفتہ اسلوب سے ادا کیا گیا ہے۔
ازاں بعد آپ نے حسبِ معمول حکمت کے موتی بکھیرنے شروع کیے اور میں خاموشی کے ساتھ ان موتیوں سے اپنا دامنِ تہی بھرنے کی کوشش کرتا رہا۔ موضوعِ گفتگو بار بار بدلتا رہا۔

مولانا حکیم برکات احمد نے زمان و مکان کی بحث پر کیا اظہارِ خیال کیا ہے؟ افسوس ہے کہ گزشتہ ایک صدی میں مسلمانانِ ہند نے ادق فلسفیانہ مسائل پر جو کچھ لکھا ہے وہ عوام بلکہ خواص سے بھی پوشیدہ ہے۔ قرآن میں ایک سورۂ دہر ہے اور ایک سورۂ عصر۔ دہر اور عصر میں کیا فرق ہے؟ اور سورۂ دہر کو سورۂ عصر اور سورۂ عصر کو سورۂ دہر کیوں نہیں کہا گیا؟ اسلامی مساجد اور اسلامی مقابر کی ساخت میں فنی لحاظ سے کیا فرق ہے؟ اور کیوں ہے؟ مسجد قرطبہ کی تعمیر میں شکوہ، سربلندی اور تمکنت اور — تاج میں حسن، نزاکت اور پاکیزگی کیوں نمایاں تر ہیں؟ زندگی اور آرٹ کا آپس میں کیا تعلق ہے؟ عربی شاعری اور ایرانی شاعری میں کیا فرق ہے؟ ایران نے عربی شاعری سے کیا کچھ اخذ کیا اور اس میں کیا اضافہ کیا؟ اردو شاعری نے ایرانی شاعری کا تتبع کیوں کیا، اور کس حد تک کیا؟ دہلی اور لکھنؤ کی زندگی زبان اور طرزِ بیان پر کہاں تک اثر انداز ہوئی؟ آرٹ کی غرض و غایت کیا ہے؟

میں نے پوچھا، کیا آپ کے نزدیک آرٹ بجائے خود کوئی حیثیت نہیں رکھتا؟ قائم بالذات نہیں؟ فرمایا میرے نزدیک آرٹ زندگی کی اقدار کا تابع ہے۔ اردو شاعری ہندستان کے دَورِ انحطاط کی پیداوار ہے، اِس لیے کم زور، غیر فطری اور حد درجے کی مصنوعی ہے۔ آرٹ اقوامِ عالم کی زندگی کا عکس ہے۔ کسی قوم کے آرٹ کو دیکھ کر اس قوم کی نفسیاتی کیفیتوں کا صحیح نقشہ کھینچا جا سکتا ہے اور سچا آرٹسٹ وہ ہے جو اپنے کمال کو بنی نوعِ انسان کی بہتری کے لیے وقف کر دے۔

میں نے عرض کیا، "فرحت"، محض "فرحت" بھی انسانی زندگی کا ایک لازمی جزو ہے۔ اگر کوئی شعر کسی کو ہنسا دے یا آمادۂ رقت کر دے، کیوں کہ بسا اوقات رقت میں بھی فرحت پنہاں ہوتی ہے تو یقیناً وہ شعر اپنے مقصد میں کام یاب ہے۔ فرمایا "بے شک، لیکن اردو شعرا بھی اپنی قوم کے لیے فرحت مہیا کرتے ہیں اور پرانے عربی شعرا بھی کیا کرتے تھے! دونوں میں بہت تفاوت ہے۔ عربی شاعری اور اردو شاعری میں وہی فرق ہے جو ایک سرفروش، جنگ جُو قوم اور ایک عشرت زدہ قوم کے تاثرات میں ہوتا ہے۔ اس کے معنے یہ نہیں کہ میرے نزدیک اس زمانے کی عربی شاعری صحیح قسم کی شاعری تھی۔ عربستان کی زندگی کے عیوب عربی شاعری میں عیاں ہیں لیکن اِن عیوب کی نوعیت اردو شاعری کے عیوب سے مختلف ہے۔ میرے نزدیک حقیقی آرٹسٹ وہ ہے جو اپنی قوم کا نبض شناس ہو اور آرٹ کو قومی امراض و عوارض کے دفعیہ کا ذریعہ بنا دے۔ شاعر امرالقیس کی طرح اشعر الشعرا ہونے کے باوجود "قائدہم الی النار" ہو سکتا ہے اور شاعر ہی اپنے حُسنِ کلام کی وجہ سے اِس رتبے تک پہنچ سکتا ہے، جس رتبے پر

بعید پہنچا کہ خود سرورِ کونین کو اس سے ملنے کا شوق تھا۔ علاوہ ازیں جسے تم "کام یاب شعر" کہتے ہو وہ اور چیز ہے اور آرٹ کے حقیقی معیار پر پورا اترنے والا شعر اور چیز ہے۔ وہ شاعری جو آرٹ کے حقیقی معیار پر پوری اترتی ہے پیغمبری کا جزو ہے۔ وہ شاعری جو اس معیار پر پوری اترے یا نہ اترے لیکن فنی معیار پر پوری اترے "کام یاب" شاعری ہے۔

میں نے عرض کیا، اردو کا کوئی شعر جسے آپ "کام یاب" سمجھتے ہوں اور جو آپ کو پسند ہو، فرمائیے۔

قدرے توقف کے بعد فرمایا، بہت کم اُردو اشعار میرے ذہن میں ہیں اور یوں بھی شاید دل پر گہرا اثر چھوڑنے والے اشعار اردو میں کم ہیں۔ تم شعر سُناتے جاؤ۔ جو شعر پسند ہوگا، کہہ دونگا۔ میں فکر میں غرق ہوا۔ لیکن ابھی کچھ کہنے نہ پایا تھا کہ آپ نے پوچھا، یہ کس کا شعر ہے:

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے

میں نے عرض کیا، غالباً داغ کا ہے۔ فرمایا، غالباً داغ کا نہیں، لیکن اچھا شعر ہے۔ ہر لحاظ سے کام یاب۔ شاعر نے ایک نقطۂ نظر کو چیدہ الفاظ میں اور مکمل طور پر بیان کر دیا ہے۔ یہ نقطۂ نظر مشرق میں عام ہے۔ مختلف شعرا نے مختلف پیرایوں میں یہی خیال ظاہر کیا ہے۔ غالباً ان تمام اشعار میں سے یہ شعر بہترین ہے لیکن قابلِ غور بات یہ ہے کہ یہ نقطۂ نظر شاعر بلکہ جملہ قوم کی نفسیاتی کیفیت کا مظہر ہے۔ شاعر وقت کے سیلاب کے سامنے اپنے آپ کو بے حقیقت تصور کرتا ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ دن اور رات کے ایاب و ذہاب پر اس کی شخصیت مطلقاً اثر انداز نہیں ہوسکتی۔ وہ "زمان" کو محض دن اور رات کا تسلسل سمجھتا ہے۔ حصولِ مدّعا، کارکردگی اور جدّ و جہد کا ذریعہ نہیں سمجھتا۔ وہ وقت کے دھارے پر ایک تنکا ہے، جسے موجیں اِدھر اُدھر جدھر چاہتی ہیں پٹک دیتی ہیں۔ وہ ان موجوں کے خلاف نبرد آزمائی نہیں کرتا۔ انھیں اپنی راہ پر نہیں لاتا۔ راہ پر لانے کی کوشش بھی نہیں کرتا۔ کوشش کرنے کی خواہش بھی نہیں رکھتا۔ "صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے" یہ احساس اس قوم یا اس قوم کے کسی فرد کا ہے جو سیلِ زمانہ کے سامنے اپنی بے بسی کا معترف ہے۔ معترف ہی نہیں، کامل طور پر آگاہ ہے۔ اس حد تک آگاہ ہے کہ اپنی بے بسی کو قانونِ قدرت کا جزو سمجھتا ہے۔ جد و جہد کرنے والی اقوام کی صبح "ہوتی" نہیں۔ وہ گویا صبح کرتی" ہیں اور شام "کرتی" ہیں۔ وہ وقت کو دن اور رات اور مہینے اور سال کے پیمانے سے نہیں ناپتیں، بلکہ عمل اور سعی پیہم اور نتائج کے پیمانے سے ناپتی ہیں ــــــــ یہ سب کچھ ہے لیکن یہ شعر اچھا ہے، کیونکہ جس خیال کو شاعر ادا کرنا چاہتا تھا اس خیال کو اس نے موثر طریقے سے ادا کر دیا ہے۔

"سیل زمانہ کے سامنے انسانی بے بسی" ـــــــ اس موضوع پر یہ بہت اچھا شعر ہے۔
میں نے عرض کیا آپ کے نزدیک کامیاب اشعار میں کیا خوبیاں ہوتی ہیں۔ فرمایا، بہت سی خوبیاں ہوتی ہوں گی لیکن جدّت اور فنّی خوبی یہ دو تو بہرحال ضروری ہیں۔ میں نے عرض کیا، تو کوئی اور شعر فرمائیے جو آپ کو پسند ہو اور اس معیار پر پورا اترے۔ ارشاد کیا، تم شعر سناؤ۔
میں نے غالب کا یہ شعر پڑھا ؎

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

فرمایا، اچھا شعر ہے۔ میں نے عرض کیا، اس موضوع پر آپ کا بھی ایک شعر ہے، جو مجھے غالب کے شعر سے زیادہ دل کش معلوم ہوتا ہے۔ پوچھا، کون سا؟ میں نے عرض کیا، پیامِ مشرق میں ہے ؎

از بہرِ آشیانہ خس اندوزیم نگر باز ایں نگر کہ شعلہ در گیرم آرزو ست

فرمایا، زندگی میں ایک جانب اعلا مقاصد کی کشش ہوتی ہے، جو مختلف قسم کی قربانیوں کے سوا حاصل نہیں ہو سکتی۔ اعلا مقاصد مشکل کشی اور جفا طلبی اور نالۂ شبگیر اور فغان صبح گاہی کے متقاضی ہوتے ہیں۔ دوسری طرف تن آسانی، عافیت کوشی اور مصلحت بینی کی کشش ہے جو زندگی کے خمیر میں آمیختہ ہے اور جو زر و مال، جاہ پسندی اور آرام طلبی کے راستے پر لے جاتی ہے۔ ہر صاحبِ دل تمام عمر ان متضاد اور متخالف آرزوؤں کی کش مکش میں مبتلا رہتا ہے اِس کش مکش کے بارے میں کلیم کا ایک شعر یاد آگیا جو شاید ان دونوں شعروں سے بہتر ہے کیوں کہ سادہ ہے اور تشبیہہ و استعارے کے سہارے سے آزاد ہے ؎

در کشاکش تا بہ کے باشم کلیم دل بہ درد و جاں بہ درماں می کشد

میں نے یہ شعر دو مرتبہ دہرایا اور سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے آتش کا یہ شعر پڑھا ؎

نہ پوچھ حال مرا چوبِ خشکِ صحرا ہوں لگا کے آگ مجھے کارواں روانہ ہوا

اور اس کے بعد درد کے یہ دو شعر:

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے ہم تو اِس جینے کے ہاتھوں مر چلے
ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

فرمایا درد اردو زبان کا واحد صوفی شاعر ہے "زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے۔ ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے" خوب شعر ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر زندگی کی بے پناہ کشاکش سے عاجز آگیا ہے اور جب تک جان ہے وہ آمادۂ پیکار ہے۔ نفسیاتی لحاظ سے یہ شعر "صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے" کا ضد ہے۔ دوسرا شعر "ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ جب تلک بس چل سکے ساغر چلے" اردو شعرا کے عام

انداز میں ہے۔

میں نے عرض کیا، کیا یہ ممکن نہیں کہ دوسرے شعر میں بھی شاعر سعیٔ پیہم کا درس دے رہا ہے
فرمایا، ممکن ہے لیکن قرین قیاس معلوم نہیں ہوتا۔

قدرے توقف کے بعد میں نے فانی کے یہ اشعار سنائے :

دل وقفِ تپش ہے ہائے مگر وجہِ تپشِ دل کوئی نہیں۔ بسمل ہوں مگر کیوں بسمل ہوں فریاد کہ قاتل کوئی نہیں
خود حُسن کمالِ حُسن ہی یعنی حسنِ جہاں سے کامل ہے۔ اور عشق مآلِ عشق ہی یعنی عشق میں کامل کوئی نہیں
دریائے محبت بے ساحل اور ساحل بے دریا بھی ہے۔ جو موج ڈبو دے ساحل ہی یوں نام کو ساحل کوئی نہیں

اور حفیظ کا یہ گیت :

بنسری کی لے نہیں یہ آگ ہے اور کوئی شے نہیں یہ آگ ہے

فرمایا، مجھے حفیظ کا یہ رنگ پسند نہیں لیکن "شاہنامۂ اسلام"، کا رنگ اور انداز مجھے پسند ہے۔
اور اس میں بہتر قسم کی شاعری ہے۔ پھر فرمایا، تمھیں مرزا محمد ہادی کا وہ شعر یاد ہے کہ نہیں،
وہ ——— ماتھے پہ بل پڑ گئے۔ یاد کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے کہا مجھے یاد ہے
اور شعر پڑھا :

اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز تھا حُسن بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

میں نے عرض کیا، اِس شعر کی آپ پہلے بھی تعریف فرما چکے ہیں۔ غالباً اِسی لیے آپ کی تعریف
کے حوالے سے اس شعر پر بہت لے دے بھی ہوتی رہی ہے۔ فرمایا، کس بنا پر؟ میں نے کہا،
اِس وقت خیال نہیں لیکن اتنا یاد ہے کہ مختلف رسالوں میں اس شعر کی خامیوں پر لمبے
لمبے مضمون چھپتے رہے ہیں۔ فرمایا، اپنا اپنا خیال ہے۔ مجھے یہ شعر پسند ہے۔ فنی لحاظ سے اچھا
ہے۔ خیال میں جدت ہے۔ پڑھنے والے کی آنکھوں کے سامنے تصویر کھنچ جاتی ہے۔
میں نے اکبر کا یہ شعر پڑھا :

اک مسئلہ ہے تیغ کا اور اک سکوت کا باقی جو ہر وہ تار ہے بس عنکبوت کا

فرمایا، خوب ہے، لیکن مجھے اکبر کا یہ شعر زیادہ پسند ہے :

نادیدنی کی دید سے ہوتا ہے خون دل بے دست و پا کو دیدۂ بینا نہ چاہیے

افسوس ہے کہ یہاں پہنچ کر فیضان کا یہ سلسلہ منقطع ہو گیا اور چند آدمی آگئے جو شکل و
صورت سے اہلِ مقدمہ معلوم ہوتے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے اجازت چاہی اور
سلام کر کے رخصت ہوا۔ دروازے تک پہنچا تھا کہ علامہ نے فرمایا، وہ کلیم کا کیا شعر
سُنایا تھا تم نے؟ میں نے مڑ کر کھڑے کھڑے عرض کیا :

کدام خرمن گُل را کشید در آغوش
کز آبِ آئینہ بوئے گلاب می آید

فرمایا، تو ہم بھی تمھیں کسی استاد کا ایک شعر سُناتے ہیں جو اِسی مضمون کا ہے اور شاید کلیمؔ کے شِعر سے بہتر ہے۔ اور آپ نے شِعر پڑھا

زتیرہ بختیِ آئینہ حیرتے دارم!
ترا کشید در آغوش و آفتاب نہ شد

میں نے شکریہ ادا کیا اور رخصت ہوا۔ گھر کے راستے میں اور گھر پہنچنے کے بہت دیر بعد تک یہی شِعر پڑھتا رہا:

زتیرہ بختیِ آئینہ حیرتے دارم
ترا کشید در آغوش و آفتاب نہ شد

شامِ ہمدرد۔ لاہور
۲ر جولائی ۱۹۶۴ شمسی

مولانا امین احسن اِصلاحی

۱۹۰۴ شمسی

حضرت مولانا امین احسن اصلاحی، پاکستان کے ممتاز اور متدین علما اور اصحابِ قلم میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ قرآنِ حکیم کی تفسیر و تفہیم آپ کا خاص موضوع ہے اور اس سلسلے میں آپ کے افکار و نتائجِ تحقیق کو دینی اور علمی حلقوں میں بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔

مولانا نے محترم اعظم گڑھ (یو۔ پی) میں ۱۹۰۴ش میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ سرائے میر (اعظم گڑھ) میں مولانا شبلی نعمانی اور مولانا حمید الدین فراہی نے مدرسۃ الاصلاح کے نام سے اعلا دینی درس گاہ قائم کی تھی۔ مولانا اصلاحی ۱۹۲۲ شمسی میں مدرسۃ الاصلاح سے فارغ التحصیل ہوئے۔ اِس کے بعد دو سال تک بجنور کے مشہور اخبار "مدینہ" میں تحریری کام کرتے رہے۔ پھر مولانا عبد الماجد دریا بادی کے عظیم ہفت نامے "سچ" (جو بعد میں "صدق" ہوا اور اب "صدق جدید" کے نام سے روایتی شان کے ساتھ شائع ہو رہا ہے) میں مدیر معاون کی حیثیت سے شریکِ ادارت رہے۔ ۱۹۲۵ش میں مدرسۃ الاصلاح کے اساتذہ نے جو مولانا کی قابلیت کے معترف تھے، اِسی مدرسے میں بحیثیت اُستاد مامور کرا دیا۔ یہاں مولانا کو اپنے فاضل استاد حضرت مولانا حمیدُ الدّین فراہی کے ساتھ قرآنِ پاک کی تفسیر پر تحقیقی کام کرنے کا نادر موقع ملا، جس کے نتیجے میں مولانا اصلاحی کو افہام و تفہیم میں وہ بصیرت حاصِل ہوئی جو اَب آپ کا خاص حصّہ ہے۔

حدیث کی تکمیل مولانا نے مشہور محدّث مولانا عبد الرّحمٰن مبارک پوری سے فرمائی۔

۱۹۴۱ش میں اقامتِ دین کے لیے جماعتِ اسلامی وجود میں آئی تو مولانا نے اس کی دعوت پر لبیک کہا اور پوری تن دہی سے اس تحریک کو آگے بڑھانے میں مصروف ہو گئے۔ جماعتِ اسلامی



مولانا امین احسن اصلاحی

[شام ہمدرد لاہور ، ستمبر ١٩٦٤ شمسی]

میں امیرِ جماعت کے بعد آپ ہی کا مقام تھا۔ ۱۹۵۶ء میں جماعت کے نظریۂ سیاست سے اختلاف کی بنا پر مولانا نے علیحدگی اختیار کرلی اور اپنے طور پر خدمتِ دین اور اشاعتِ علمِ دین میں مصروف ہیں۔ "میثاق" کے نام سے ایک معیاری دینی ماہ نامہ شائع فرماتے ہیں۔ تصنیف و تالیف سے مولانا کو ہمیشہ شغف رہا۔ مولانا کی چند اہم تصانیف کے نام یہ ہیں :۔

۱۔ تدبرِ قرآن

۲۔ حقیقتِ توحید

۳۔ حقیقتِ تقویٰ

۴۔ تزکیۂ نفس

۵۔ دعوتِ دین اور اس کا طریق کار

۶۔ اسلامی ریاست کے اصول و مبادی

۷۔ پاکستانی عورت دوراہے پر

مستقل تصانیف کے علاوہ آپ نے بے شمار علمی، تحقیقی اور اصلاحی مضامین لکھے، جن سے ملک کے دینی حلقوں نے بے حد استفادہ کیا۔ مولانا امین احسن اصلاحی ایک بلند پایہ مصنّف ہونے کے ساتھ ساتھ اعلا درجے کے مقرر اور خطیب بھی ہیں اور اپنی حق گوئی، اصول پسندی، دینی درد مندی اور بے لوثی کی خصوصیات کی بنا پر پورے ملک میں عزت و احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں۔

محمد سعید

پاکستان میں دینی تعلیم کا حال و مستقبل اور ہماری ذمہ داری

حضرت مولانا امین احسن اصلاحی

حضرات!
میں جناب حکیم صاحب محترم کا صدق دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے اس ناچیز کے لیے آپ کے سامنے اظہارِ خیال کا ایک موقع فراہم کیا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر میں ایک ایسے مسئلے کی طرف آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں جو میرے لیے ایک دردِ دل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر اس درد کی کوئی کسک میں آپ کے دلوں میں بھی پیدا کر سکا تو سمجھوں گا کہ میرا یہاں آنا فائدے سے خالی نہیں رہا۔ اگرچہ ایک طبیبِ حاذق کی ترتیب دی ہوئی اس مجلس میں میری طرف سے درد کا تحفہ تقسیم کیا جانا بظاہر ایک ناموزوں سی بات ہے۔ اطبا کے پاس لوگ دوا کے لیے آیا کرتے ہیں نہ کہ درد کے لیے، لیکن آپ اطمینان رکھیں میں جو درد تقسیم کرنا چاہتا ہوں وہ سر کا درد نہیں بلکہ دل کا درد ہے۔ دل کے متعلق تو شاید آپ بھی یہ تسلیم کرتے ہوں گے کہ اس کی صحت و زندگی تمام تر اس کی درد مندی ہی میں منحصر ہے۔ اگر دل میں درد نہ ہو تو پھر دل، دل نہیں ہے، بلکہ پتھر کا ایک ٹکڑا ہے، جو سینے میں چھپا کر رکھنے کی چیز نہیں، بلکہ زمین پر پھینک دینے کی چیز ہے۔

حضرات! آپ جیسے ہوشمند لوگوں سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں ہو سکتی کہ ہم مسلمان نسل و نسب، رنگ و خون، ملک و وطن، دریا اور پہاڑ کی حد بندیوں کی پیدا کی ہوئی کوئی قوم نہیں ہیں، ہم اس طرح وجود میں نہیں آگئے ہیں جس طرح کیکر کی جڑ سے دوسرا کیکر اور آم کی گٹھلی سے

دوسرا آم پیدا ہو جایا کرتا ہے، بلکہ ہم ایک مخصوص نظریۂ حیات، ایک مخصوص نظامِ عقائد و اعمال اور ایک مخصوص طرزِ زندگی سے ترکیب پائی ہوئی ایک ملت ہیں، جس کا نام اسلام ہے۔ یہی اسلام ہے جو ہمیں دوسروں سے الگ کرتا اور آپس میں ایک دوسرے سے جوڑتا ہے، یہی خلق اور خالق کے ساتھ ہمارے حقوق و فرائض کی حدبندی کرتا ہے۔ یہی ہماری دُنیا اور عقبیٰ دونوں کی کامیابیوں کا ضامن ہے اور ہمارے رب کی طرف سے اسی پر جینے اور اسی پر مرنے کا ہم سے مطالبہ ہے۔

حضرات! قاعدہ ہے کہ جو چیز جن عناصر سے ترکیب پاتی ہے انھی عناصر پر اس کی صحت و زندگی کا انحصار ہوتا ہے۔ اگر وہ عناصر مناسب مقدار میں موجود رہیں تو وہ چیز صحیح حالت میں رہتی ہے، اگر وہ کم ہو جائیں تو وہ چیز کمزور ہو جاتی ہے اور اگر وہ مفقود ہو جائیں تو وہ چیز بھی ختم ہو جاتی ہے۔ اس حقیقت کو آپ خود اپنے جسم کی مثال سے نہایت بہتر طریقے پر سمجھ سکتے ہیں۔ آپ کا جسم جن اجزا سے مرکب ہے انھی اجزا کی متناسب موجودگی سے وہ توانا اور صحت مند رہتا ہے، اگر وہ اجزا تحلیل ہو جائیں اور آپ اس کے لیے مناسب غذا اور پرہیز سے بدل ما یتحلل نہ فراہم کرتے رہیں تو آپ کمزور یا مریض ہو جاتے ہیں اور آپ کو کسی حاذق حکیم کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے جو تشخیص کر کے یہ اندازہ لگاتا ہے کہ آپ نے اپنی بے احتیاطیوں سے اپنے جسم کے کن اجزائے ترکیبی کو نقصان پہنچایا ہے اور پھر اس سے آپ کے نظامِ جسمانی میں کیا کیا خلل واقع ہوئے ہیں اور اب ان کی اصلاح یا تلافی کے لیے کیا کیا احتیاطیں اور کیا کیا غذائیں اور دوائیں ضروری ہیں۔

مَیں کوئی طبیب نہیں ہوں، لیکن اِتنی بات تو ایک عامی بھی جانتا ہے کہ غذا ہو یا دوا اس سے اصل مقصود انھی عناصر کو مدد پہنچانا ہوتا ہے جن سے ہمارے جسم کی تعمیر ہوئی ہے۔ اگر کبھی ہم محض اپنے اندر ایک جوش و نشاط پیدا کرنے کے لیے کوئی ایسی چیز استعمال کر بیٹھتے ہیں، جو ہمارے اصل تعمیری اجزا سے موافقت نہیں رکھتی تو اس سے ایک وقتی جوش و ہیجان تو ضرور پیدا ہو جاتا ہے جسے ہم غلط فہمی سے علامتِ صحت خیال کر لیتے ہیں لیکن بالآخر اس کا ردِّ عمل نہایت بُرا ہوتا ہے جس سے بسا اوقات ہم اپنا مزاجی توازن کھو بیٹھتے ہیں۔

ٹھیک اپنے جسم ہی پر آپ اپنے جسدِ ملّی کو قیاس کیجیے۔ ہمارے جسدِ ملّی کے ضعف و قوت اور مرض و صحت کا انحصار بھی انھی اجزا کی کمی بیشی اور عدم و وجود پر ہے جن سے اس کی تشکیل ہوئی ہے۔ میں اوپر اشارہ کر چکا ہوں کہ اس کی تشکیل نسل، نسب، خون و رنگ اور وطن کے روابط یا محض زبان اور تہذیب کے اشتراک سے نہیں ہوئی ہے، بلکہ جس چیز نے اس کو ریڑھ

کی ہڈی بختی ہے وہ قرآن ہے۔ جس چیز نے اس کو ایک حسین وجمیل پیکر دیا ہے وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت ہے، جس چیز نے اس کو بنیان مرصوص بنایا ہے وہ کلمہ لا الٰہ الا اللہ کا رابطہ ہے اور جس چیز نے اس کے اندر زندگی، جرأت اور فدویت وقربانی کا خون دوڑایا ہے، وہ محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان اور ان کی محبّت ہے۔

اگر آپ مانتے ہیں کہ فی الواقع ملتِ اسلامیہ کی تعمیر وتشکیل انھی چیزوں سے ہوئی ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ کوئی شخص اس واضح حقیقت سے انکار کی جرأت کیسے کرسکتا ہے تو مجھے یہ سوال کرنے کی اجازت دیجیے کہ کیا ہم مسلمان ان چیزوں سے بے نیاز ہوکر دُنیا میں قائم رہ سکتے ہیں؟ میرا خیال ہے کہ آپ میں سے ہر شخص اس سوال کا جواب نفی ہی میں دے گا۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ میرا یہ سوال ملتِ اسلامیہ کے متعلق بحیثیت ملتِ اسلامیہ ہے یعنی جس حیثیت میں وہ خیر امت قرار دی گئی ہے اور اس کو شہداللہ فی الارض کے منصب پر سرفراز کیا گیا ہے۔ اپنی اس مخصوص حیثیت میں قائم رہنے اور اسی حیثیت سے اس کے ترقی کرنے کی واحد شکل اگر ہوسکتی ہے تو یہی ہوسکتی ہے کہ جن اجزائے فکری و اعتقادی اور جن عناصرِ ایمانی و اخلاقی سے وہ وجود پذیر ہوئی ہے ان کا شعور و اعتقاد اس کے تمام افراد میں اگر نہیں تو کم از کم بیشتر میں زندہ و متحرک رہے۔ اگر یہ زندہ و متحرک نہ رہے تو سمجھیے کہ ملت مُردہ ہے، اگرچہ اس کے قبضے میں دُنیا جہان کے تمام اسباب و وسائل موجود ہوں۔ اگر آپ اس کے اندر زندگی کی حرکت پیدا کرنے کے لیے کوئی ایسا محرک لا گھسائیں گے جو خود اس کے اپنے مزاج سے بے گانہ ہوگا تو اس سے اس کے اندر وقتی طور پر ایک حرکت تو شاید پیدا ہوجائے گی لیکن یہ حرکت اس کی اپنی فطری حرکت سے بالکل مختلف ہوگی۔ اس کی مثال بالکل ویسی ہی ہوگی جس کا ذکر کچھ عرصے پہلے اخباروں میں آیا تھا کہ کچھ بوڑھوں پر اعادۂ شباب کا تجربہ کرنے کے لیے ان کے اندر بندروں کے غدود منتقل کیے گئے تو اس سے ان کے اندر جو حرکت پیدا ہوئی وہ انسانوں کے مقابل میں بندروں کی حرکات سے زیادہ مشابہ تھی۔

میرا مطلب یہ ہے کہ اگر صرف الٹی سیدھی کوئی حرکت ہی مطلوب ہو تب تو یہ کسی بھی ہنگامی نعرے سے پیدا کی جاسکتی ہے اور آج ہمارے مسلمان ممالک میں لیڈر حضرات اس قسم کے نعروں کا تجربہ بھی کر رہے ہیں لیکن پیشِ نظر اگر صرف کوئی حرکت نہیں بلکہ صحیح قسم کی حرکت اس نصب العین کی راہ میں مطلوب ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے امتِ مسلمہ کی بعثت فرمائی ہے تو مجھے بتایئے کہ اس کی تدبیر سوا اور کیا ہوسکتی ہے کہ ان افکار و عقائد اور ان اصول و مقاصد کا صحیح شعور و احساس قوم میں پیدا کیا جائے جن کے شعور و احساس ہی نے اس کو

وجود بخشتا تھا۔

حضرات! یہ شعور و احساس نہ تو کوئی منقولہ یا غیر منقولہ جائداد ہے جو آپ سے آپ باپوں سے بیٹوں کو منتقل ہوتی رہے اور نہ یہ کوئی سادہ سا منتر ہے جو جب آپ چاہیں لوگوں کے کانوں اور دلوں کے اندر پھونک دیں بلکہ اس کے پیدا کرنے کے لیے تعلیم و تربیت کے ایک ایسے سلسلے کی ضرورت ہے جو ہماری پوری زندگی پر حاوی ہو۔ جب تک ہم یہ نہ جانیں کہ قرآن کیا ہے اور اس نے ہمیں کیا رہنمائی دی ہے؟ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کس مقصد سے ہوئی اور ہمارے تعلق کی نوعیت ان کے ساتھ کیا ہے؟ ہمارا قانون کیا ہے اور وہ کن پہلوؤں سے دنیا کے تمام قوانین سے بالاتر ہے؟ ہمارا فلسفہ کیا ہے اور کن اعتبارات سے وہ دنیا کے تمام فلسفوں پر ترجیح رکھتا ہے؟ ہماری تاریخ کیا ہے اور کس طرح وہ دنیا کی تمام تاریخوں سے شان دار اور روشن ہے؟ ہمارا نظامِ زندگی کیا ہے اور کن پہلوؤں سے اس کو دنیا کے تمام نظاموں پر فوقیت حاصل ہے؟ اس وقت تک ہم کیا جان سکتے ہیں کہ ہم خود کیا ہیں، دنیا میں کیوں آئے ہیں اور ہمیں کس مقصد کے لیے جینا اور کس عشق میں مرنا ہے؟

یہ کام نہایت وسیع اور عمیق کام ہے جو اس کے بغیر ممکن نہیں کہ ہمارا نظامِ تعلیم و تربیت اس کی ذمے داری اٹھائے، لیکن یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ایک مدت سے ہمارے ہاں جو نظام ہائے تعلیم و تربیت رائج ہیں وہ دوسرے پہلوؤں سے اپنے اندر جو افادیت بھی رکھتے ہوں، لیکن مذکورہ بالا مقصد کے لحاظ سے ان کی افادیت بمنزلہ صفر ہے بلکہ اگر میں یہ کہوں تو شاید بے جا نہ ہو گا کہ اس مقصد کے لیے وہ مفید ہونے کے بجائے اُلٹے مضر ہیں۔ میری یہ رائے ملک میں رائج دونوں ہی نظاموں سے متعلق ہے۔ اس نظام سے متعلق بھی جو قدیم کہلاتا ہے اور اس نظام سے متعلق بھی جو جدید کے نام سے موسوم ہے اور جس کو اب ملک کے اصلی نظامِ تعلیم و تربیت کی حیثیت حاصل ہے۔ میں مختصراً ان دونوں کی نوعیت آپ کے سامنے واضح کرنا چاہتا ہوں تاکہ آپ اندازہ کر سکیں کہ ملی و اسلامی نقطۂ نظر سے ان کی حیثیت کیا ہے۔ میں پہلے جدید نظامِ تعلیم کو لیتا ہوں۔

جدید نظامِ تعلیم کے متعلق آپ یہ جانتے ہیں کہ اس کا تحفہ ہمیں انگریزوں سے ملا ہے۔ اس کو جب انھوں نے ہمارے ملک میں رائج کیا ہے تو ان کے پیشِ نظر نہ تو یہ بات تھی اور نہ ہو سکتی تھی کہ اس سے ہمارے اندر خود شناسی پیدا ہو۔ یعنی ہم اپنے آپ کو پہچانیں کہ ہم کیا ہیں، بلکہ واضح طور پر اس سے ان کا مقصود ہمارے اندر انگریز شناسی یا انگریزی شناسی پیدا کرنا تھا تاکہ ان کو اپنے کاموں کے لیے سستے اور وفادار خادم مل سکیں۔

اس مقصد کے لیے ظاہر ہے کہ ہماری مذہبی تعلیم کی ان کو مطلق ضرورت نہ تھی۔ سیاسی اعتبار سے بھی وہ ہماری مذہبی تعلیم کو ایک خطرناک چیز سمجھنے پر مجبور تھے اس لیے کہ وہ دیکھ چکے تھے کہ مسلمانوں کے اس دورِ زوال میں بھی اس تعلیم سے سیّد احمد شہیدؒ اور اسمٰعیل شہیدؒ پیدا ہو سکتے ہیں محض وقتی ضروریات اور مسلمانوں کی ذرا دل داری کے خیال سے انھوں نے اس کا کوئی حصّہ اپنے نظامِ تعلیم میں سمونے کی کوشش بھی کی تو اوّل تو اس کی حیثیت اکبر مرحوم کے الفاظ میں بادۂ گلگوں میں زم زم کے چند قطروں سے زیادہ نہ تھی، پھر ان قطروں کو بھی انھوں نے تحلیلِ کیمیائی کے ذریعے سے اچھی طرح صاف کر لیا تھا کہ ان میں کوئی ایمانی جرثومہ باقی نہ رہ جائے۔

اس نظامِ تعلیم نے ہماری قوم کے کھاتے پیتے گھرانوں کو اپنی طرف متوجّہ کر لیا اور اس کے جو بُرے اثرات ان پر پڑنے تھے وہ بھی پڑے لیکن پھر بھی یہ خیریت تھی کہ غربا کے لیے اس تعلیم کے دروازے پوری طرح کشادہ نہ تھے اس وجہ سے وہ اس کی طرف زیادہ متوجّہ نہ ہو سکے۔ ان میں سے جس کو تعلیم کا شوق ہوا وہ اس مذہبی تعلیم کی طرف متوجّہ ہوا جس کے مرکز مسجدیں، دینی مدرسے اور مختلف علما کے حلقہ ہائے درس تھے۔ علاوہ ازیں چوں کہ انگریز، انگریزی تعلیم اور انگریزی تہذیب و تمدّن سے ہمارے شرفا کے بھی ایک طبقے میں خطرے کا احساس موجود تھا اس وجہ سے انگریزی تعلیم کی ساری کششوں کے باوجود یہ طبقہ مذہب اور مذہبی روایات سے وابستہ رہا اور اس طرح کچھ نہ کچھ مذہبی تعلیم کا بھی بھرم قائم رہا۔

انگریزوں کی غلامی سے رہائی کے بعد ہونا تو یہ تھا کہ سب سے پہلے ہمارے نظامِ تعلیم میں ایسی تبدیلی ہوتی کہ یہ ہمارے ملّی اور اسلامی تقاضوں کو پورا کرنے والا بن سکتا، ہم دوسروں کو پہچاننے کے ساتھ ساتھ اس کے ذریعے سے خود اپنے کو بھی پہچان سکتے اور جدید کے استفادے کے ساتھ ساتھ اپنے قدیم سے بھی روشنی اور رہنمائی حاصل کر سکتے لیکن افسوس ہے کہ ایسا نہیں ہوا بلکہ ہم پوری وفاداری کے ساتھ اسی نظامِ تعلیم کو اپنائے ہوئے ہیں جو انگریزوں سے ہمیں ورثے میں ملا ہے۔

اس میں اگر کوئی تبدیلی ہوئی بھی ہے تو دینی اور اسلامی نقطۂ نظر سے اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے اور جہاں تک اِس نظامِ تعلیم کی کشش کا تعلق ہے وہ تو انگریزوں کے دَور کے لحاظ سے اب ہزار گنی بڑھ گئی ہے۔ انگریزوں کے زمانے میں اس سے ایک طبقے میں جو بے گانگی تھی وہ نہ صرف دور ہو گئی ہے بلکہ وہ عقیدت و محبت سے بدل گئی ہے، انگریزوں کی اِسلام دشمنی کے سبب سے دین اور دینی تعلیم کے لیے ہمارے دلوں میں حمیت و حمایت کا جو جذبہ تھا وہ اب سرد پڑ چکا ہے۔

ہر درجے کی ملازمت اور ہر میدان میں مسابقت کی راہ اس تعلیم نے اب ہر طبقے کے لیے کھول دی ہے، اس وجہ سے ہر شخص کا قبلہ و کعبہ اب یہی ہے۔ اب غربا کے لیے بھی اس کے دروازے کشادہ ہیں۔ اس وجہ سے اب ان کے بچّے بھی مسجدوں اور عربی مدرسوں کے بجائے اسکولوں اور کالجوں ہی کے رُخ کرتے ہیں۔ بس کوئی ایسا ہی مظلوم و مسکین ہوتا ہے، جس کا کوئی پُرسانِ حال نہیں ہوتا تو وہ عربی مدرسوں کی طرف نکل پڑتا ہے کہ ع

اس در پہ نہیں بار تو کعبے ہی کو ہو آئے

دینی تعلیم کے جو ادارے ہمارے ملک میں قائم ہیں اس اعتبار سے تو وہ تمام دینی حس رکھنے والے مسلمانوں کے شکریے کے مستحق ہیں کہ آج ہمارے ملک میں جتنا کچھ بھی قال اللہ و قال الرسول کا چرچا ہے۔ بہر حال انھی کا فیض ہے۔ یہ اگر نہ ہوتے تو انگریزی اقتدار کے بعد ہمارے ملک میں جو انقلاب آیا تھا وہ شاید ہمیں اتنا بدل دیتا کہ ہمارے اندر نکاح پڑھنے اور جنازے کی نماز پڑھنے والے بھی مشکل ہی سے مل سکتے لیکن ان کے اس احسان کے اعتراف کے ساتھ اس امر واقعی کا اظہار بھی ضروری ہے کہ یہ مدارس ایک مدتِ دراز سے ایک ایسے جمود میں مبتلا ہیں کہ ان سے اس سے زیادہ خدمت کی توقع نہیں کی جا سکتی جو انھوں نے انجام دی۔

اوّل تو یہ مدارس جس نصابِ تعلیم اور جس طریقۂ تعلیم کو اپنائے ہوئے ہیں وہ وقت کی ضروریات اور زمانے کے حالات سے اتنا بے گانہ ہے کہ اب اس کے اندر نہ تو کوئی افادیت باقی رہی ہے نہ کوئی کشش۔ یہ نصاب جس زمانے میں اختیار کیا گیا تھا اس زمانے کے حالات کے لحاظ سے موزوں اور دین و دنیا دونوں کا جامع تھا۔ ضرورت تھی کہ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے لحاظ سے قرآن، حدیث، فقہ کے سوا نصاب کے دوسرے اجزا بدل جاتے لیکن ہمارے دینی مدارس کے کارفرماؤں نے کئی سو سال پہلے کے نصاب کو بھی تقدیس کا یہ درجہ دے رکھا ہے کہ اس میں کسی ترمیم کو گناہ سمجھتے ہیں۔ طریقۂ تعلیم بھی ان مدارس کا اتنا جان لیوا ہے کہ نئی نسل اس کا کسی طرح تحمل نہیں کر سکتی۔ اس نصاب اور اس طریقۂ تعلیم کی اصلاح کے لیے جو کوششیں ہوئیں وہ ایک خاص دائرے سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ جمود ان کے سامنے روک بن کر کھڑا ہو گیا۔

ان مدارس کے گروہی رجحانات بھی ملی نقطۂ نظر سے مضر ثابت ہوئے۔ دینی مدارس بالعموم الگ الگ فقہی مسالک کی بنیادوں پر قائم ہوئے اور انھی پر اب تک قائم چلے آ رہے ہیں، حالاں کہ ہونا یہ تھا کہ یہ مدارس کتاب و سنّت کی بنیادوں پر قائم ہوتے اور پوری فقہ اسلامی کی خدمت کرتے اور اس کو آگے بڑھاتے تاکہ ان کے فارغین وسیع زاویۂ نگاہ کے حامل بن کر اٹھتے اور مخصوص اپنے فرقے کی ترجمانی کرنے کے بجائے پوری ملّتِ اسلامیہ کی خدمت کرتے اور تمام نوعِ انسانی پر اللہ

کے دین کی شہادت دیتے۔ اِس طرح ان کے اندر نہ صرف رواداری بلکہ تحقیق و اجتہاد کی وہ رُوح بھی پیدا ہوتی جس کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔

ان مدارس نے اپنا مطمحِ نظر بھی کچھ زیادہ بلند نہیں رکھا۔ عام طور پر مدرسی، امامت فتویٰ نویسی، وعظ گوئی، مناظرہ اور ایک محدود معنی میں تبلیغ تک ان کی نگاہ محدود رہی۔ ہر چند یہ کام بھی ضروری تھے لیکن اس کا اثر یہ ہوا کہ عام طور پر ہمارے دینی مدارس کے فارغین علمی و عملی زندگی کے دوسرے میدانوں میں نمایاں نہ ہوسکے۔ صرف وہی لوگ اس سے مستثنیٰ رہے جو غیر معمولی دل و دماغ کے مالک تھے اور جن کی رہنمائی ان مدرسوں سے زیادہ خود ان کے عزم و ہمّت نے کی۔

یہ جمود ان مدارس پر بہت پہلے سے طاری تھا اور اس کو بڑا دخل ہے۔ اس غلامی کو ہم پر مسلط کرنے میں جو مغربی اقوام بالخصوص انگریزوں کے ہاتھوں ہم پر مسلط ہوئی۔ لیکن انگریزوں کے حکمران ہوجانے کے بعد تو اس جمود پر مسکنت اور کس میرسی کا بھی اضافہ ہوگیا اس لیے کہ حکومت کے انقلاب کے بعد ان کی مادّی سرپرستی کا انحصار بیشتر غربا اور عام مسلمانوں کے صدقات و زکوٰۃ پر رہ گیا اور ان سے فائدہ اٹھانے والے بھی بیشتر اسی طبقے کے لوگ رہ گئے جن کو انگریزی تعلیم کی آسانیاں حاصل نہ تھیں۔ گویا انگریزوں کے بعد سے ہمارے ہاں دینی تعلیم اگر زندہ رہی ہے تو وہ زیادہ تر عوام اور غربا کے واسطے سے زندہ رہی ہے۔ حکومت اور امرا کے طبقے کا حصّہ اس میں محض برائے نام ہے۔

پاکستان کے قیام کے بعد اگر ہمارے اندر اپنے ملّی نصب العین کا احساس ہوتا تو دینی تعلیم ہی ہمارے سارے نظامِ تعلیم کی بنیاد بنتی اور اسی بنیاد پر ہم تمام علوم جدیدہ کی عمارت قائم کرتے لیکن ہوا یہ کہ یہاں جس نسبت سے جدید تعلیم کو فروغ ہوا اسی نسبت سے دینی تعلیم کو زوال ہوا۔ اوّل تو یہ علاقہ دینی تعلیم کے لحاظ سے تقسیم سے پہلے بھی کچھ زیادہ زرخیز نہ تھا۔ ہماری دینی تعلیم کے جو بڑے بڑے ادارے تھے وہ سارے کے سارے ان شہروں میں تھے، جو بھارت کے قبضے میں چلے گئے، مشہور کتب خانے بھی انھی شہروں میں تھے۔ یہاں جو مدارس تھے یا قائم ہوئے اوّل تو وہ کچھ زیادہ باوقار نہ تھے اور اگر کچھ تھے بھی تو یہاں جدید تعلیم و تہذیب کی بہتی ہوئی گنگا کو چھوڑ کر کس کی شامت آئی ہوئی ہے کہ وہ عربی مدارس کی خشک گردانوں میں اپنی اوقات رائگاں کرے، چناں چہ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت جو دینی ادارے یہاں قائم ہیں، ان کے لیے سرمائے کی فراہمی سے زیادہ مشکل کام طلبہ کی فراہمی کا ہے۔ اگر روٹی، کپڑا، کتاب سب کچھ دے کر کچھ طلبہ کسی طرح حاصل بھی ہوتے ہیں تو ان میں شوقِ علم رکھنے والے شاید

پانچ فی صد بھی نہیں ہوتے۔ زیادہ تر وہ ہوتے ہیں جن کا مقصود محض اوقات گزاری ہوتا ہے۔

ہمارے ملک میں دینی مدارس کا یہ حال ہے اور یہی مدارس ہیں جن سے حاملین دین کے پیدا ہونے کی توقع کی جاسکتی تھی۔ رہے وہ علما جو پہلے سے موجود تھے یا تقسیم ملک کے بعد یہاں آئے ان میں سے جو صفِ اوّل کے تھے، ان میں سے اکثر اللہ کو پیارے ہوچکے ہیں جو چند باقی باقی ہیں وہ چراغِ سحری ہیں۔ نہیں کہا جاسکتا کہ کب ہم ان سے بھی محروم ہوجائیں۔ اس موقع پر میں آپ کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث یاد دلاتا ہوں جس میں آپؐ نے فرمایا ہے کہ لوگوں کے اندر سے علم دین کے اٹھالیے جانے کی شکل یہ نہ ہوگی کہ وہ لوگوں کے سینوں سے نکال لیا جائے بلکہ دین کے حامل علما اٹھالیے جائیں گے اور دین سے بے خبر جہلا باقی رہ جائیں گے اور وہ بلا علم فتویٰ دیں گے، خود گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو گمراہ کریں گے۔

حضرات! اگر آپ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ بحیثیت امّتِ مسلمہ اس دنیا میں قائم رہنے کے لیے ہم سب سے زیادہ دین اور دینی تعلیم کے حاجت مند ہیں تو میں آپ کو اس صورتِ حال پر سنجیدگی سے غور دیتا ہوں جس سے ہم اس وقت اپنے ملک میں دوچار ہیں۔ میں نے اختصار کے خیال سے صرف اپنے ہی ملک کا جائزہ لیا ہے۔ دوسرے مسلمان ملکوں میں دینی تعلیم پہلے ہی ختم ہوچکی تھی۔ اب تو اگر اس کی کچھ رمق باقی تھی تو پاک و ہند کے دینی مدارس اور ان کے علما میں باقی تھی، جہاں تک بھارت کا تعلق ہے وہاں مسلمانوں کا قومی وجود ہی خطرے میں ہے، دین اور دینی تعلیم کا کیا سوال۔ رہے آپ تو آپ کے حالات آپ کے سامنے ہیں۔ آپ اس ملک کے سب سے زیادہ تاریخی شہر کے معزز شہری ہیں۔ یہ شہر آپ کے تہذیب اور آپ کے علوم کا ایک اہم مرکز رہ چکا ہے، اس کی خاک میں بڑے بڑے علما و صوفیا دفن ہیں۔ میں نے آپ کے سامنے یہ سوال اس لیے رکھا ہے کہ آپ غور کریں کہ دینی تعلیم کے تحفظ کے لیے کیا کیا جاسکتا ہے اور آپ اس میں اپنا حصہ کس طرح ادا کرسکتے ہیں۔

سب سے زیادہ صحیح اور نتیجہ خیز چیز تو یہ تھی کہ اس ملک کا نظام تعلیم ہی از سرِ نو اسلام کی بنیاد پر اٹھایا جاتا کہ دین سارے نظام تعلیم و تربیت کی رُوح بن جاتا اور ہم ایک ہی نظام تعلیم ہی سے قدیم و جدید دونوں کی برکتیں حاصل کرتے لیکن یہ محض آرزو ہے اور مجھے یہ آرزو اتنی بعید معلوم ہوتی ہے کہ میں اس کے لیے کوشش اور جدوجہد کرتے رہنے کا مشورہ دینے کے باوجود یہ کہوں گا کہ اس آرزوئے خوش کے پیچھے دوسری چھوٹی بڑی تدبیروں سے ہمیں غافل نہیں رہنا چاہیے۔ نظامِ تعلیم کی تبدیلی کا کام نظامِ تعلیم کے کارفرماؤں کا ہے۔ ان حضرات کے

متعلق یہی کہنا مشکل ہے کہ یہ دینی تعلیم کی قرار واقعی اہمیت سمجھتے بھی ہیں یا نہیں۔ اب تک تو ان کی طرف سے جو کچھ سامنے آیا ہے۔ اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ دین کا دائرۂ عمل ان کے ہاں بھی مسجدوں سے آگے نہیں ہے اور اگر ہے تو اس میں شاید ان کا اعتماد اس ٹائپ کے لوگوں پر ہے جو دین کو مستشرقین کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، البتہ ہم اور آپ اگر اس کام کی اہمیت سمجھیں تو کچھ نہ کچھ اس کے تحفظ کے لیے کر سکتے ہیں۔ مثلاً

(۱) ایک چیز تو یہ ہے کہ ہمارے دینی مدارس اگر علمِ دین کے بقا کو عزیز رکھتے ہیں تو وہ بلا تاخیر اپنے نصابِ تعلیم کو بدل کر اس کو آسان، مختصر اور زمانۂ حال کی ضروریات کے مطابق بنائیں۔ عربی نحو و صرف اور عربی زبان کی تعلیم جدید طریقے پر دی جائے۔ قرآن، حدیث اور فقہ کے سوا دوسری غیر ضروری چیزیں نصاب سے نکال کر انگریزی زبان اور دوسرے بعض عمرانی علوم کی کتابیں داخل کی جائیں، تاکہ ان مدارس سے ایسے علما پیدا ہوں جو دین کے ساتھ زمانۂ حال کے تقاضوں کو بھی سمجھ سکیں اور اپنی قوم کی رہنمائی کر سکیں۔

(۲) عربی مدارس اپنے ہاں ایک مختصر مگر جامع نصاب کالجوں اور یونیورسٹیوں کے ان طلبہ کے لیے بھی رکھیں جو عربی زبان اور علمِ دین کے حصول کا شوق رکھتے ہیں اور ان کے اوقاتِ فرصت میں ان کو استفادہ کی سہولتیں بہم پہنچائیں۔ اس طرح جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کے اندر سے ایک اچھی تعداد ایسے نوجوانوں کی نکل آئے گی جو دین کی خدمت کر سکیں گے اور ہمارا اور آپ کا کام یہ ہے کہ کالجوں کے طلبہ کے اندر دین سیکھنے کی تحریک پیدا کر سکیں۔

(۳) ملک کے جید علما اپنے اپنے ہاں حلقہ ہائے درس قائم کریں جن میں اس امر کا اہتمام کریں کہ جدید تعلیم یافتہ لوگوں میں سے جن کے اندر دین کا شوق ہے وہ ان کے درس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ یہ درس محض تبرک کی نوعیت کے نہ ہوں بلکہ تعلیمی نوعیت کے ہوں تاکہ تعلیم دین کے نقطۂ نظر سے مفید ہو سکیں۔ میں ذاتی تجربے کی بنا پر یہ رائے رکھتا ہوں کہ اگر روزانہ صرف دو گھنٹے بھی اس کام پر صرف کیے جائیں تو تین سال کے عرصے میں یونی ورسٹیوں کے فارغین کی ایک جماعت کو عربی زبان اور پورے دین کی تعلیم دی جا سکتی ہے اور یہ لوگ ہر میدان میں دین کی خدمت کے لائق ہو سکتے ہیں اور یہ اللہ کا فضل ہے کہ ابھی ہماری قوم میں علمِ دین کے ایسے قدر دان موجود ہیں۔

(۴) بڑے شہروں میں اسلامی ہاسٹل قائم کیے جائیں جن میں کالجوں کے طلبہ کے لیے قیام اور اسلامی تعلیم و تربیت کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں اور ہر شہر کے شرفا ان ہاسٹلوں کی سرپرستی میں حصہ لیں۔

حضرات! یہ سارے کام اِس صورت میں ممکن ہیں جب ملک کے ہوش مند اور درد مند لوگ اس کام کی اہمیت سمجھیں، دوسروں کو اس کی اہمیت سمجھائیں اور جہاں کہیں کام کرنے کا امکان ہو اس کے لیے راہیں ہموار کریں اور جہاں کام ہو رہا ہو اس میں ہاتھ بٹائیں۔ یہ کام صرف علما ہی کا نہیں ہے بلکہ اس کی ذمّے داری ہر اس شخص پر عائد ہوتی ہے جس کو اس ملک میں اسلام کا مستقبل عزیز ہے۔ میری دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ ہم اس ملک میں خیرِ اُمّت اور شہداء اللہ فی الارض کی حیثیت سے سربلند ہوں اور ہماری سر بلندی اللہ کے دین کی سربلندی ہو۔

شامِ ہمدرد۔ لاہور
ستمبر ۱۹۶۴ شمسی

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید

۱۲/ اگست ۱۹۱۹ء

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید صاحب ۱۲/ اگست ۱۹۱۹ء کو بٹالہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد گرامی مشہور صحافی اور نامور ادیب و مزاح نگار مولانا عبدالمجید سالک تھے۔ آپ کو اپنے نامور باپ کے سایۂ عاطفت میں پرورش اور تربیت پانے کے مواقع حاصل ہوئے۔ مولانا مرحوم کا قیام لاہور میں تھا، اس لیے ڈاکٹر خورشید بھی لاہور ہی میں رہے اور یہیں کی علمی ادبی فضا میں ان کا ذہنی نشوونما ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے ۱۹۳۹ء میں بی اے اور ۱۹۴۱ء میں پنجاب یونی ورسٹی کے صحافت کے امتحان میں دوسری پوزیشن حاصل کی۔ تاریخ میں ایم۔ اے کیا اور یونی ورسٹی میں اول پوزیشن حاصل کی۔ ۱۹۵۶ء میں یونی ورسٹی آف ایمسٹرڈم سے صحافت میں پی۔ ایچ۔ ڈی کیا۔ ڈاکٹر صاحب اب تک برصغیر پاک وہند میں صحافت کے تنہا پی۔ ایچ۔ ڈی ہیں۔ ۱۹۵۸ء میں یونی ورسٹی آف سٹراس بورگ سے منسلک ہوئے اور یونیسکو کے قائم کردہ بین الاقوامی صحافتی مرکز سے تدریس صحافت کی سند حاصل کی اور سترہ ملکوں کے طلبا میں اوّل رہے۔ اسی سال اسی مرکز سے سندِ اعلاکے نام سے ایک ریسرچ ڈگری حاصل کی۔ اس میں ممتحنوں کا بورڈ بین الاقوامی تھا۔

ابتدا سے صحافتی ماحول کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب بہت کم عمری میں لکھنے لگے اور بچوں کے رسالوں سے اپنی مضمون نگاری کی ابتدا کی۔ بی۔ اے کرنے کے بعد نیوز ایجنسیوں، ریڈیو اور اخبارات میں نامہ نگاری اور رپورٹنگ کا تجربہ اور تربیت حاصل کی۔ کئی ہفت روزوں اور ماہ ناموں کی ادارت کی اور اپنے والد گرامی کے مشہور روزنامہ "انقلاب" میں نیوز ایڈیٹر کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ ۱۹۵۱ء میں پنجاب یونی ورسٹی کے شعبۂ صحافت سے منسلک ہوئے، جہاں اب بھی آپ مصروفِ درس وتدریس ہیں۔

ڈاکٹر صاحب اردو اور انگریزی میں صحافت کی تاریخ اور حال پر کئی کتابچے اور کتابیں مرتب کر چکے ہیں، جن میں سے "پریس اِن مسلم ورلڈ" "نیوز لیٹر اِن دی اورینٹ" اور "صحافتِ



ڈاکٹر عبدالسلام خورشید

[شام ہمدرد لاہور ، اکتوبر ۱۹٦٤ شمسی]

پاکستان و ہند میں" پر ڈاکٹر صاحب داؤد ادبی انعام بھی حاصل کر چکے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب پاکستان سے باہر صحافتی مسائل پر منعقد ہونے والی کانفرنسوں میں بھی شرکت فرما چکے ہیں۔ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بی۔ اے کرنے کے بعد ہی شروع کر دینے کی وجہ سے مختلف موضوعات پر ان کی تصانیف کی تعداد پچاس تک پہنچ چکی ہے۔ ان کے علاوہ آپ تیرہ چودہ درسی کتابیں بھی لکھ چکے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب آج کل نیشنل پریس ٹرسٹ کے مشیر اعزازی کی حیثیت سے پاکستان میں اخباری صنعت کا ایک تحقیقی جائزہ مرتب کر رہے ہیں۔ مغربی پاکستان کے اکثر شہروں کا دورہ ختم کر کے اب لاہور میں اس کی تکمیل فرما رہے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے آج کے مقالے کا موضوع "صحافت اور معاشرہ" ہے، جو بڑا دلچسپ موضوع ہے۔ صحافت اور معاشرہ کی اثر پذیری باہمی ہے۔ صحافت کی اٹھان معاشرے کے خمیر سے ہوتی ہے اور معاشرہ صحافت کے اثر سے بنتا بگڑتا ہے۔ آج کی ترقی پذیر دُنیا کی ترقی پذیر صحافت کے اثرات کی وسعت کا اندازہ کرنا آسان نہیں ہے۔ معاشرے کے مختلف حصے اور مختلف طبقے صحافت سے شعوری اور غیر شعوری اور بلاواسطہ اور بالواسطہ متاثر ہوتے ہیں۔ اِسی طرح صحافت جس معاشرے کی ترجمان ہوتی ہے، وہ اس کی تاریخ، روایات، رجحانات، میلانات، عزائم اور مقاصد سے ہم آہنگ ہوتے ہوئے متاثر ہوتی ہے۔ اخبارات کا کام جہاں معاشرے کی ترجمانی کرنا ہے، وہیں اس کی اصلاح بھی اس کے فرائض میں شامل ہے۔ کسی قوم کی صحافت اس کی تاریخ، اس کے حال اور مستقبل کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ صحافت ہی رائے عامہ کو شعور بخش کر اجتماعی فکر کی تربیت کرتی ہے۔

محمد سعید

صحافت
اور
مُعاشرہ

جناب ڈاکٹر عبدالسّلام خورشید صاحب

برّعظیم پاک وہند میں اخبار نویسی نے شاہی وقائع نگاری سے جنم لیا۔ سلاطینِ دہلی اور مغل حکمرانوں نے سلطنت میں بسنے والے لوگوں کے حالات، جذبات اور خیالات جاننے کے لیے بے شمار اخبار نویس اور وقائع نگار مقرر کر رکھے تھے۔ یہ لوگ جو خبرنامے مرتّب کرتے انھیں "اخبار" کہا جاتا تھا۔ یہ اخبار اصلاً حکمرانوں کی معلومات بڑھانے کے لیے ہوتے تھے، لیکن چیدہ چیدہ خبریں دربارِ معلّیٰ میں بھی سُنائی جاتی تھیں اور بہت بڑی فتوحات کی خبریں ہرکاروں، اعلانچیوں اور ڈھنڈورچیوں کے ذریعے سے نگر نگر اور گاؤں گاؤں کے باسیوں تک پہنچائی جاتی تھیں۔

جب اجنبی راج کے سائے پھیلنے لگے تو مطبوعہ صحافت ابھری۔ گویا صحافت ایوانِ شاہی کی اونچی اونچی دیواروں کو پھلانگ کر منظرِ عام پر آگئی۔ لیکن بہت کم لوگ تھے جنھوں نے اس کی قدر و قیمت پہچانی۔ پہلے فارسی اخبار کی اشاعت صرف چھبیس پرچے تھی اور ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے ایک سال پہلے برّعظیم کے سب سے کثیر الاشاعت اردو اخبار "کوہِ نور" کی اشاعت ۳۵۳ تھی اور یہ بھی اس لیے کہ دو سو پرچے حکومت خریدتی تھی، ورنہ عام طور پر کامیاب اردو اور فارسی اخباروں کی اشاعت ڈیڑھ سو سے کبھی بڑھنے نہ پائی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ لوگ اخبار کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے۔ دوسرے اخبار کی قیمت آٹھ آنے یا بارہ آنے فی پرچہ ہوتی تھی اور زمانہ ایسا تھا کہ دو ڈھائی رُپے میں ایک غریب آدمی

پورا مہینہ گزار دیتا تھا۔ اخبار تعیش کا سامان تھا اس لیے اسے پڑھنے کا شرف صرف رؤسا کو حاصل تھا اور سچ پوچھیے تو انھیں اخبار پڑھنے کا شوق اتنا نہیں تھا جتنا خریدنے کا شوق تھا۔

پھر صحافت نے ایک اور قدم بڑھایا۔ وہ رؤسا کی حویلیوں سے نکلی اور درمیانہ طبقے کے ان افراد میں آبسی جو چھنے ہوئے اقتدار کا ماتم کرنے کی جگہ ایک نئی دنیا کی تعمیر کا خواب لے رہے تھے۔ ان افراد کے رہنما سرسید احمد خاں تھے، جنھوں نے "تہذیب الاخلاق" اور "اخبار سائنٹی فک سوسائٹی" کے ذریعے سے تہذیب، شائستگی، تعلیم اور اصلاح معاشرہ کی مہم چلائی۔ اگرچہ اس تحریک سے نہ رؤسا کے غالب گروہ کو دل چسپی تھی نہ عوام کو اور نہ علما کو اور اس کا اثر زیادہ تر درمیانہ طبقے کے بعض حساس افراد تک محدود تھا، لیکن ذہین لوگوں میں اس کا چرچا بہت ہوا اور کچھ اور اخبار اور رسالے بھی یہی آواز اٹھانے لگے۔ اس صدی کے آغاز تک صحافت پر یہی رنگ غالب رہا اور چوں کہ اجنبی راج کا خوف طاری تھا اس لیے سیاست ایوانِ صحافت میں داخل بھی ہوئی تو دبے پاؤں، مبادا اس کی آہٹ سے حاکموں کے آرام میں خلل پڑے اور وہ ناراض ہو جائیں۔

اس کے بعد صحافت نے ایک اور جست لگائی اور میدانِ سیاست میں آپہنچی۔ جنگِ روس و جاپان میں روس کی شکست، تقسیمِ بنگال کی تنسیخ، مسجدِ کانپور کے سانحے اور جنگِ طرابلس اور جنگِ بلقان کے ہنگامی اور طوفانی دور میں وہ رندانِ صحافت منظرِ عام پر آئے، جنھیں نہ ہتھکڑی کا خوف تھا نہ مادی وسائل کے زیاں کا اندیشہ تھا۔ بلاکشانِ صحافت کے اس گروہ کے نقیبِ اوّل حسرت موہانی تھے، لیکن زیادہ نام تین شخصیتوں نے پیدا کیا اور وہ تھے ابوالکلام آزاد، محمد علی اور ظفر علی خاں۔ ان حضرات کا اوڑھنا بچھونا سیاست ہی تھی۔ ان کے طریقہ ہائے کار میں اختلاف ہو تو ہو لیکن مقصد صرف ایک تھا کہ اجنبی راج کا تختہ الٹ جائے اور عوام عروسِ آزادی سے ہم کنار ہوں۔ اتنے میں پہلی جنگِ عظیم آئی۔ اجنبی راج نے ان اخباروں کو بند کر دیا اور شخصیتوں کو نظر بند کر دیا۔ طوفانی صحافت کا آشیانہ اُجڑ گیا اور سیاست و صحافت کے محاذ پر ایک چپ چاپ سناٹا طاری ہو گیا۔ یہ سناٹا اس وقت ٹوٹا جب جنگِ عظیم کے خاتمے پر سیاسی زندگی کا احیا ہوا لیکن بہت جلد ایک اور طوفان آیا۔ رولٹ ایکٹ ایجی ٹیشن سانحہ جلیانوالہ باغ، مارشل لا، تحریکِ خلافت اور تحریکِ عدم تعاون نے بے شمار نئے سیاسی اخباروں کو جنم دیا جو بن بن کر مٹے اور مٹ مٹ کر پھر اُبھر آئے اور بے شمار صحافی زینتِ زنداں ہوئے۔ پھر ہندو مسلم اختلافات کا دور آیا۔ آئینی مباحث ہوئے۔ ہندو اور مسلم

صحافت کے درمیان حقوق کی جنگ چھڑی۔ تاآں کہ مسلم لیگ کی نشاۃ ثانیہ ہوئی۔ قرار دادِ لاہور منظور ہوئی۔ تحریکِ پاکستان نے نئے اخباروں کو جنم دیا اور ۱۹۴۷ میں افقِ خاور پر اُس مملکت کا آفتاب طلوع ہوا جہاں ہم آج سکون سے بیٹھے ہوئے ہیں۔

اس سارے دَور میں صحافت پر سیاست حاوی رہی۔ صحافت کو ایک مشن کی حیثیت حاصل تھی محض ایک مشن کی۔ اس میں تجارت کو بس اتنا ہی دخل تھا کہ اخبار نکالنے والوں اور اس میں کام کرنے والوں کے لیے قُوتِ لایموت کا سامان مہیا ہوتا رہے اور بسا اوقات وہ بھی مہیا نہ ہوا۔ حسرت موہانی ہوں یا ابوالکلام آزاد، ظفر علی خاں ہوں یا محمد علی، جالب دہلوی ہوں یا قاضی عبدالغفار، عبدالمجید سالک ہوں یا چراغ حسن حسرت، مرتضےٰ احمد خاں ہوں یا حمید نظامی اور زندوں میں آج ہوں یا نصراللہ خاں عزیز ——— یہ لوگ روٹی کھانا چاہتے تو بہت بہتر ذرائع کے مالک ہوتے لیکن ان کے سامنے کچھ مقاصد تھے۔ ان کے عقائد سے کسی کو خلاف ہو یا اتفاق لیکن اِس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں کہ انھیں مقاصد سے عشق تھا اور مادی وسائل پیدا کرنے سے انھیں کوئی خاص واسطہ نہیں تھا۔

آج دنیائے صحافت ان شخصیتوں سے محروم ہے اور جو لوگ پرانی روایتوں سے پیار کرتے ہیں وہ ان کا عکس آج کی صحافت میں نہیں پاتے تو سرد آہ بھر کر کہتے ہیں: کاش کوئی رندِ صحافت رہوار وحشت پر سوار ہو کر دیوانہ وار آئے اور ماضی پھر لوٹ آئے لیکن وہ نہیں جانتے کہ ماضی کبھی نہیں لوٹتا اور بیتی ہوئی گھڑیاں ذہن کے پردے پر حسین یادوں کی صورت میں جلوہ افروز ہو سکتی ہیں لیکن انھیں حال کے روپ میں نہ کوئی ڈھال سکا ہے نہ ڈھال سکے گا۔

اِس کی دَو وجوہ ہیں: ایک سیاسی، ایک معاشی۔ سیاسی وجہ یہ ہے کہ رندانِ صحافت کے سامنے جو نصبُ العین تھا وہ حاصِل ہو چکا۔ غلامی کی زنجیریں کٹ گئیں اور ہمیں آزادی مل گئی۔ آزادی کے بعد جو مسائل ہمیں درپیش ہیں اس پر اس انداز میں قلم نہیں اٹھایا جا سکتا۔ جس انداز میں دورِ غلامی کے مسائل پر اٹھایا جا سکتا تھا۔ دورِ غلامی میں ذمے داریاں حاکموں کی تھیں اور اخبار ذمّے داریوں سے آزاد ہو کر لکھتے تھے۔ دورِ آزادی میں عوام خود حاکم ہوتے ہیں، اِس لیے ذمّے داریوں کا بوجھ ان کے کندھوں پر بھی ہوتا ہے۔ آج زیادہ سے زیادہ یہی مسئلہ اٹھ سکتا ہے کہ آئین ایسا نہ ہو، ایسا ہو اور اس پر دیانتدارانہ اختلافِ رائے بھی ہو سکتا ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ کسی ایک قسم کے آئین پر کامل اتفاقِ رائے ناممکن ہے۔ پھر دورِ غلامی میں ہمارے اخبار نویس سوچتے تھے کہ گڑ بڑ ہوتی ہے تو ہو، فساد ہوتے ہیں تو ہوں، بلکہ زیادہ ہوں، غیر ملکی حملے کا خطرہ ہے تو ہوا کرے۔ ایک

آقا نہیں تو دُوسرا سہی لیکن دَورِ آزادی میں اخبار نویس کو ایک تیز و تُند شذرہ یا اداریہ لکھتے وقت ہزار بار سوچنا پڑتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ امنِ عامہ میں خلل پڑے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دشمن ہمارے اختلاف سے فائدہ اٹھالے اور ہم آزادی ہی سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔ یہ ذمّے داری کا احساس تحریر میں توازن پیدا کرتا ہے اور اس میں شعلہ مقالی پیدا نہیں ہوتی جو پُرانے صحافیوں کے اسلوبِ نگارش کا طرۂ اِمتیاز تھی، وہی اسلوبِ نگارش جس کے ٹھاٹھ باٹھ پر ہم عش عش کر اٹھتے تھے اور نشے سے جھومتے تھے۔

دوسری وجہ صحافت کا معاشی پہلو ہے جس کی نوعیت یکسر بدل گئی ہے۔ پرانے زمانے میں اخبار نکالنا آسان تھا۔ کاغذ سستا تھا، طباعت ارزاں تھی، تنخواہیں کم تھیں۔ اخبار نکالنے کے لیے بہت تھوڑے سرمائے کی ضرورت تھی، اِس لیے جو لوگ کسی مقصد کو فروغ دینے کے لیے اخبار جاری کرنا چاہتے وہ کچھ اپنی پونجی لگاتے، کچھ دوستوں سے لیتے اور اخبار جاری کر لیتے تھے۔ عوامی تحریکوں کی رہنمائی کے باوجود ان اخباروں کی اشاعتیں آج کے مقابلے پر بہت کم تھیں اور مقابلہ شخصیتوں میں تھا، پروڈکشن میں نہیں تھا۔ اس کے باوجود محمد علی، ظفر علی خاں، ابوالکلام آزاد اور دوسرے تمام کلاسیکی صحافی آئے دن اداریوں میں خسارے کا رونا روتے تھے۔ آج اخبار نکالنا کسی ایک شخص کے بس کا روگ نہیں ہے۔ آج ایک کارکن صحافی کو جو تنخواہ ملتی ہے پُرانے زمانے میں اس سے پورا ادارتی عملہ مطمئن ہو جاتا تھا۔ کاتبوں کی تنخواہیں بھی بڑی ہیں اور کارکردگی میں کمی واقع ہوئی ہے۔ اخباری کاغذ کی قیمت دس گنا ہو گئی ہے، طباعت کا خرچ بڑھ گیا ہے۔ انتظامیہ اور ادارتی دونوں عملوں کی تعداد میں بیحد اضافہ ہو گیا ہے۔ اِس کے مقابلے پر اخبار کی قیمت میں اضافہ بہت کم ہوا ہے۔ پہلے ایک آنہ تھی اب ڈھائی آنے ہے۔ اس صورتِ حال سے نپٹنے کا طریقہ یہی ہے کہ بہت بڑا سرمایہ لگا کر پہلے اشاعت بڑھائی جائے اور مسلسل نقصان برداشت کیا جائے۔ پھر اشتہاروں سے خسارہ پورا کیا جائے۔ بڑا سرمایہ صرف سرمایہ دار لگا سکتے ہیں اور ظاہر ہے وہ اپنی رقم ڈبونے کے قائل نہیں، اِس لیے وہ کارکن صحافیوں کا ہنر خریدتے ہیں اور جب ہنر بکنے لگے تو کوئی صحافی مالک کے خیالات سے مختلف خیالات کا پرچار کیسے کر سکتا ہے؟

جب صحافت کا کاروبار بڑے پیمانے پر چلتا ہے تو مقابلہ بھی ہوتا ہے، چونکہ اشتہارات شہ رگ کی حیثیت رکھتے ہیں اور وہ زیادہ اشاعت کی بنا پر ملتے ہیں اِس لیے اشاعت بڑھانے کے مختلف طریقے اِختیار کیے جاتے ہیں۔ ہر اخبار دوسروں سے پہلے قارئین تک پہنچنا چاہتا ہے، اس لیے دوسرے شہروں سے ایڈیشن جاری کیے جاتے ہیں۔ خود بڑے شہروں سے بعض اخبار دو

سے پانچ تک ایڈیشن نکالتے ہیں تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ فاصلے پر صبح سویرے پہنچ سکے۔ ہر اخبار اس کوشش میں ہے کہ اسے ایسی طباعتی مشینیں حاصل ہو جائیں جن پر کم از کم وقت میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں اخبار چھاپا جاسکے۔ مواد کو بہتر بنانے کے لیے بھی مقابلہ جاری ہے۔ ہر بڑا اخبار زیادہ سے زیادہ خبر رساں ایجنسیوں، فیچر سنڈیکیٹوں، اسٹاف رپورٹروں اور بیرونی مقامات پر خصوصی نامہ نگاروں کی خدمات حاصل کرتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ تصاویر چھاپتا ہے۔ اسی مقابلے نے اردو صحافت کو لیتھو طریق طباعت چھوڑ کر آف سٹ طباعت اختیار کرنے پر مجبور کیا ہے، جس کی لاگت زیادہ ہے اور اس وقت صورت یہ ہے کہ ایک اچھا اردو روزنامہ جاری کرنے کے لیے تیس لاکھ روپے کا سرمایہ درکار ہے اور انگریزی اخبار کے لیے پچاس لاکھ روپے کا اندازہ ہے۔ یہاں یہ بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ۱۹۲۷ء میں روزنامہ "انقلاب" صرف چار ہزار روپے کے سرمائے سے نکلا تھا اور دس سال بعد روزنامہ "شہباز" بھی اتنے ہی سرمائے سے نکلا تھا۔

پس آج صحافت محض مشن کی حیثیت نہیں رکھتی، یہ ایک صنعت بھی بن چکی ہے لیکن اس پر آنسو بہانے کی کوئی ضرورت نہیں، کیوں کہ یہ ایک تاریخی تقاضا تھا جو صرف پاکستان ہی میں نہیں ہر ترقی پذیر ملک میں پورا ہو کر رہا۔ ایک زمانہ تھا جب برطانیہ کے حکمران طبقے اپنے ملک کے اولین صحافیوں کو غنڈے اور بدمعاش قرار دیتے تھے۔ انھوں نے صحافت کو کچلنے کی کوشش کی۔ صحافیوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ پھر صنعتی انقلاب کے بعد اخباروں میں مقابلہ شروع ہوا۔ مقابلے کے ساتھ ساتھ اعلا روایات کو بھی قائم رکھا گیا اور آخر وہ وقت آگیا کہ صحافت نے مملکت کے چوتھے ستون کی حیثیت بھی حاصل کرلی اور صنعت بھی بن گئی، صنعت بننے کا مطلب یہ نہیں کہ برطانوی صحافت کا اب کوئی مشن باقی نہیں رہا یا وہ اخلاق سے عاری ہوگئی!

میں ہرگز یہ تسلیم نہیں کروں گا کہ صحافت اسی طرح کی صنعت ہے جیسے پارچہ بافی یا صابن سازی کی صنعت ہوتی ہے لیکن اگر ایک لمحے کے لیے یہ تسلیم بھی کرلیا جائے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا پارچہ بافی، ہوزری یا صابن سازی کی صنعتوں کا کوئی اخلاقی پہلو نہیں ہوتا؟ کیا ٹیکسٹائل انڈسٹری کے ارباب بست وکشاد پر یہ اخلاقی ذمے داری عائد نہیں ہوتی کہ وہ جو مال بنائیں وہ واقعی پائدار ہو؟ کیا ان سے یہ توقع نہیں کی جاتی کہ وہ اپنے اشتہاروں میں جو دعوے کرتے ہیں وہ صحیح ثابت ہوں؟ تو پھر یہ کیوں سوچا جائے کہ صحافت صنعت ہوگئی تو وہ اخلاقی اقدار سے محروم ہو جائے گی؟

میں" صنعت" کے لفظ کو صحافت کے لیے گالی نہیں سمجھتا لیکن اِتنا ضرور کہوں گا کہ اس صنعت کی نوعیّت دوسری صنعتوں سے مختلف ہے۔ دوسری صنعتیں لوگوں کی ساری ضرورتیں پوری کرتی ہیں۔ صحافت ذہنی تقاضوں کی تکمیل میں مدد دیتی ہے۔ صحافت کو معاشرے کے دل و دماغ سے تعلق ہے۔ ضمیرِ انسانی سے واسطہ ہے، اس لیے صحافت معاشرے کو متاثر کرتی ہے اور معاشرہ صحافت کو متاثر کرتا ہے۔ صحافت معاشرے کی خدمت کرتی ہے، اس کی عکاسی کرتی ہے، اس کی رہنمائی کرتی ہے۔ معاشرہ بھی اس کی قدر کرتا ہے لیکن کبھی کبھی اختلاف بھی ہو جاتا ہے کیونکہ معاشرہ صحافت سے غیر معمولی توقعات وابستہ کر لیتا ہے اور جب وہ توقعات پوری نہیں ہوتیں تو بلا تکلف یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ صحافت نہیں تجارت ہے۔ حالاں کہ صحافت صحافت بھی ہے اور تجارت بھی۔ صحافت کی کارکردگی کو جانچنے کا ایک ہی پیمانہ ہے اور وہ ہے ان فرائضِ صحافت کی انجام دہی جو وقتاً فوقتاً معیّن ہوتے ہیں۔

کلاسیکی صحافت کے مندرجہ ذیل فرائض دنیا بھر میں تسلیم کیے گئے ہیں:

اوّل : دن بھر کی خبروں کی فراہمی اِس شرط کے ساتھ کہ جہاں تک ممکن ہو سکے وہ مکمل اور صحیح ہوں۔

دوم : قارئین کو صحیح نتائج تک پہنچانے کے لیے حالاتِ حاضرہ اور مسائلِ حاضرہ کی تشریح اور تاویل۔

سوم : رائے عامّہ کی رہنمائی اس ڈھنگ پر کی جائے کہ پہلے ہر مسئلے کے دونوں پہلو غیر جانبدارانہ انداز میں پیش کیے جائیں اور اس کے بعد اس زاویۂ نگاہ سے نتائج اخذ کیے جائیں کہ کس صورت میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کی زیادہ سے زیادہ بھلائی ممکن ہے۔

یہ ایک آئیڈیل ہے اور وہ بھی صحافت کے کلاسیکی دَور کا۔

مثالی صحافت نہ کبھی پہلے وجود میں آئی ہے نہ شاید آئے گی۔ پھر وہ کلاسیکی دَور بھی گزر چکا ہے جس میں مثالی صحافت کے یہ نقوش ترتیب دیے گئے تھے، لیکن اس کے باوجود اگر ہم اسی پیمانے پر آج کی صحافت کو پرکھیں تو مایوس نہیں ہوں گے اور کم از کم یہ تو ضرور محسوس کریں گے کہ ہم نے ترقی کی ہے، تنزل کی طرف نہیں گئے۔ پہلے خبروں کی فراہمی کی طرف آیئے۔ آج کا ہر بڑا اخبار خواہ وہ اُردو میں نکلتا ہو یا انگریزی میں، خبر رسانی کے تمام ذرائع کو بروئے کار لاتا ہے۔ تمام ملکی اور غیر ملکی خبر رساں اداروں کی سروس لیتا ہے۔ ٹیلی پرنٹر بھی نصب ہیں تاکہ خبریں جلد از جلد ملیں۔ ریڈیو پر دُنیا کے اہم مراکز کے خبرنامے سُنے جاتے ہیں۔ اضلاع اور

بڑے شہروں اوراہم ممالک میں خصوصی نامہ نگار مقرر کیے جاتے ہیں، غرض جہاں تک ممکن ہو خبروں کے تمام ذرائع سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ خبروں کے موضوعات میں ایک حیرت انگیز تنوع موجود ہے۔ جہاں پہلے سیاست ہی خبروں کا موضوع تھی وہاں آج معیشت، تجارت، عمرانیات، جرم و سزا، معاشرتی مسائل ـــ غرض ہر موضوع پر خبریں دی جاتی ہیں۔ آج کا قاری اخبار غور سے پڑھے یا نہ پڑھے اخبار ضرور دنیا بھر کی معلومات اس کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ جہاں تک مسائلِ حاضرہ اور حالاتِ حاضرہ کی تشریح اور تاویل کا تعلق ہو ہماری جدید صحافت نے اس میں بہت ترقی کی ہے اور ابھی بہت ترقی کی گنجائش ہے۔ آج کے اخبارات میں حالاتِ حاضرہ کا پس منظر وسیع پیمانے پر دیا جاتا ہے اور صورتِ حالات کو واضح کرنے کے لیے نقشے اور گراف تک دیے جاتے ہیں۔ پھر بہت سے اخبار ہیں جو رائے عامہ کی رہنمائی میں پیش پیش ہیں۔ یہ درست ہے کہ ہر اخبار ایک مخصوص زاویۂ نگاہ کا حامل ہے اور وہ اسی زاویۂ نگاہ کی تشکیل کا فرض سرانجام دیتا ہے اور کچھ ایسے اخبار بھی ہیں جو تصویر کے دونوں پہلو واضح طور پر سامنے نہیں رکھتے، لیکن اگر کامیاب اور آزاد صحافت کے مختلف عوامل کو پیشِ نظر رکھا جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ ہمارا قدم آگے ہی بڑھ رہا ہے پیچھے کی طرف نہیں جا رہا۔

ابھی جو جائزہ ہیں نے پیش کیا اس میں جدید صحافت کو کلاسیکی اقدار کی روشنی میں جانچا گیا تھا اور آج ان اقدار میں کچھ تبدیلیاں بھی رونما ہو چکی ہیں۔ ان تبدیلیوں کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اب اخبار پڑھنے والوں کی تعداد میں بے حد اضافہ ہو چکا ہے اور یہ اضافہ تیز رفتاری سے جاری ہے۔ ان قارئین میں غالب اکثریت ان لوگوں کی ہے جن کی ذہنی سطح زیادہ بلند نہیں ہے۔ وہ گھمبیر مسائل کو نہ سمجھتے ہیں اور نہ سمجھنا چاہتے ہیں۔ وہ خبریں اس انداز میں حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ آسانی سے سمجھ میں آسکیں۔ ان قارئین کا تعلق عوام سے ہے، اس لیے یہ خواص کے ساتھ ساتھ عوام کی سرگرمیوں سے بھی آگاہ ہونا چاہتے ہیں۔ پھر آج کی نسل بے حد مصروف ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ ذہن پر غیر ضروری دباؤ ڈالے بغیر تمام ضروری معلومات حاصل کرلے۔ اسی تقاضے کو پورا کرنے کے لیے جدید صحافت نے تحریر کا ایک ایسا ڈرامائی اسلوب اختیار کیا ہے جس سے خبر کی دل چسپی یوں اجاگر کی جاتی ہے کہ قاری اسے پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ چوں کہ یہ اسلوب نیا ہے، اس لیے کچھ لوگ اسے سنسنی خیزی سے تعبیر کرتے ہیں اور چوں کہ ان کے نزدیک "سنسنی خیزی" بری چیز ہے اس لیے وہ صحافت کو مطعون کرتے ہیں۔ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے یہ دیکھ لیا جائے کہ "سنسنی خیزی" کسے کہتے ہیں۔ یوں تو

ہر ایسی خبر جو ہمیں چونکا دے، ڈرا دے، مغموم کردے یا غصّے میں لے آئے، سنسنی خیز خبر ہے اور ایسی خبریں چھاپنا کوئی بُری بات نہیں لیکن جس چیز کو ہم صحافت میں "سنسنی خیزی" سے تعبیر کرتے ہیں اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جن خبروں میں سنسنی کی کوئی بات نہیں، انھیں نمک مرچ لگا کر سنسنی خیز بنا دیا جائے۔ اب ایک طرف یہ انداز ہے جو کبھی کبھی ہمارے اخبار اشاعت بڑھانے کے لیے اختیار کر لیتے ہیں اور دوسری طرف خبر کی تحریر کا ڈرامائی اسلوب ہے جو اس کی دل چسپی میں اضافہ کرتا ہے اور اسے زیادہ قارئین تک پہنچانے میں مدد دیتا ہے۔ ان دونوں کے درمیان کوئی حدِ فاصل تو ہے نہیں لیکن کسی اخبار پر سنسنی خیزی کا الزام لگانے سے پہلے ہمیں دیکھنا چاہیے کہ آیا یہ اخبار غلط خبر تو نہیں دیتا، مبالغہ تو نہیں کرتا۔ اگر ایسا نہیں ہے تو اخبار سنسنی خیزی کا مرتکب نہیں۔

معاشرے کا ایک گروہ ایسا بھی ہے جس کے خیال میں آج کے اخبار ڈل یا سپاٹ ہیں اور ان میں کوئی خبر ہی نہیں ہوتی اور بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ صاحب! آج کل اخبار میں رکھا ہی کیا ہوتا ہے۔ دو منٹ کے لیے نظر ڈالنا کافی ہے۔ یہ لوگ اوّل تو سیاست زدہ ہوتے ہیں اور انھیں جب تک سیاسی تنازعات کا چٹخارہ نہ ملے اطمینان ہی نہیں ہوتا ہے۔ دوسرے یہ خبروں کے بارے میں ایک ایسے تصوّر کے قائل ہیں، جو آج کی دنیا میں پرانا ہو گیا ہے۔ مدّت ہوئی کہ امریکا کے اخبار "سن" کے ایڈیٹر مسٹر ڈینا "DANA" نے کہا تھا کہ اگر کتّا انسان کو کاٹ لے تو وہ خبر نہیں لیکن اگر انسان کتّے کو کاٹ لے تو وہ خبر ہے یعنی ہر ایبنارمل چیز خبر ہے اور نارمل چیزیں خبر کا موضوع نہیں بن سکتیں۔ یہ تصوّر زیادہ تر امریکا کے سنسنی خیز اخباروں کا وضع کردہ ہے اور اسے دُنیا کے بعض اور ممالک میں بھی مقبولیت حاصل ہے۔ اِس نظریے کے حامل لوگ تخریب میں خبر دیکھتے ہیں اور تعمیر میں خبریں نہیں دیکھتے کہ یہ نارمل چیز ہے۔ اس کے مقابلے پر سوویٹ یونین، کمیونسٹ چین اور دوسرے کمیونسٹ ممالک میں یہ نظریہ عام ہے۔ تعمیر ہی اصل خبر کا منبع ہے اور تخریب خبر کا موضوع نہیں بن سکتی۔ چناں چہ ان ممالک کے اخباروں میں تعمیر کے موضوع پر بے شمار خبریں ملتی ہیں لیکن جرم و سزا اور جنسی بے راہ روی کی خبریں صرف ان مواقع پر دی جاتی ہیں جب کسی خاص بُرائی کے خلاف مہم چلائی جاتی ہے۔ سچ پوچھیے تو نہ امریکی پیلی صحافت معاشرے کی صحیح عکاسی کرتی ہے نہ سوویٹ یا کمیونسٹ صحافت کرتی ہے۔ میں کہہ چکا ہوں کہ صحافت اور معاشرے میں چولی دامن کا ساتھ ہے اور صحافت کو معاشرے کی ایسی عکاسی کرنی چاہیے جو صداقت پر مبنی ہو۔ دوسرے لفظوں میں صحافت کو معاشرے کا آئینہ ہونا چاہیے جس میں

معاشرے کے حسین اور بدنما دونوں پہلو بے نقاب ہوں۔ تعمیر کی رُوداد بھی ہو اور تخریب کی بھی لیکن اس ڈھنگ کے ساتھ کہ معاشرے کے بدنما پہلو اچھے نہ لگیں اور تخریب میں کشش کا سامان نہ ملے اور معاشرہ تخلیقِ حسن کی طرف راغب ہو اور اس کا ذہن تعمیری بن جائے۔ چوں کہ ہماری جدید صحافت بالعموم اسی راستے پر گامزن ہے اور اس میں ان تعمیری سرگرمیوں کا عکس نمایاں ہے جو پچھلے چند سالوں سے ہمارا قومی شعار بن چکی ہیں اور یہ رنگ پہلے اور پرانے رنگ سے مختلف ہے، اِس لیے اس پر سپاٹ پن کا الزام ایک محدود گروہ کی طرف سے لگایا جاتا ہے۔

معاشرے کے بعض افراد کو یہ بھی شکایت ہے کہ بعض اخبار عورتوں کی نیم عُریاں تصویریں چھاپتے ہیں اور لوگوں کا جنسی جذبہ ابھار کر اشاعت بڑھانے کی سعی کرتے ہیں میں نہ نیم عُریاں عورتوں کی تصاویر کی اشاعت پسند کرتا ہوں نہ جنسی جذبہ ابھارنے کا حامی ہوں، بلکہ اگر اجازت ہو تو یہ بھی کہوں کہ میں عورتوں کو شمعِ محفل بنانے کا زیادہ قائل نہیں ہوں، لیکن اس پہلو کا سائنسی تجزیہ ضروری ہے۔ سوچیے کہ پچھلے رُبع صدی میں ہمارا معاشرہ کتنا بدلا ہے؟ ایک زمانہ تھا جب کوئی نوجوان گانا سننے کسی طوائف کے کوٹھے پر جاتا تھا تو اسے بدمعاش قرار دیا جاتا تھا۔ آج ریڈیو کے طفیل گھر گھر مجرا ہو رہا ہے اور اس سے صرف مرد ہی نہیں، عورتیں بلکہ چھوٹی چھوٹی بچیاں بھی لطف اندوز ہوتی ہیں۔ پرانے زمانے میں کسی نوجوان کی الماری میں فلم ایکٹریس کی تصویر ملتی تھی تو گھر میں ہنگامہ برپا ہو جاتا تھا، آج گلیوں اور بازاروں اور دیواروں پر جا بجا عورتوں کی نیم عریاں تصاویر ہمارا استقبال کرتی ہیں۔ کسی زمانے میں امرا کے ڈرائنگ رُوموں میں بھی مناظرِ قدرت کی تصاویر لگی ہوتی تھیں۔ آج درمیانہ طبقے کے افراد بھی اپنے ڈرائنگ رُوم میں عریاں پینٹنگ لگا دیتے ہیں یا آپ کی نظر کے سامنے عریاں عورت کا بُت سربسجود ہوتا ہے۔ آج کوئی فلموں کے ذریعے پھیلائی جانے والی بداخلاقی پر معترض ہو تو اچھے اچھے لوگ اس کا مضحکہ اڑا دیتے ہیں۔ نت نئے سینما ہال قائم کرنے کی اجازت دی جا رہی ہے اور غیر ممالک سے آئی ہوئی ایسی فلمیں دکھائی جاتی ہیں جو ہمارا سارا تہذیبی رنگ بدل رہی ہیں۔ تقسیم سے پہلے ہندو عورتیں شمعِ محفل بنتی تھیں اور مسلمان عورتیں سوائے چند مستثنیات کے چراغِ خانہ بننے کو ترجیح دیتی تھیں۔ آج جو حالت ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔ پرانے زمانے میں صرف بڑے بڑے رؤسا طوائفیں نچواتے تھے، آج ہمارے معاشرے میں ثقافتی محفلیں عوامی سطح پر منعقد ہوتی ہیں وہاں شریف گھرانوں کی لڑکیاں پیشہ ور ناچنے، گانے والیوں کے دوش بدوش اپنے جوہر دکھاتی ہیں۔ رُبع صدی پہلے مجلسی تقریبیں

ایک تو کم تعداد میں ہوتی تھیں دُوسرے مردوں کے لیے الگ ہوتی تھیں اور عورتوں کے لیے الگ۔ آج آپ کو شاید ہی کوئی ایسی تقریب نظر آئے جو ہجوم رنگ و بو سے محروم ہو، پھر اکثر تقریبوں نے نمائش کا روپ لے لیا ہے۔ مصوّری کی نمائش، عکسی تصادیر کی نمائش، کارٹونوں کی نمائش، کتابوں کی نمائش، صنعتی نمائش، تعلیمی نمائش جن کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اکثر لوگ نمائش دیکھنے نہیں، اپنی نمائش کرنے آتے ہیں، تاکہ دوسروں کو بتا سکیں کہ ہم بھی مہذب اور ماڈرن ہیں۔ پھر ہم اپنا ذوق اتنا بدل چکے ہیں کہ ہمیں صابن، نیل، کریم، پاؤڈر، ٹوتھ پیسٹ بلکہ شیونگ کریم اور سکوٹر تک خریدنے پر آمادہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اِشتہاروں میں ہم سے کوئی مہ وش اور مہ پارہ ایسی درخواست کرے —— تو حضورِ والا ایسی فضا اور ایسے ماحول میں صحافت سے کیوں کر یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ بحر الکاہل کے کسی ننھے منے سے اکیلے جزیرے کی طرح اس سارے ماحول سے بے نیاز اور بالا رہے۔

اِس کے باوجود اللہ کا شکر ہے کہ صحافت اخلاقی طور پر اِتنی پست نہیں ہوئی جتنی پستی ہمارے معاشرے میں آ چکی ہے۔ ابھی سات آٹھ ماہ پہلے میں نے اردو روزناموں کے تین تین مہینوں کے شماروں کا جائزہ لیا تاکہ معلوم ہو کہ اخبار کس حد تک اخلاق بگاڑ رہے ہیں اور میں اس نتیجے پر پہنچا کہ جنسی جذبے کو ابھارنے میں کثیر الاشاعت اخباروں کا اتنا حصّہ نہیں جتنا کم اشاعت کے اخباروں کا حصّہ ہے۔ بہر حال یہ ایک خطرناک رُجحان ہے جس کا تدارک ضروری ہے۔ جب میں نے کراچی کے ایک باغ و بہار شخصیت کے مالک ایڈیٹر کی توجہ اس طرف دلائی تو فرمانے لگے، "خورشید صاحب! آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ ہم نے تو ابھی تک کچھ کیا ہی نہیں۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔" میں نے کہا، "صاحب! آج آپ عورت کو ننگا اور جانگیے میں پیش کر رہے ہیں اور فرماتے ہیں ابھی کچھ کیا ہی نہیں۔ ذرا یہ تو بتائیے کہ جب آپ کچھ کریں گے تو کیا کریں گے۔ اور لاہور کے ان مدیر گرامی قدر سے ابھی تک ملاقات نہیں ہوئی جن کے سامنے اگر یہ کہا جائے کہ صحافت ایک صنعت ہے تو وہ یوں بلبلا اٹھتے ہیں جیسے کسی بھڑ نے کاٹ کھایا ہو لیکن جو اس امر پر کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے کہ ایسی تصویر چھاپ دی جائے جس میں دو نیم عریاں لڑکیاں ایک بیٹل بوائے (BEATLE BOY) کو چوم رہی ہوں۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر کم اشاعت کے اخباروں نے یہ سلسلہ جاری رکھا تو کثیر الاشاعت اخباروں کو بھی یہی کرنا پڑے گا، کیوں کہ بے چاری صحافت ایک بڑی مشکل سے دوچار ہے کہ یہ ایک معاشرتی ادارہ بھی ہے اور تجارتی ادارہ بھی، اور اس میں دوچار بہت سخت مقام آتے ہیں۔ ایک طرف معاشری ذمّے داریوں کا بوجھ ہے دوسری طرف تجارتی تقاضے قدم قدم پر دامن تھام لیتے ہیں۔

جدید صحافت پر یہ اعتراض بھی کیا جاتا ہے کہ اخبار کیا ہے ؟ چوں چوں کا مربّہ۔ کہیں عورتوں کا صفحہ ہے، کہیں بچوں کا صفحہ ہے، کہیں فلمی سپلی منٹ ہے، کہیں مولوی صاحب وعظ فرما رہے ہیں، کہیں حکیم جی طبّی مشورے دے رہے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے لوگوں کے بیانات دے دیے جاتے ہیں۔ پرائمری اسکولوں پر فیچر چھپ جاتے ہیں۔ کہیں مزدوروں کا صفحہ ہے تو کہیں طلبہ کا کالم۔ اخبار کیا ہیں رسالے ہیں یا شاید وہ بھی نہیں اور جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ اخبار میں کیا ہونا چاہیے تو بتاتے ہیں کہ سنجیدہ خبریں ہوں اور ان پر مدلّل تبصرے۔ گویا اخبار صرف ابّا جان کے لیے ہو اور وہ بھی ایسے ابّا جان کے لیے جو بڑے فہیم و دانا ہوں اور ان کا مزاج نہایت سنجیدہ ہو۔ میں ان کی بات سمجھ سکتا ہوں اور وہ کوئی اتنی غلط بات نہیں کہتے۔ لندن میں دی ٹائمز، گارڈین اور ڈیلی ٹیلی گراف اسی قسم کے بزرگوں کے لیے ہیں۔ افسوس! پاکستان میں اتنے سنجیدہ اور ثقہ لوگ موجود نہیں ہیں کہ ان کے بل پر کوئی ایسا معیاری اخبار پنپ سکے اور جن اخباروں کو سنجیدگی اور ثقاہت کے اتنے اونچے معیار کا دعوٰی تھا وہ بھی فلم ایکٹریسوں کے مضامین چھاپنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ جب تک ایسا طبقہ پیدا نہیں ہوتا، ایسا اخبار معرضِ وجود میں نہیں آئے گا۔ رہے موجودہ اخبار، تو میرے نزدیک چوں چوں کا مربّہ بن کر وہ معاشرے کی صحیح خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔ مولوی صاحب کا وعظ ضروری ہے، کیوں کہ زمانہ نازک ہے کوئی کام کی بات کان میں پڑ جائے تو کیا بُرا ہے۔ حکیم صاحب طبّی مشورہ دیتے ہیں تو اس سے سارے کنبے کا فائدہ ہے، کیوں کہ بیماریوں کی روک تھام ہوتی ہے اور ڈاکٹروں پر اخراجات میں کمی ہوتی ہے۔ عورتوں کا صفحہ مفید ہے، کیوں کہ یہ انھیں بہتر بیوی، بہتر بہن اور بہتر بیٹی بناتا ہے۔ پھر بچوں کے لیے تفریح کا سامان مہیا رہتا ہے۔ فلمی سپلی منٹ کا یہ فائدہ ہے کہ فلم بین حضرات گندے فلمی رسالوں کی طرف رجوع نہیں کرتے۔ رہی یہ بات کہ چھوٹے لوگوں اور چھوٹے اداروں اور مزدوروں کا زاویۂ نگاہ کیوں پیش ہو؟ اس کا جواب واضح ہے کہ یہ سب ہمارے معاشرے کے اہم عناصر ترکیبی ہیں اور جمہوریت کے اِس دَور میں عوام کے ہر گروہ کی بہبود معاشرے کی اہم ترین ضرورت ہے جو صحافت پوری کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اصل میں ہم لوگوں کو ترقی یافتہ ممالک کی صحافت کے طور طریقوں کا علم نہیں۔ ہم میں سے بعض اعتراض کرتے ہیں کہ اتنے صفحوں کے اخبار میں ہمارے پڑھنے کا مواد کم ہوتا ہے اور رطب و یابس بھرا ہوتا ہے۔ یہ اعتراض غلط ہے۔ اگر کوئی چیز میرے لیے رطب و یابس ہے تو کچھ ایسی چیزیں بھی ہوتی ہیں جنھیں میں پسند کرتا ہوں لیکن وہ دوسروں کے لیے رطب و یابس کی حیثیت رکھتی ہیں۔ چونکہ اخبار

کو قارئین کے تمام طبقات کے ذوق کا خیال رکھنا پڑتا ہے اس لیے وہ ہر قسم کا مواد پیش کر دیتا ہے۔ قاری کا فرض ہے کہ اپنے مطلب کی چیز پڑھ لے باقی چھوڑ دے۔ آپ میں سے اکثر یہ سن کر حیران ہوں گے کہ امریکا کے بہت سے اخبار روزانہ سو ڈیڑھ سو صفحے پر مشتمل ہوتے ہیں۔ "نیویارک ٹائمز" کا جو سنڈے ایڈیشن امریکی شہریوں کے لیے چھپتا ہے اس میں پانسو سے زائد صفحے ہوتے ہیں۔ ہر پرچہ مختلف قسم کے مواد کے حامل "سپلی منٹس" پر مشتمل ہوتا ہے۔ لوگ اپنے مطلب کا سپلی منٹ لے کر پڑھ لیتے ہیں، باقی پھینک دیتے ہیں اور اخبار کو کبھی یہ طعنہ نہیں دیتے کہ زیادہ صفحے اِس لیے دیتا ہے کہ لوگ ردی بیچنے ہی کے لیے خرید لیں۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ آج کی صحافت معاشرے کے تمام حسین اور بدنما پہلوؤں کی عکاس ہے، چوں کہ یہ معاشری ادارہ بھی ہے اور تجارتی ادارہ بھی، اس لیے کبھی کبھی اس سے کچھ ایسی حرکتیں سرزد ہو جاتی ہیں جو تجارتی لحاظ سے تو سود مند ہوتی ہیں لیکن معاشرے کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتی ہیں۔ اس کی روک تھام کے لیے مہذب ممالک میں صحافیوں کی انجمنیں اپنا ضابطۂ اخلاق بناتی ہیں۔ سب ارکان اس کی پابندی کرتے ہیں، اِس لیے صحافت معاشرے کے لیے نقصان دہ ثابت نہیں ہوتی۔ ضابطۂ اخلاق کی بنیاد آدابِ صحافت پر رکھی جاتی ہے اور آدابِ صحافت آدابِ معاشرہ ہی سے ابھرتے ہیں۔ جس طرح معاشرے کے ہر فرد سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ ذمّے داری، آزادیٔ ضمیر، خلوص، سچّائی اور شائستگی کو شعار بنائے اسی طرح صحافت سے توقع ہوتی ہے کہ وہ اِنھی اصول کو شمعِ راہ بنائے جو انسان ان اصول پر کاربند ہوتا ہے، معاشرہ اس کی قدر کرتا ہے۔ اِسی طرح جو اخبار اِن اقدار کو عزیز جانتا ہے اور پایۂ ثقاہت سے نہیں گرتا وہ عوام میں ہر دلعزیز ہو جاتا ہے۔ صحافت کا فرض ہے کہ وہ عظمتِ آدم اور شرافتِ انسانی کی نگہبانی کرے۔ عوام کے حقوق کی حفاظت کرے۔ معاشرے کی اقدار اور روایات کا احترام کرے۔ خبروں کی فراہمی، تحریر، ترتیب، تاویل و تشریح میں پوری اِحتیاط سے کام لے۔ معلوماتی مواد کے ساتھ ساتھ تفریحی مواد بھی بہم پہنچائے۔ مسائلِ حاضرہ پر سنجیدہ بحث کرے۔ تعمیری سرگرمی کی حوصلہ افزائی کرے اور ہنگامی اور بحرانی حالات میں عوام کا حوصلہ بلند کرنے میں پیش پیش ہو۔ آدابِ صحافت کا موضوع بہت وسیع ہے لیکن اِس کے چند نقوش یہ ہیں:

۱۔ خبروں کی صحت کا خاص خیال رکھا جائے اور ان میں اپنی رائے نہ ٹھونسی جائے۔

۲۔ اظہارِ رائے صرف اداریے میں کیا جائے اور اس میں بھی تصویر کے دونوں پہلو پیش کیے جائیں۔

۳- جنس و جُرم کی خبریں اس طرح دی جائیں کہ ترغیبِ گناہ یا ترغیبِ جُرم نہ ہو۔
۴- ازدواجی رشتے اور گھریلو رشتے کے تقدس پر آنچ نہ آنے دی جائے۔
۵- جب تک کسی کا جرم عدالت میں ثابت نہ ہوجائے، اسے مجرم بنا کر نہ پیش کیا جائے۔
۶- ہر شخص کو خلوت (PRIVACY) کا حق حاصل ہے۔ اس میں اخبار مداخلت نہ کرے۔
۷- کسی شخص کے خلاف کوئی ایسا سکنڈل نہ درج کیا جائے جو پبلک زندگی پر اثر انداز ہوتا ہو۔
۸- کسی شخص سے نہ کوئی غلط بیان منسوب کیا جائے نہ ایسا بیان جو اس نے نجی گفتگو کے دوران میں دیا ہو اور اس کی اشاعت کا متوقع نہ ہو۔
۹- کسی کے مذہبی جذبات و احساسات کو ٹھیس نہ لگائی جائے۔
۱۰- کسی طبقے کو بہ طورِ خاص استہزا کا موضوع نہ بنایا جائے۔
۱۱- مُردہ شخصیتوں پر طعن و تعریض نہ کی جائے۔
۱۲- مزاحیہ کالم میں نہ کوئی غلط بات بیان ہو نہ کسی کی دلآزاری ہو۔
۱۳- کسی شخص کی اجازت لیے بغیر اس کی تصویر نہ چھاپی جائے۔
۱۴- اخلاقی ملزموں یا مجرموں کی تصویریں نہ چھاپی جائیں۔ بالخصوص کسی کے ہتھکڑی لگی ہو تو اس کی تصویر نہ لی جائے، خاص طور پر جب وہ محض ملزم ہو، مجرم نہ ہو۔
۱۵- کوئی فحش یا عُریاں یا ایسی نیم عریاں تصویر نہ چھاپی جائے جس سے قارئین کے کسی طبقے کا ذہن مسموم ہونے کی توقع ہو۔
۱۶- کوئی ایسا کارٹون نہ چھاپا جائے جس سے ذم کا پہلو نکلتا ہو۔ صدرِ مملکت اور روحانی اور مذہبی رہنماؤں کو کارٹون کا موضوع نہ بنایا جائے۔
۱۷- اغوا کی وارداتوں میں مغویہ کا نام نہ دیا جائے۔ بچوں کے جرائم میں بچوں کے نام نہ دیے جائیں۔
۱۸- خودکشی کی عام خبروں کو بڑھا چڑھا کر نہ چھاپا جائے۔
۱۹- ایسے اشتہار نہ چھاپے جائیں جن کا متن صریحاً گمراہ کن ہو۔
۲۰- محبوب کو پھانسنے، افسر کو راضی کرنے یا دشمن کو مطیع کرنے کے تعویذوں کے اشتہار نہ چھاپے جائیں۔

مختصر یہ کہ آدابِ صحافت شائستگی کی تعلیم دیتے ہیں۔
اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو شخص آدابِ صحافت کی خلاف ورزی کرتا ہو اس کے خلاف

کیا کارروائی ہو؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بعض کیس تو قانون کی زد میں آجاتے ہیں اور ملک کا نارمل قانون ان سے نپٹ سکتا ہے۔ باقی سارا معاملہ رائے عامہ پر چھوڑا جاتا ہے، مثلاً صحافیوں کی انجمن ایک قرارداد میں اعلان کرتی ہے کہ فلاں اخبار کی یہ حرکت آدابِ صحافت کے منافی ہے۔ جن ملکوں میں رائے عامہ مضبوط ہے وہاں یہ سزا کافی رہتی ہے۔ برطانیہ میں صحافیوں اور غیر صحافیوں پر مشتمل اونچی سطح پر ایک پریس کونسل قائم ہے جو ایسی تمام مثالوں پر مسلسل رائے کا اظہار کرتی رہتی ہے۔ اب ایسی کونسلیں کئی دوسرے ممالک میں بھی قائم ہو چکی ہیں۔ کچھ کی حیثیت قانونی ہے اور کچھ کی رضاکارانہ۔ بھارت میں بھی پریس کونسل بن رہی ہے۔ آج جب پاکستانی اخبارات کی اشاعت تیزی سے بڑھ رہی ہے اور صحافت صنعت کا روپ بھی لے چکی ہے۔ مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بھی اعلا سطح پر ایک پریس کونسل قائم کی جائے۔

پاکستان کے لیے یہ کوئی نئی تجویز نہیں۔ ۱۹۵۹ء میں پاکستان کے پریس کمیشن نے بھی یہی تجویز پیش کی تھی جس کے یہ مقاصد تجویز کیے تھے:

۱۔ صحافیوں میں اعلا پیشہ ورانہ معیار کا قیام اور ذمّے داری کے اعلا احساس کی تخلیق۔

۲۔ ان تمام امور پر غور و فکر جن سے عوامی مفاد اور اہمیت کی معلومات کی بہم رسانی میں رکاوٹ ہو یا جو اُن معلومات کی صحت کو متاثر کریں۔

۳۔ صحافت کے پیشے کے لیے بھرتی، تعلیم اور تربیت کے طریقوں کی بہتری۔

۴۔ صحافیوں کی عمومی بہبود۔

۵۔ اس پیشے سے تعلق رکھنے والے تمام گروہوں کے درمیان مناسب تعلقات کا قیام۔

۶۔ نامناسب قسم کی صحافت اور صحافیوں میں نامناسب طرزِ عمل کی حوصلہ شکنی۔

میرے نزدیک وقت آگیا ہے کہ حکومتِ پاکستان ایک قانون کے ذریعے پریس کونسل کا وجود عمل میں لائے اور ایسی صورت پیدا ہو کہ خلافِ اخلاق اور خلافِ معاشرہ مواد کو اخبار میں جگہ نہ مل سکے اور صحافت ان تمام خطرات سے بچ سکے جو اشاعت میں اضافے، مسابقت، صحافیوں کی تربیت میں خلا اور غیر صحافتی دوائر میں صحافیوں کے مالی مفاد سے پیدا ہونے والی قباحتوں سے پیدا ہو رہے ہیں یا ہو سکتے ہیں۔

شامِ ہمدرد۔ لاہور

اکتوبر ۱۹۶۴ء

حکیم احمد شجاع

۱۸۹۳ء

آج کی "شامِ ہمدرد" اس لحاظ سے خاص اہمیت رکھتی ہے کہ لاہور کے اطبا کے ایک قدیم اور مشہور خاندان کے ایک نامور رکن جناب حکیم شجاع صاحب نے جن کا گزشتہ نصف صدی سے ملک کی ادبی سرگرمیوں سے بہت قریب کا اور موثر تعلق رہا ہے اس محفل کو رونق بخشی ہے تاکہ وہ آپ کو لاہور کی پرانی ادبی مجلسوں کی دل کش داستان سنائیں اور ان لوگوں کی یاد آپ کے دل میں تازہ کریں جنھوں نے پنجاب میں اردو زبان کے ارتقا کی ابتدائی منازل میں اسے سہارا دے کر اس قابل بنا دیا کہ اس کا گھر گھر چرچا ہونے لگا۔ ان ہی لوگوں کی کوششوں کی بدولت دہلی اور لکھنؤ کے بعد رفتہ رفتہ لاہور اردو زبان کا مرکز بن گیا اور یہ کہنا کچھ بے جا نہ ہوگا کہ اس زمانے میں کہ اب دہلی اور لکھنؤ میں اردو زبان کی بیخ کنی کے سامان ہو رہے ہیں، لاہور اس کی جائے پناہ ہے اور لاہور اور کراچی کی ادبی سرگرمیاں اردو زبان کی بقا کی ضامن اور اس کے نشو و نما کی کفیل ہیں۔

حکیم احمد شجاع صاحب ۱۸۹۳ء میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ماجد حکیم شجاع الدین اپنے زمانے کے بہت بڑے طبیب فلسفی اور ادیب تھے۔ سخن گوئی اور سخن فہمی دونوں میں مہارت رکھتے تھے۔ "خزینۂ حزینہ" ان کے مرثیوں کا مجموعہ اور "داغِ ہجراں" ان کے اشعار کا دیوان ان کی شاعری کی یادگار ہیں۔ حکیم احمد شجاع صاحب کے خاندان کے کئی نامور طبیب صدیوں تک لاہور اور امرتسر میں مطب فرماتے رہے اور بادشاہانِ وقت کی طرف سے حکیم الحکما اور رئیس الاطبا کے خطابوں سے سرفراز ہوئے۔ لاہور میں بازارِ حکیماں اور امرتسر کا کٹرہ حکیماں، باغیچۂ حکیماں اور دروازہ حکیماں ان ہی اطبا کے کمالِ فن کی یادگار ہیں۔ حکیم احمد شجاع صاحب نے ابتدائی تعلیم لاہور میں حاصل کی۔ اس کے بعد انھوں نے تعلیم کے اعلا مدارج علی گڑھ کالج میں طے کیے اور اپنی طالب علمی ہی کے زمانے میں اپنے ادبی ذوق اور علمی مشاغل کی بدولت بڑا نام پایا۔ ابھی ان کی عمر اٹھارہ برس ہی کی تھی کہ ایک شاعر، افسانہ نگار اور ڈرامہ ٹسٹ کی حیثیت سے ادبی حلقوں میں ان کا چرچا ہونے لگا۔ اس سلسلے میں جناب ڈاکٹر سید محمود صاحب سابق نائب وزیر خارجہ جمہوریہ ہند کے گرامی نامے کا ایک اقتباس، جو انھوں نے حال ہی میں ایک کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے، حکیم احمد شجاع صاحب کے زمانۂ طالب علمی کی ادبی شہرت پر شاہد ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"کتاب کھولنے پر حکیم احمد شجاع کا لکھا ہوا تعارف دیکھا۔



حکیم احمد شجاع

[شام ہمدرد لاہور ، ۵ نومبر ۱۹٦٤ شمسی]

اِس جگہ ڈاکٹر وحید قریشی ایم۔اے پی۔ایچ۔ڈی کی اِس تنقید کا حوالہ جو انھوں نے حکیم احمد شجاع صاحب کی ادبی اور علمی تصانیف پر کی ہے، بے محل نہ ہوگا۔ وہ فرماتے ہیں:

"حکیم احمد شجاع جس ثقافتی ورثے کے عَلَم بردار ہیں وہ حقیقت پسندی کی جدید تعمیر سے بے نیاز ہے۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز بیسویں صدی کی ابتدا میں ہوگیا تھا۔ آج کے مقابلے میں اس زمانے میں مذہب اور انسان کا رشتہ قریب کا تھا۔ زندگی درویشی اور درویش دوستی کو اعلا اوصاف تسلیم کرتی تھی۔ مذہبی نقطۂ نظر کو زندگی کے عملی پہلوؤں میں مدِنظر رکھا جاتا تھا۔ دیانت داری اور دنیا داری میں ایک خاص رشتہ تھا۔ اسلام کی تعلیمات اور قرآنِ پاک کی تجلیات نے حکیم احمد شجاع کے ذہن کی تکمیل کی۔ ان کی اِصلاح پسندی اسی نظامِ حیات سے کسبِ فیض کرتی ہے۔ ان کے ہاں نیکی، انسان دوستی اور مظلوموں کی حمایت جیسی بنیادی انسانی اقدار اسلام اور صرف اسلام کے حوالے سے بیان کی گئی ہیں اور یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ جس ماحول میں حکیم احمد شجاع رہتے تھے یہ اس کا لازمی نتیجہ ہے۔ وہ اپنے ماحول کے نقاد بھی ہیں اور معمار بھی۔ مذہب کو انھوں نے رسمی لباس کے طور پر قبول نہیں کیا۔ اس کی رُوح تک رسائی حاصل کی ہے، اِس لیے ان کے اظہار میں خلوص اور بیان میں وہ ناقدانہ بصیرت پائی جاتی ہے، جو ہر اچھے صاحبِ فن کے لیے ضروری ہے۔"

میری رائے میں حکیم احمد شجاع صاحب نے ایک کامیاب زندگی گزاری ہے۔ "کامیاب زندگی کا تصور" کے موضوع پر حکیم صاحب کے خیالات بڑے خاص ہیں۔ ان کی رائے میں تین قسم کے لوگ ایسے ہیں، جن کی زندگی کو کام یاب کہا جا سکتا ہے: (۱) وہ فقیر جو دُنیا کے لالچ پر لات مار کر گوشۂ تنہائی میں بیٹھ گئے ہوں (۲) وہ عالِم جو اپنے عِلم کے چشمے سے علم کے پیاسوں کو سیراب کریں اور (۳) وہ انسان جن کی سیرت کا کمال دوسروں کی سیرت کو اپنے سانچے میں ڈھال دے۔ حقیقت میں ان تینوں اقسام کے لوگوں کا اگر صحیح تجزیہ کیا جائے تو ظاہر ہو جائے گا کہ یہ ایک ہی سورج کے تین پرتو ہیں یعنی "بے غرض انسانیت" کے آفتابِ عالم تاب کے نور کا ظہور۔ یہ لوگ کنول کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔ پانی میں رہکر پانی میں نہیں ڈوبتے۔ میرے نزدیک انھیں لوگوں کی زندگی کامیاب ہے اور یہی وہ لوگ ہیں، جو اپنی منزلِ مقصود کو پہنچے۔

محمد سعید

لاہور کی پُرانی ادبی مجلسیں

جناب خان بہادر حکیم احمد شجاع صاحب

شور لیست نوا ریزیٔ تارِ نفسم را
پیدا نۂ اے جنبشِ مضراب کجائی

غالب

جِس محبت اور مروّت سے حکیم محمدؐ سعید صاحب دہلوی نے مجھے اور میری ادنیٰ ادبی خدمتوں کو آپ سے متعارف کرایا ہے اس کے لیے میں بدرجۂ غایت شکر گزار ہوں اور اس احساس سے شرمسار کہ میں اپنی عمر بھر کی کوششوں اور کاوشوں کے باوجود حقیقی معنوں میں کوئی قابلِ قدر ادبی خدمت نہیں کرسکا۔

اب کہ عمرِ رَواں کا کارواں زندگی کے سفر کی ستّر منزلیں طے کرچکا ہے، دوستوں کا اصرار ہے کہ میں کسی قدر اجمال کے ساتھ لاہور کی پُرانی ادبی مجلسوں کی داستان آپ کو سُناؤں۔ یہ یادداشت اِس لیے بھی ایک خاص اہمیت رکھتی ہے کہ اس میں ضمناً اُن ادیبوں کا ذکر آجائے گا جن کے ادبی کارناموں کی درخشانی سے ہمارے ملک کی قومی، مجلسی اور ثقافتی تاریخ کے اوراق منوّر ہیں اور جن کی تحریریں ہماری پرانی تہذیب کے اِمتیازی آثار ہیں۔

مغل عظمت کے دَورۂ اقبال میں جہاں مغل شہنشاہوں کے درباری، فتوحاتِ ممالک میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے تھے، وہاں علم و ادب کی سرپرستی کے باب میں بھی ان

کی دل بستگی ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کے لیے مشہور تھی ۔ یہ خود بھی ادب کی مختلف اصناف میں بڑا کمال رکھتے تھے اور ادیبوں اور شاعروں کی سرپرستی اس درجہ کرتے تھے کہ دور دراز کے صاحبانِ فن ان کی ادبی محفلوں میں کھنچے چلے آتے تھے ۔ خان خانانِ اعظم بیرم خاں اور ان کے نامور بیٹے عبدالرحیم خان خاناں اور پھر شیخ مبارک اور ان کے دونوں بلند اقبال بیٹے فیضی اور ابوالفضل اور ان کے زمانے کے بعد خود شہنشاہ جہانگیر اور پادشاہ بیگم نورجہاں کے بھائی وزیر الممالک اعتماد الدولہ آصف خان کے ادبی مشاغل ان کی سیاسی مصروفیات سے کسی طرح بھی کم اہمیت نہیں رکھتے ۔ علم و ہنر کی اِس سرپرستی کا نتیجہ یہ ہُوا کہ فارسی ادب کے خزانے ابوالفضل اور ملا ظہوری کی انشا اور فیضی اور عُرفی کے قصائد سے مالا مال ہو گئے ۔ یہی حالت مغلوں کے عہدِ حکومت میں ان مختلف صوبوں کی تھی، جو مغل سلطنت کے زیرِ نگیں تھے ۔ ہر صوبے دار شام کے وقت اپنے دولت کدے میں ایک ادبی محفل سجاتا اور شعر و سخن کا دربار لگاتا ۔ خود بھی اپنا کلام سُناتا اور دوسروں کے شعر و سخن سے بھی لطف اندوز ہوتا ۔ مقصدِ بیان یہ ہے کہ ادب اور شعر حکومت کی سرپرستی کے بغیر محض ایک ذاتی مشغلہ ہوتا ہے اور امرا کی قدر شناسی کے بغیر اسے کوئی قومی یا مجلسی حیثیت حاصل نہیں ہو سکتی، مگر یاد رکھنا چاہیے کہ شعر اور ادب جب قدر ناشناس امرا کی چوکھٹوں پر دریوزہ گری کرنے لگتا ہے تو وہ اس وقار اور شرف سے محروم ہو جاتا ہے جو اس کی تخلیق کا مقصود اور اس کے ارتقا اور نشو و نما کا ضامن اور کفیل ہے ۔

صائب دو چیز می شکند قدرِ شعر را
تحسین ناشناس و سکوتِ سخن شناس

یہ سلسلہ مغلوں کے آخری تاج دار ابوظفر بہادر شاہ کے زمانے تک جاری رہا ۔ جب ہزاروں سیاسی کشمکشوں کے باوجود بادشاہ اور شاہ زادے اپنی اپنی ادبی محفلوں میں بہ نفسِ نفیس حصّہ لیتے اور شعر و سخن کی داد دیتے ۔ دلّی اجڑ گئی، مگر ذوق اور غالب کی سخن آرائیاں دل دادگانِ ادب کے ذہن میں محفوظ ہیں ۔

تاج دارِ اودھ واجد علی شاہ کے زمانے میں بادشاہ کی قدر شناسی ہی نے انیس اور دبیر جیسے معجز نگار شعرا پیدا کیے اور یہ بات کسی قدر وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اگر لکھنؤ کی ادبی محفلوں میں انیسؔ اور دبیرؔ کو اُن کے کلام کی داد نہ ملتی تو دنیائے ادب ان کے اشعار کے قیمتی ذخائر سے محروم رہ جاتی ۔

جب فلکِ کج رفتار کی گردش نے دہلی اور لکھنؤ کی ادب نواز حکومتوں کی بساط اُلٹ دی

تو ان اجڑے دیار کے ادیب اور شعرا ہندوستان کے مختلف حصّوں میں جا بسے - اور کلکتے، حیدر آباد، رامپور اور لاہور کی ادبی محفلیں آباد ہو گئیں -
مگر مجھے تو لاہور کی ادبی مجلسوں کا ذکر کرنا ہے - یہ بیان تو محض کنایتہً تھا - یہاں میں اگر یہ ذکر بھی کر دوں تو بے جا نہ ہوگا کہ اگرچہ مہاراجہ رنجیت سنگھ خود رسمی علوم سے بہرہ مند نہ تھے لیکن ہنر پروری اور ادب نوازی میں بڑی شہرت رکھتے تھے - بسا اوقات وہ بھی اپنے دربار میں شعر و سخن کی محفل سجاتے اور دادِ سخن دیتے - فقیر شمس الدین شمس، فقیر عزیز الدین آزاد، راجہ دھیان سنگھ اور بھائی وستی رام ان محفلوں میں حصّہ لیتے اور اپنے فارسی اشعار کی داد اس پنجابی حکمراں سے موتیوں کے ہاروں اور سونے کے کنگنوں کی صورت میں پاتے - مغل دربار کے درباریوں کی تقلید میں لاہور میں بھی خالصہ دربار کے درباری شعر و سخن کی محفلیں منعقد کرتے تھے، جن میں شریک ہو کر وہ خود بھی لطف اندوز ہوتے تھے اور دوسروں کے دل میں بھی شعر و سخن کا شوق پیدا کرتے تھے - خالصہ حکومت کی تباہی کے بعد جب انگریزوں نے پنجاب کی زمامِ حکومت سنبھالی تو اس وقت کے حاکموں میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو علم و ادب سے شغف رکھتے تھے اور ان کی سیاسی مصلحت بھی یہی تھی کہ پنجاب کے لوگ سیاسی الجھنوں سے نکل کر ایسی مصروفیات میں محو ہو جائیں جن سے انگریزی حکومت کے استحکام کی راہ میں کوئی سیاسی تحریک حائل نہ ہو - چنانچہ ۱۸۴۹ شمسی کے بعد یہ دستور ہو گیا کہ شہر لاہور کی فصیل کے باہر جو باغ تھے ان میں ہر جمعہ کے دن ایک میلہ سا لگ جاتا جہاں لاہور کے باشندے لہو و لعب کے اور مشغلوں سے دل بہلانے کے علاوہ شعر اور ادب کی ان محفلوں میں بھی شریک ہوتے جو شہر کے امرا ان باغوں میں سجاتے تھے -
۱۸۵۷ش کے ہنگامے میں جب دلّی لٹی اور شعر و سخن کے چمن پر خزاں کا دور دورہ ہوا تو پنجاب میں اردو کے گلشن میں بہار آ گئی - یہی وہ زمانہ ہے جب انگریزوں نے ایک بڑی سیاسی حکمتِ عملی کے تحت اردو زبان کی سرپرستی شروع کی، تاکہ جس قدر جلد ممکن ہو سکے اردو سرکاری زبان کی حیثیت سے فارسی کی جگہ حاصل کر لے - اِس صورتِ حال کا بھی ایک پس منظر ہے جس کا بیان بے محل نہ ہوگا -
ہندوستان کے تعلیمی نظام کو مرتب کرنے کے لیے کمپنی کی حکومت نے ۱۸۳۵ شمسی میں ایک تعلیمی کمیشن مقرر کیا جس کے صدر لارڈ میکالے تھے - طویل بحث و تمحیص اور غور و فکر کے بعد کمیشن کے ارکان ذریعۂ تعلیم کے مسئلے پر دو برابر گروہوں تقسیم ہو گئے - ایک گروہ کی تو یہ رائے تھی کہ ملکِ ہندوستان کے باشندوں کو ان کی دیسی زبانوں میں تعلیم دی جائے اور

دوسرے گروہ کی یہ رائے تھی کہ ذریعۂ تعلیم انگریزی زبان ہو۔ لارڈ میکالے نے یہ کہہ کر کہ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ دنیا اس وقت جب ہم اس ملک سے چلے جائیں، یہ نہ کہے کہ انگریز قوم نے اپنی ہندستانی رعایا کو انسانیت کے درجے پر نہ پہنچایا اور ترقی کے مدارج طے کرنے کے قابل نہ بنایا تو یقیناً ہم پر لازم ہے کہ ہم انگریزی زبان ہی کو ذریعۂ تعلیم بنائیں، اپنا صدارتی ووٹ دوسرے گروہ کے حق میں دے دیا۔ اس طرح اس برِصغیر کا تعلیمی نظام مرتب کیا گیا کہ علومِ جدیدہ تو درکنار عربی، فارسی اور سنسکرت کی تعلیم کا ذریعہ بھی انگریزی زبان بن گئی۔ تاہم بعض انگریز ایسے بھی تھے جو ہندستانی علوم و فنون کی سرپرستی کا درجہ نظم و نسقِ حکومت کی مصلحتوں کے درجے سے کچھ کم نہیں سمجھتے تھے۔ اس قسم کے انگریز زبانِ انگریزی کی اشاعت کے ساتھ ساتھ ہندستان کی دیسی زبانوں کی سرپرستی بھی ضروری سمجھتے تھے۔ انھیں کی بدولت مشرقی علوم نیست و نابود ہونے سے بچ گئے اور انھیں لوگوں کی توجہ اور کوشش سے اردو زبان کے احیا اور بقا کی صورت پیدا ہو گئی۔ ایسے ہی لوگوں میں ایک بزرگ ڈاکٹر لائٹنر بھی تھے، جن کی کوششوں کی بدولت ۱۸۶۵ء میں "انجمن پنجاب" کی داغ بیل پڑی اور اردو کا باغ پھول پھل لایا۔

اُس وقت پنجاب میں اردو شاعری ابھی طفولیت کے عالم میں تھی۔ اس کے بعد جب مرزا ارشد گورگانی، میر فیض الحسن اور سید ناظر حسین ناظم لاہور میں آکر مقیم ہوئے تو پنجاب کے دارالحکومت میں شاعری کا اچھا خاصا چرچا ہو گیا۔ مولوی محمد حسین آزاد اور مولانا حالی انھیں ایام میں اردو شاعری کو ایک نئی روش پر چلانے کی کوشش میں مصروف تھے۔

۱۸۹۰ء میں میرے والد حکیم شجاع الدین نے اردو زبان کی روز افزوں ہر دل عزیزی سے متاثر ہو کر ایک اردو بزمِ مشاعرہ کی بنیاد ڈالی۔ "شورِ محشر" اسی بزمِ مشاعرہ کا آرگن تھا۔ یہ مشاعرہ ہر ہفتے ہمارے مکان پر منعقد ہوتا تھا۔ اس رسالے کے ایڈیٹر خان احمد حسین خاں تھے، جن کی شہرت ایک ناولسٹ ادیب اور شاعر کی حیثیت سے محتاجِ تعارف نہیں۔

سر محمد اقبال نے، جو اس زمانے میں گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھتے تھے، اپنی وہ غزل اسی مشاعرے میں پڑھی، جس کا یہ شعر اب تک پرانے لوگوں کی زبان پر جاری ہے ؎

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

جب تک میرے والد زندہ رہے یہ بزمِ مشاعرہ قائم رہی۔ مرزا ارشد گورگانی دلّی اسکول کے پیرو تھے اور میر ناظر حسین ناظم لکھنؤ کی زبان کے دلدادہ۔ دونوں کی ٹولیاں جب اس بزمِ مشاعرہ میں اپنا اپنا رنگ جمانے کے لیے مصروفِ غزل خوانی ہوتی تھیں تو لوگوں کی آنکھوں کے سامنے انیس اور دبیر کی رقابت کا نقشہ کھنچ جاتا تھا۔ لطف یہ ہے کہ اس زمانے میں بھی پنجاب کے شعرا میر اور میرزا ہی کے زیرِ قیادت میدانِ سخن طرازی میں ایک دوسرے سے مصروفِ پیکار رہتے تھے۔ بہرحال اِس بزم کی رونق اِسی ہنگامے پر موقوف تھی اور جب تک یہ ہنگامہ رہا "شورِ محشر" قیامت برپا کرتا رہا۔

۱۸۹۶ء کے آخر میں میرے والد ماجد نے اِس جہانِ فانی سے رحلت کی۔ میرے بھائی حکیم امین الدین نے میرے دوسرے بھائی حکیم شہباز الدین کے ساتھ مل کر "شورِ محشر" کو جاری رکھنے کی کوشش کی، مگر جو بات ایک دفعہ بگڑ چکی تھی نہ بنی اور جذبِ صادق کی وہ کشش جو بزرگوں کی شفقت میں تھی نوجوانوں کی ہمت کو نصیب نہ ہوئی، لیکن ایک بات ضرور ہوئی، وہ صاحبانِ ذوق جنھیں اِس بزمِ مشاعرہ میں شریک ہو کر ایک دوسرے کی صحبت سے لطف اندوز ہونے کی کچھ عادت سی ہو گئی تھی۔ اب ہر روز ہمارے مکان پر جمع ہو جاتے تھے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ ان اربابِ علم و ادب کی دید کے شائق دور دور سے ہمارے ہی مکان پر آتے اور ان کی صحبت سے اکتسابِ شرف کرتے۔

سر عبدالقادر، سر محمد اقبال، سر شہاب الدین، خواجہ رحیم بخش، خواجہ کریم بخش، خواجہ امیر بخش خلیفہ نظام الدین، شیخ گلاب دین، مولوی احمد دین، مولوی محمد حسن جالندھری، منشی عبداللہ ٹونکی اور سید محمد شاہ وکیل ان لوگوں میں سے تھے جو قریب قریب ہر روز شام کو اس دیوان خانے میں جمع ہو جاتے۔ ان لوگوں میں کچھ بزرگ تو ایسے ہیں جو بعد میں اس قدر مشہور ہوئے کہ ان کے کمالات کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ مگر آپ حضرات کی واقفیت کی توسیع کے لیے شاید یہ بتا دینا ضروری ہے کہ مولوی احمد دین "سرگزشتِ الفاظ" کے نامور مصنف ہیں اور شیخ گلاب دین "قانون شریعت و رواج" کے مشہور مؤلف۔ خواجہ رحیم بخش، خواجہ کریم بخش، خواجہ امیر بخش، سید محمد شاہ وکیل اور خلیفہ نظام الدین اگرچہ اپنی عزلت گزینی کے باعث منظرِ عام پر نہ آئے، مگر وہ اس مجلس کی روح و رواں تھے۔ ان کی جراتِ تنقید اور جوہر شناسی نے اس زمانے کے نوجوان ادیبوں اور شاعروں کی تربیت میں وہ حصہ لیا جو اُن کے اپنے جوہرِ کمال کے مقتضیاتِ ارتقا سے کسی طرح کم نہیں۔ اس زمانے میں سر محمد اقبال جب تک اپنا کلام پہلے ان بزرگوں کو سُنا نہ لیتے تھے، اسے کسی مجلسِ عام میں

نہ پڑھتے تھے۔ "نالۂ یتیم"، "ہلالِ عید"، "تصویرِ درد" اور "شمع و شاعر" کی سی مشہور و معروف نظمیں اقبال نے پہلے انھیں لوگوں کے سامنے پڑھیں اور پھر انھیں انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسوں میں پڑھ کر جہانِ اسلام سے خراجِ تحسین و عقیدت وصول کیا۔ مولوی محمد حسن، جن کا وطن مالوف جالندھر ہے، پنجاب کے قریب قریب ہر شریف گھرانے کی نظر میں قابلِ احترام اور محبوب بزرگ تھے۔ ان کی باتیں درسِ اخلاق تھیں اور ان کی سیرت محاسنِ اسلامی کا آئینہ۔ اِس مجلس میں جو اسلامی رنگ نظر آتا تھا وہ انھیں کے اوصاف و اطوار کا پرتو تھا۔

مفتی عبداللہ ٹونکی اورینٹل کالج لاہور میں عربی کے پروفیسر تھے اور فقۂ اسلامی کے بہت بڑے عالم۔ اسلامی قانون اور شرعی تنازعات میں ان کا فتویٰ ناقابلِ تردید سند تھا۔ وہ بہت کم بولتے تھے لیکن جو کچھ ان کی زبان سے نکلتا تھا، برہانِ قاطع کا حکم رکھتا تھا۔ میں نے جو کچھ مدرسے میں پڑھا اس سے بہت زیادہ ان بزرگوں کی صحبت سے سیکھا۔ علم و دانش کے جو موتی میں نے کتابوں سے جمع کیے ان سے بہت زیادہ درخشاں اور آبدار جواہر میں نے ان لوگوں کی زبان سے لوٹے۔

اس زمانے میں اس ادبی محفل کی تقلید میں شعر و سخن کی کئی محفلیں معرضِ وجود میں آئیں۔ مرزا اعظم بیگ، جو لاہور کے ایک مقتدر رئیس تھے، ان کی حویلی بھی بازار حکیماں میں واقع تھی۔ ان کے بیٹے مرزا اسلم بیگ کو شعر و شاعری کا ذوقِ وافر تھا اور وہ میر ناظر حسین ناظم کے تلامذہ میں ایک ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ باپ کی وفات کے بعد اس قدر زیادہ دولت ان کے ہاتھ آئی کہ وہ لکھ لُٹ مشہور ہو گئے۔ اس لوٹ میں ان کے ذوقِ سخن کو بھی کافی مالِ غنیمت ملا۔ انھوں نے اپنی حویلی میں ایک محفلِ مشاعرہ قائم کی جس کے میرِ مشاعرہ ان کے استاد میر ناظر حسین ناظم تھے۔ اس بزم میں زیادہ تر میر صاحب موصوف کے شاگرد ہی اپنا کلام پڑھتے اور اپنے استاد سے دادِ سخن پاتے۔

اس بزمِ مشاعرہ کے سیکرٹری صوبے دار گوبند گڑھ فقیر امام الدین کے پوتے فقیر سعید الدین تھے، جو میر ناظم ہی کے شاگرد تھے اور بہت صاف شعر کہتے تھے۔ شاید اس ناقدری کے زمانے میں یہ بیان کر دینا موجبِ تعجب ہو کہ مرزا اسلم بیگ نے اپنے استاد میر ناظر حسین ناظم کے دولت کدے کو حقیقت میں دولت کدہ بنا دیا تھا۔ مرزا اسلم بیگ کی وفات کے ساتھ ہی یہ محفل بھی سُونی ہو گئی اور اب یہ اکھاڑہ میاں سراج الدین کی حویلی "ریاض منزل" میں جمنے لگا۔ کشمیری بازار کے عقب میں ایک محلہ ہے جسے کوٹھی داردں

کا کوچہ کہتے ہیں۔ "ریاض منزل" اسی کوچے میں واقع ہے۔ اگرچہ اس محفل کے کارفرما بھی میر ناظر حسین ناظم ہی تھے لیکن اس کا نقشہ مرزا اسلم بیگ کی محفلِ شعر و سخن سے جداگانہ تھا۔ اس میں حکیم بہادر شاہ، سید سردار حسین، میر حسین علی اور حکیم فقیر محمد بڑی نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اقبال اور ان بزرگوں کی محفل، جن کے نام میں نے ابھی ابھی گنوائے ہیں بازار حکیماں میں ہی جمتی تھی اور اس محفل کا مذاق دوسری محفلوں کے مذاق سے کچھ الگ تھا۔ یہاں ادبی مشاغل کا چرچا تھا اور دوسری محفلوں میں وہی کاکل و زلف کا سلسلہ تھا۔

۱۹۱۲ء میں جب نواب ذوالفقار علی خاں پٹیالے سے آکر لاہور میں مقیم ہوئے تو ان کی اقامت گاہ جو "زرافشاں" کے محبوب نام سے موسوم ہے۔ ایک اور ادبی محفل کا مرکز بن گئی۔ اب اقبال کی آمد و رفت بھی اس طرف شروع ہو گئی۔ اس بزم کی شرکت کی مسرتوں سے بہرہ اندوز ہونے کے لیے حضرت گرامی بھی اکثر جالندھر سے لاہور آجاتے۔ جب وہ آتے تو اقبال بالالتزام ہر شام کو "زرافشاں" میں جاتے اور کبھی گرامی سے ان کا کلام سُن کر اور کبھی گرامی کو اپنا کلام سُنا کر ایک دوسرے سے دادِ سخن پاتے۔ اسی زمانے میں نواب ذوالفقار علی خاں نے "A VOICE FROM THE EAST" لکھ کر اقبال کو یورپ میں پہلے سے زیادہ متعارف کیا۔ اب اقبال کا شہرہ عام تھا اور اس کے قدردانوں کا حلقہ روز بروز وسیع ہوتا چلا جاتا تھا۔ لاہور کی ایک مشہور مغنیہ انوربائی نے اقبال کی غزلیں گا کر لوگوں کے دل موہ لیے تھے۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ اقبال نے بھی انوربائی کی زبان سے اپنی کسی غزل کو سننے کی خواہش ظاہر کی۔ مرزا جلال الدین جو اس محفل کی رُوحِ رواں تھے، اقبال کے منہ سے یہ بات سن کر پھڑک اٹھے اور دوسری ہی شب کو ان کے دولت کدے پر ایک محفلِ رقص و سُرود کا اہتمام ہو گیا۔ میں بھی اس محفل میں شامل تھا۔ جب انوربائی نے اقبال کا یہ شعر

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

اپنی سُریلی آواز اور ترنت کے ساتھ گایا تو اوروں کا تو کیا ذکر خود اقبال پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔

اب ہر قابلِ ذکر پرستارِ شعر و سخن امیر کو یہی آرزو تھی کہ اقبال کبھی کبھی ان کی محفل کی زینت بڑھائے اور اپنا کلام اپنی زبانی سُنائے۔ فقیر افتخار الدین جو کابل کی سفارت کے بعد لاہور میں مقیم ہو گئے تھے، نواب امام الدین خاں صوبے دار کشمیر کے بھتیجے میاں نصیر الدین

خان بہادر، شیخوپورہ کے راجہ ہربنس سنگھ، ریاست پٹیالہ کے وزیر سردار جوگندر سنگھ، لاہور کے نامور رئیس راجہ نریندرا ناتھ، امرتسر کے مشہور جاگیردار سردار سُندر سنگھ مجیٹھیہ اور بارود خانے والے میاں شمس الدین اور میاں نظام الدین اس سلسلے میں بہت پیش پیش تھے، مگر جو محفلیں ان لوگوں کے گھروں پر منعقد ہوتیں، انھیں ادبی محفلیں کہنا کچھ زیادہ موزوں نہ ہوگا۔ وہ تو اقبال کی بزم آرائی کی تقریب ہوتی تھی، جس میں اقبال اپنا کلام سُناتا اور دادِ سخن پاتا۔ اس سخن میں اقبال کے ایک خاموش اور جلیل القدر مدّاح کا نام نامی بھی زینتِ بیان ہو جائے تو باعثِ سعادت ہے۔ میاں محمد شاہ دین، جو خود بھی شاعر تھے، کبھی کبھی اقبال کو اپنے دولت کدے پر آنے کی دعوت دیتے اور ان کا کلام سنتے۔ ہاں میاں محمد شفیع کی محفل کا رنگ کچھ اور ہی تھا۔ جب وہ اقبال کو اپنے گھر بلاتے تو یہ دعوت اقبال کی ذات ہی تک محدود نہ ہوتی۔ شاید ہی علم و ادب کا کوئی دل دادہ ہو جو وہاں موجود نہ ہوتا ہو۔

لاہور کی ادبی محفلوں کا بیان تشنۂ تکمیل رہ جائے گا، اگر ان ادبی تحریکوں کا ذکر نہ کیا جائے جن کے باعث ایک مختلف قسم کی ادبی محفلوں کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ جب سر عبدالقادر نے "مخزن" رسالہ شائع کیا تو یہ ایک ایسا خوانِ نعمت تھا جس کے اردگرد اس زمانے کے تمام ممتاز ادیب جمع ہو گئے۔ چودھری خوشی محمد ناظر، مرزا اعجاز حسین، میر غلام بھیک نیرنگ، عبدالرشید چشتی، شیخ محمد اکرام اور تلوک چند محروم "بزمِ مخزن" کے مستقل رکن تھے۔ یہ بزم اپنی نوعیت کے اعتبار سے ان تمام محفلوں سے اِس لیے الگ تھی کہ اِس میں شعر و شاعری کے علاوہ نثر کی سحر طرازیاں بھی جلوہ گر نظر آتی تھیں۔ اس محفل ہی میں "مخزن" رسالہ ترتیب پاتا اور جو کچھ اِس محفل میں پڑھا جاتا وہ ہر مہینے "مخزن" میں شائع ہو کر تشنگانِ ادب کی پیاس بجھاتا۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک شیخ عبدالقادر رونقِ محفل بنے رہے۔ اس کے بعد اسی قسم کی ایک دوسری محفلِ ادب اُس وقت قائم ہوئی جب میں نے ۱۹۱۹ء میں "ہزار داستان" رسالہ شائع کیا۔ احمد شاہ بخاری پطرس، سیّد عابد علی عابد، سیّد امتیاز علی تاج، مسٹر ہادی حسن، مولانا سُہا، میر صولت، بیدل شاہ جہان پوری، عبدالمجید سالک، پنڈت سدرشن اور اختر شیرانی اس فضائے ادب کے روشن ستارے تھے۔ "ہزار داستان" بھی "مخزن" ہی کی طرح انھی کی صحبت میں ترتیب پاتا اور مہینے میں دو مرتبہ شائع ہو کر اس کمی کو پورا کرتا، جو مخزن کے بند ہو جانے سے واقع ہو گئی تھی۔ قریب قریب اسی زمانے میں میاں محمد شاہ دین

کے بلند اقبال صاحب زادے میاں بشیر احمد نے ایک موقر ادبی جریدے "ہمایوں" اور حکیم یوسف حسن نے ایک مقبول عام رسالے "نیرنگ خیال" کی اِشاعت کا اہتمام کیا۔ اس سلسلے میں جو ادبی مرکز قائم ہوئے، ان میں سے اوّل الذکر کا حلقہ بہت محدود تھا اور موخر الذکر کا حلقہ بہت وسیع۔ میاں عبدالعزیز فلک پیما کے دم قدم سے بزم ہمایوں کی زینت تھی اور میاں محمد اسلم کی ذاتِ گرامی سے "نیرنگِ خیال" کی رونق۔

اِس سلسلے میں جن محفلوں کا میں نے ذکر کیا ہے، وہ ایک قسم کی خصوصی محفلیں تھیں جب قرعۂ فال مولانا تاجور نجیب آبادی کے نام پڑا تو انھوں نے ان محفلوں کو ایک عمومی رنگ دے دیا اور اب یہ محفلیں ایس۔ پی۔ ایس کے ہال میں منعقد ہونے لگیں۔ اس کی رکنیت عام تھی اور اس محفل کے دروازے کسی پر بند نہ تھے۔ وہ تمام ادیب اور شاعر جن کے نام میں نے ابھی لیے ہیں اس میں جمع ہو گئے۔ اب حفیظ جالندھری کی شاعری کی شہرت بھی اَوجِ رفعت تک پہنچ چکی تھی۔ اس محفل میں کبھی کبھی وہ بھی آتے اور اپنا کلام سُناتے۔ یہ عجیب بدقسمتی ہے کہ جب کوئی محفل عام ہو جائے تو اس کے اراکین کے باہمی تعلقات میں وہ خصوصیت نہیں رہتی جو اُن محفلوں کے اراکین کے تعلقات میں ہوتی ہے جن کا حلقہ محدُود ہو۔ یہ محفل بھی آخر اسی باہمی رقابت کی نذر ہو گئی۔

لیکن مولانا تاجور کا یہ اِحسان اُردو زبان پر ہے کہ انھوں نے ایک طویل مدت تک مختلف رسالے شائع کر کے اور جگہ جگہ پر مشاعروں کی مجالس قائم کر کے نہ صرف اُردو کی ہردلعزیزی کا سامان بہم پہنچایا، بلکہ شعر و ادب کے ذوق کو نہایت ہی سیدھی راہ پر ڈال کر اردو زبان کی تہذیب و ترویج کے باب میں وہی کام کیا جو اُن سے پہلے سر عبدالقادر کر چکے تھے۔

اسی زمانے میں مولانا تاجور کی اِس مقبولِ عام تحریک کی تقلید میں پنجاب لٹریری لیگ کی داغ بیل ڈالی گئی۔ اگرچہ مولانا تاجور ہندوؤں اور مسلمانوں میں یکساں مقبول تھے لیکن پنجاب لٹریری لیگ کے کارفرماؤں نے اس سوسائٹی کو ایک بین الاقوامی صورت دے دی اور اس کے سرپرستوں میں ہر قسم کے ادب نواز اور سخن فہم امراء و روٴسا شامل ہو گئے۔ خوبیٔ تقدیر سے اس سوسائٹی کے اجلاس نے ایسی اہمیت اور وقعت پائی کہ اس میں وقتاً فوقتاً سر عبدالقادر، سر محمد اقبال، سر ذوالفقار علی خاں، راجہ نریندرا ناتھ، سر جوگندر سنگھ، حفیظ جالندھری، میاں بشیر احمد، مولانا سالک، احمد شاہ بخاری پطرس، چراغ حسن حسرت، صُوفی غلام مصطفےٰ تبسم غرض کس کس کا نام گنوایا جائے۔ ہر دل دادۂ ادب نے حصّہ لیا اور اس سوسائٹی کا رنگ ایسا جما کہ اور سب ادبی محفلوں

کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔

یہ بڑی نا احسان مندی ہو گی اگر میں اِس سلسلے میں اردو کے اُس محسنِ اعظم کا ذکر نہ کروں، جو ظفر علی خاں کے محبوب نام سے موسوم ہے اور جس نے اپنے جریدہ فریدہ "زمیندار" اور "پنجاب ریویو" کی وساطت سے ایک طرف، اور اپنے ذاتی رشحاتِ قلم سے دوسری طرف اردو زبان کو ایک چمنستان جاوداں بہار بنا دیا۔ ساٹھ برس تک لاہور میں کوئی بھی ادبی محفل ایسی نہ تھی جو ان کے فیضِ جاری سے پھولی پھلی نہ ہو، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو زیادہ موزوں ہو گا کہ ظفر علی خاں کی شخصیت ایسی دل کش تھی اور ان کا ذوقِ ادب اتنا رنگین تھا کہ وہ جس جگہ بھی بیٹھے وہیں ایک محفلِ ادب سج گئی۔

لاہور کی پرانی ادبی محفلوں کی داستان یہاں ختم ہوتی ہے۔ اِس کے بعد جو ادبی محفلیں قائم ہوئیں ان کا تعلق دَورِ جدید سے ہے جو اِس مضمون کا موضوع نہیں، لیکن میں اس حکایتِ لطیف کو یہ کہے بغیر ختم نہیں کر سکتا کہ دورِ حاضر میں اردو زبان پر جو احسان مولانا غلام رسول مہر اور مولانا صلاح الدین احمد کا ہے وہ ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے اور اس کا بیان ایک لمبی تفصیل چاہتا ہے۔ جو کام سر عبدالقادر، مولانا ظفر علی خاں اور مولانا تاجور نے اپنے اپنے دَور میں کیا، اس کا سلسلہ دیر تک انھیں دو نامور ادیبوں کے دم قدم سے جاری رہا۔

میں اِس جگہ اپنی اس دلی آرزو کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ عہدِ حاضر کے معزز امرا، رؤسا اور وہ بلند مرتبت عمائدِ حکومت جو مناصبِ جلیلہ پر فائز ہیں مغل دربار کے ادب نواز درباریوں اور امرا کی طرح وقتاً فوقتاً اپنے اپنے دولت کدوں میں ادبی محفلوں کے انعقاد کا اہتمام کیا کریں اور ادیبوں اور شاعروں کی دل نوازی اور سرپرستی کو بھی ایک قومی اور منصبی فرض سمجھیں، اِس لیے کہ ادب اُمرا کی سرپرستی ہی سے پروان چڑھتا ہے اور سخن طرازی کے چمن میں حکومت کے ابرِ کرم ہی سے بہار آتی ہے۔ اِس باب میں "شامِ ہمدرد" کی تقریب ایک خوش آیند فال ہے اور حکیم محمد سعید صاحب دہلوی کے ذوقِ شعر و سخن اور شوقِ سرپرستیٔ ادب کی ایک روشن دلیل ——— خدا کرے یہ ماہانہ محفل پاکستان میں اُردو زبان کی مقبولیت کا ذریعہ اور ہمارے وطن کی مجلسی اور ثقافتی ترقی کا وسیلہ بن جائے۔

میں آخر میں حکیم محمد سعید صاحب اور ان کے ثمر کائے کار کی خدمت میں ان کے اِس احسان کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ ان کی مہمان نوازی کی بدولت مجھے یہ

سعادت نصیب ہوئی کہ آپ کو لاہور کی پرانی مجلسوں کے چند ایسے کوائف سے روشناس کر دوں جن کی یاد اب ایک قصۂ پارینہ ہو گئی ہے۔

گاہے گاہے باز خواں ایں دفترِ پارینہ را
تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را

شامِ ہمدرد - لاہور
۵ر نومبر ۱۹۶۴ء شمسی

محمد ولی اللہ خاں

۱۰ ستمبر ۱۹۰۵ء

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا عقیدت مند ایک خاندانِ حکما شاہجہانپور میں بستا تھا۔ آج کے مہمان مقرر جناب محمد ولی اللہ خاں صاحب اسی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے والد جناب حکیم اللہ خاں صاحب اور دادا جناب امیر اللہ خاں صاحب اپنے زمانے کے اچھے طبیب شمار ہوتے تھے اور مریضوں کی بے لوث خدمت کرتے تھے۔ فاتحان یعنی پٹھان کی بستی شاہ جہاں پور خاندانِ اطبا کے جدِ امجد جناب عباس خاں صاحب نے بہ عہدِ شاہجہاں بسائی تھی۔ اس کا تذکرہ عالمگیری میں ملتا ہے۔ جناب عباس خاں شاہجہاں اورنگ زیب کے زمانۂ حکومت میں بعہدۂ دیوان سرفراز رہے۔

جناب ولی اللہ خاں ۱۹۲۸ء سے آج تک محکمہ ہائے آثارِ قدیمہ سے متعلق رہے ہیں۔ قدیم تاریخی عمارتوں کے حفظ و بقا سے ان کی دلچسپی اور اِن کا شغف مانا ہوا ہے۔ انھوں نے بدھ، ہندو اور اسلامی دور کی عمارتوں کی مرمت میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ شاہی قلعہ، شالامار باغ، مقبرہ جہانگیر اور مقبرۂ نورجہاں کی موجودہ مرمت اور آرائش ولی اللہ خاں صاحب ہی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے مغربی پاکستان کے اکثر آثارِ قدیمہ کی مرمت میں ان کا حصہ ہے۔ اس عشقِ قدامت ان میں وہ فنی مہارت پیدا کر دی ہے، جسے انفرادیت کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔

تکمیلِ فن کے لیے آپ نے دوسرے ممالک کے آثارِ قدیمہ کا جائزہ بھی لیا ہے۔ انٹرنیشنل کانگریس آف آرکی ٹیکس اینڈ ٹیکنیشنز آف ہسٹاریکل مونومنٹس میں حصہ لیا اور فرانس، انگلستان، اسپین، یونان، ترکی، مصر، لبنان، اُردن، شام، عراق و ایران جا کر فنِ تعمیر اور فن تحفظِ آثارِ قدیمہ کو سمجھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس باب میں ان کی رائے وقیع ہے۔

اُن مضامین کے علاوہ کہ جو اخبارات کے لیے لکھے گئے جناب ولی اللہ خاں صاحب نے چند کتابیں بھی لکھی ہیں۔ مثلاً:

۱۔ ایری سی ایشن آف ڈفرنٹ کلچرس اینڈ سولائزیشن۔
۲۔ لاہور اینڈ اِٹس اِمپورٹنٹ مونیومنٹس۔



محمد ولی اللہ خاں

[شام ہمدرد لاہور ، ۳ دسمبر ۱۹۶٤ شمسی]

۴۔ سکھ شیر آنس ان ویسٹ پاکستان۔
مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ مہمان مقرر لاہور امپروومنٹ ٹرسٹ، پاکستان ڈے میموریل کمیٹی وغیرہ میں رکن کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔ صاحبان! یہ وہ ادارے ہیں جو آج ایسی عمارتیں بنائینگے کہ جو کل پاکستان کی تاریخ بن جائیں گی اور کبھی ایسا بھی وقت آئے گا کہ ان کا شمار آثار قدیمہ میں ہوگا، اور اس وقت کے لوگ اور ماہرین آثارِ قدیمہ ہمارے بارے میں کوئی رائے قائم کریں گے۔ اسی انداز پر غور کرنے سے یہ سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ ان اداروں کے فرائض کس قدر نزاکت کے حامل ہیں۔ میں مثال کے طور پر کہتا ہوں کہ پاکستان ڈے میموریل کمیٹی نے اقبال پارک میں اگر ایک مینارہ بنا کر کھڑا کر دیا تو اس کی حیثیت کیا ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ ایک پارک بھی بنا دیں جہاں بیٹھ کر چند لوگ ہنس بول لیں گے۔ بچے کھیل لیں گے اور تیل مالش کرنے والے بھی وہاں پہنچ ہی جائیں گے وغیرہ۔ لیکن غور کرنے کی بات یہ ہے کہ کیا صرف اس قدر کر کے ہم اپنے فرض سے سبک دوش ہو جائیں گے؟ مجھے بتائیے کہ ایسا کرنے سے آج کی نسل کو کیا فائدہ ہوگا جس پر کل کی تعمیر کی ذمے داری ہے؟

میں یہ رائے رکھتا ہوں کہ یہاں ہمیں اپنا ہسٹاریکل میوزیم بنانا چاہیے اور برِصغیر کے مسلمانوں کی پوری جنگِ آزادی کی تاریخ دہرانی چاہیے۔ بات دَورِ مغلیہ سے شروع کرنی چاہیے اور ۱۸۵۷ء کے غدرِ دہلی کی لرزہ خیز داستانیں مصوّر کر دینی چاہییں اور جب سے اب [illegible] یعنی پاکستان بننے تک کے سارے حالات کی مکمل تاریخ بلا تعصب اس میوزیم میں دہرا دینی چاہیے، تاکہ آج کی نسل اپنی تاریخ و تحریکِ آزادی کے خط و خال دیکھ کر اور سمجھ کر اس کی قدر کرنا جان سکے اور اس روشنی میں تعمیرِ پاکستان میں منہمک ہو سکے۔

محمد سعید

لاہور اور اس کے آثارِ قدیمہ

جناب محمد ولی اللہ خاں صاحب

آغاز لاہور : یوں تو لاہور کی دل چسپیاں گوناگوں ہیں، مگر یہاں کے آثارِ قدیمہ بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ایک طرف تو یہ ہمارے عروجِ رفتہ اور فنِ تعمیر کے کمال کی گزشتہ ایک ہزار سال کی تاریخ کے کھلے اوراق ہیں اور دوسری طرف آئینۂ عبرت بھی۔ اگر ایک طرف شاہی قلعے کے شیش محل کی شاہانہ زینت، نو لکھے کی نازک ترین اور نیم قیمتی پتھروں سے کی ہوئی پرچیں کاری، دیوانِ خاص کی مرمریں جھلک، مسجد وزیر خاں کی زنگار رنگ کاشی کاری اور حیران کن نقاشی، مقبرہ جہانگیر کی جاذبِ نظر گلکاری اور شفاف زنگار رنگ مرمریں فرش کی گرہ بندی اور شالامار کے حوضوں اور فواروں کے دل کش مناظر، نہروں کی روانی، مرمریں جھرنوں کی آب شاری اور بادشاہی مسجد کی شاہانہ رفعت و وسعت ہمارے لیے باعثِ فخر ہیں تو دوسری طرف آصف خاں، علی مراد خاں، نورجہاں بیگم اور وفا شعار نادرہ بیگم اہلیہ دارا شکوہ اور دیگر مقبروں اور باغات کی بربادی خون کے آنسو رلاتی ہے۔ یہاں کیا نہیں ہے۔ قلعہ، شاہی محل، خوب صورت اور رفیع الشان مساجد، عالی شان مینار، خوب صورت باغات اور ان کے دروازے، شاہی حمام، پرانی حویلیاں، کوس مینار سب ہی قسم کے آثار موجود ہیں۔

لاہور کی تاریخ ۱۰۲۱ شمسی سے قبل جس سال اسے محمود غزنوی نے فتح کر کے پھر سے تعمیر کیا، تاریکی میں ہے۔ سکندر کے مورخین، یونانی سیاح اور مورخین جیسے اسٹرالو، پلائنی،

ٹالمی، چینی سیاح ہیون سانگ، عرب مورخ جیسے البلاذری وغیرہ نے جو کچھ لکھا ہے وہ لاہور کی شناخت کے لیے ناکافی اور غیر یقینی ہے۔ ہندو لٹریچر یعنی پران اور راجپوتوں کے شجروں میں لوہ کوٹ اور لوہ پور دو مقامات کا ذکر آیا ہے، مگر چوں کہ اس نام اور لاہور نام کے ایک سے زیادہ شہر اس برصغیر میں تھے اور موجود ہیں، اِس لیے ان مقامات کی شناخت لاہور سے کرنا غیر تسلی بخش اور مشکوک ہے۔

روایتی طور پر لاہور کے بانی مہاراجہ رام چندر جی کے بڑے لڑکے لوہ کو بتایا جاتا ہے۔ قلعہ لاہور میں لوہ کے نام کا ایک چھوٹا سا مندر بھی موجود ہے (ف-۱) مندر کا موجودہ ڈھچر تو سکھ زمانے کا ہے، اِس لیے کہ جن اینٹوں سے وہ تعمیر ہوا ہے، ان کی ناپ اور ساخت سکھ زمانے کی ہے۔ اِس نام کے مندر کی موجودگی ہی اِس روایت کو تقویت دیتی ہے۔ لفظ لاہور دو لفظوں سے مرکب ہے (لو) اور (آور)۔ آور انہ سنسکرت میں قلعے کو کہتے ہیں اور لَو رامچندر کے بڑے لڑکے کا نام ہے۔ اِس طرح اس کے معنی لَو کے قلعے کے ہوئے۔ تاہم ہو سکتا ہے کہ لو عرفِ عام میں لوہ کا مخفف ہو کر رہ گیا ہو۔ اِس صورت میں اِس کے معنی لوہے کے قلعے یعنی لوہے جیسے مضبوط قلعے کے ہوئے۔ رام چندر جی کا زمانہ اگرچہ اختلافی مسئلہ ہو سکتا ہے، تاہم رامائن کی وجہ سے اس زمانے کا کلاسیکی رزمیہ نظموں کے زمانے کی حدود میں تعین کیا جاتا ہے ا[illegible]ں دَور کو ۸۰۰ سے ۱۲۰۰ قبل مسیح کا زمانہ دیا جاتا ہے۔ آج کل کا رجحان ۸۰۰ قبل مسیح کی طرف ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ لاہور کی ابتدا تقریباً ۸۰۰ قبل مسیح ہوئی ہوگی۔ مگر اس خیال کی تائید دیگر تحقیقاتی یا علمی ذرائع سے نہیں ہوئی۔ لاہور سے آج تک کوئی چیز برآمد نہیں ہوئی جسے ہم عیسوی عہد سے پہلے کی تاریخ دے سکیں۔

لاہور (حال: دارالحکومت مغربی پاکستان) ہی اِس نام کا واحد شہر نہیں ہے، اس نام کے اور بھی شہر ہیں جن میں سے چند کا تذکرہ ذیل میں ہے:

۱- لہور- جہانگیرہ ریلوے اسٹیشن سے آٹھ میل شمال کی طرف اور ھندیا ویہند سے تین میل جنوب مغرب کی طرف تحصیل صوابی ضلع مردان میں واقع ہے۔ چینی سیاح ہیون سانگ نے ساتویں صدی عیسوی کے اوائل میں اسے آباد دیکھا تھا۔ وہ اِس کو سولوٹولو (سلاتورا) لکھتا ہے۔ سنسکرت کا شہرۂ آفاق قواعد دان پانینی چوتھی صدی قبل مسیح میں یہیں کا رہنے والا تھا۔ اِس شہر کا، جس کے کھنڈر اب بھی باقی ہیں، تاریخی پس منظر یہ ہے کہ ۸۷۰ء میں جب ترکی شاہی خاندان کو، جس کو کدارا شاہی یا

کدارا کوشان بھی کہتے ہیں اور جو اپنے آپ کو کشان خاندان سے منسوب کرتے تھے اور جن کو البیرونی تبتی خاندان کہتا ہے، غالباً اس وجہ سے کہ ان کے خط و خال تبتی یا چینی جیسے تھے۔) یعقوب بن لیث کے ہاتھوں شکست ہوئی تو اس نے کابل چھوڑ کر ہنڈیا ویہند (اودھیا بہانڈہ پورا) کو، جو دریائے سندھ کے بائیں کنارے پر ایک چھوٹے سے گاؤں کی شکل میں تھا اور اب بھی موجود ہے، اپنا دارالسلطنت بنایا۔ بقول البیرونی ان ترکی شاہیوں کا آخری بادشاہ لگا تورماں تھا۔ اس کے وزیر کلر نے اسے قید کر کے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ یہ واقعہ نویں صدی کے اواخر میں پیش آیا۔ یہ کلر ہندو شاہیوں کا بانی تھا اور اغلباً کھتی راجپوت تھا، گو البیرونی اسے برہمن لکھتا ہے۔ کلر کے بعد اس خاندان کے حکمرانوں میں سمند، کمالو (سمنتا)، بھیم (بہیما)، جیپال، انند پال اور تری لوچن پال کے نام تاریخ میں ملتے ہیں۔ ان میں سے کسی حکمران نے سلاتورا کو لہور کا نام دے دیا یا سلاتورا کے نزدیک لہور نامی ایک نئی بستی بنائی۔ اس خاندان کے مشہور راجہ جیپال نے، جس کی حکومت لمغان (افغانستان) سے سرہند اور کشمیر سے ملتان تک پھیلی ہوئی تھی۔ جب سبکتگین پر جوابی حملے کے طور پر غزنی پر تقریباً ۳۷۶ ہجری (۹۸۶ ش) میں حملہ کیا تو اسے ایک شرم ناک شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ یہ شکست غزوک پہاڑی کے مقام پر ہوئی جو غزنی اور لمغان کے درمیان ہے۔ جیپال نے دس لاکھ درہم کی ضمانت دی۔ پچاس ہاتھی اور کچھ سرحدی علاقے دے کر سبکتگین سے صلح کر لی اور بقولِ فرشتہ لاہور واپس ہو گیا۔ غزک کے صحیح مقام کا پتہ نہیں چلتا۔ تاہم لمغان کابل کے شمال میں ہے اور لمغان و غزنہ کا فاصلہ تقریباً ۱۲۵ میل ہے۔ ان کے درمیان غزک نام کا کوئی مقام نہیں ہے، البتہ ایک بستی چرخ نام کی ہے جو غزنہ کے شمال میں ہے۔ ایک بستی غزک نام کی قندھار کے قریب ہے، جس کا فاصلہ غزنی سے تقریباً دو سو میل ہے۔ ہمیں یہ نہیں معلوم کہ جیپال نے اس حملے کے وقت کون سا راستہ اختیار کیا تھا۔ مغلوں کے زمانے سے قبل جو راستہ اختیار کیا جاتا تھا وہ براہ ڈیرہ غازی خاں اور قندھار، کوہ سلیمان کے درّوں میں ہو کر اختیار کیا جاتا تھا۔ ایسی صورت میں اگر غزک کو یہ سمجھ لیا جائے کہ یہی مقام غزک ہے تو پھر وہ لمغان اور غزنی کے درمیان میں نہیں، بلکہ غزنی سے جنوب مغرب میں تقریباً دو سو میل کے فاصلے پر ہوگا۔ بالفرض اگر چرخ کو مقام سمجھ لیا جائے کہ جہاں لڑائی ہوئی تھی تو لاہور بہ کنارِ راوی اور چرخ کا فاصلہ چار سو میل پڑتا ہے۔ چرخ اور لہور نزدِ ہنڈ، جو ہندو شاہیوں کا دارالسلطنت تھا، تقریباً دو سو میل پڑتا ہے۔ اس کا

مطلب یہ ہوا کہ اگر جیپال لاہور بکنار راوی واپس ہوا تھا تو یہ چار سو میل کی مسافت تھی اور اگر وہ لہوُر نزد ہنڈ واپس ہوا تھا تو تقریباً ڈیڑھ سو میل تھی۔ اِس مسافت کے پیشِ نظر یہ قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے کہ جس لاہور کو جیپال واپس ہوا تھا وہ لاہور بہ کنارِ راوی نہ تھا، بلکہ وہ لہوُر نزد ہنڈ تھا۔ اس کے علاوہ آداب الحرب والشجاعۃ کے مصنّف شریف محمّد بن منصور الملقّب مبارک شاہ المعروف مدبر تحریر فرماتے ہیں کہ "راوی والے لاہور کو جج (ج ج) خاندان کے چندر دت سے انند پال نے، جو جیپال کا لڑکا تھا، ۳۸۹ ہجری (۹۹۹ ش) میں فتح کیا تھا۔ اِس قول کے پیشِ نظر بھی جیپال جس لاہور کو واپس ہوا تھا وہ ہنڈ والا لاہور تھا، کیوں کہ لاہور بکنار راوی اس وقت تک اس کے قبضے میں نہیں تھا۔

راجہ انند پال کو محمُود نے ۱۰۰۸ش میں شکست دی۔ اس کے بعد انند پال نے چوہا سیدن شاہ کے نزدیک جہلم کے کنارے نندانا کے قلعے کو اپنا مرکز بنایا۔ محمُود کے حملے جاری رہے۔ اس عرصے میں انند پال مر چکا تھا۔ اس کا لڑکا تری لوچن پال اس کا جانشین ہوا۔ نندانا ۱۰۰۴ش میں فتح ہو گیا۔ تری لوچن پال نے نندانا سے نکل جانے کے بعد شوالک کے پہاڑوں کو اپنا مرکز بنایا اور غالباً انھیں ایام میں اس خاندان نے اس شہر پر قبضہ کر لیا، جسے ہم اب لاہور کہتے ہیں۔

"آداب الحرب" کے مصنّف فخر مدبر اِس سلسلے میں واحد راوی ہیں کہ لاہور جج (ج ج) یا ججیج (ج۔ ہ۔ ج) بن بہدرا یا بہنڈارا نے آباد کیا تھا، جو بیاس سے لے کر چناب تک کے علاقے کا حکمران تھا۔ اس حکمران کی تاریخ کا پتہ نہیں چلتا مگر فخر مدبر لکھتے ہیں کہ جج (ج۔ ج) کے جانشین بنرت (ب ن ر ت) نے، جس کا دور پُر امن تھا، سورج دیوتا کا ایک بُت بنوایا تھا اور ایک مندر بنوایا تھا۔ وہ تحریر فرماتے ہیں کہ یہ مندر اس جگہ تھا جہاں خشتی مسجد ہے۔ خشتی کو انھوں نے حبشی پڑھا ہے یعنی حبشی مسجد۔

خشتی مسجد سے کوئی نشان دہی نہیں ہوتی، کیوں کہ اس زمانے میں عام طور سے اچھی عمارات اینٹوں سے ہی تعمیر ہوتی تھیں۔ فخر مدبر نے "آداب الحرب" التوتمش کے زمانے (۱۲۱۰-۱۲۳۶ش) میں تحریر کی تھی۔ اس وقت حبشی ملازموں کا رواج تھا۔ بنرت (ب۔ ن۔ ر۔ ث) نے ستّر سال حکومت کی۔ آخر عمر میں ان کے لڑکے تہنرت (بہرت) نے اسے کو ہلور یا لوہور کے قلعے میں قید کر دیا اور حکومت پر قابض ہو گیا۔ مگر آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں کہ اس تہنرت (بہرت) نے لوہور میں ایک قلعہ بنایا۔

یہ قلعہ اس جگہ تھا جہاں وقتِ تحریر عرب محلّہ تھا۔ یہاں فخرِ مدبر نے عرب محلّے کا ذکر کیا ہے۔ اس سے شبہ ہوتا ہے کہ غالباً مندر کی جو جگہ بتائی ہے اور اس میں جو لفظ استعمال کیا ہو وہ اس مناسبت سے حبشی ہو گا۔ میں نے یہ قلمی کتاب خود نہیں دیکھی، مگر جناب ڈاکٹر باقر صاحب سے اس کے متعلق استفسار کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اِس کتاب آداب الحرب کے مختلف نسخوں کا مطالعہ کیا ہے اور موصوف ہی نے غالباً سب سے قبل جج (ح۔ج) یا ججھ (ج۔ہ۔ج) خاندان پر روشنی ڈالی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے کہ یہ لفظ خشتی ہی ہے۔ تاہم حبشی ہو یا خشتی فخرِ مدبّر کی نشان دہی اس کے لیے ناکافی ہے کہ ہم مندر یا قلعہ کی جائے وقوع یقینی طور پر بتا سکیں۔ تاہم ان تفاصیل سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ فخرِ مدبر راوی پر واقع لاہور کے متعلق ہی لکھ رہا ہے۔

تھنترت کو انندپال پسر جیپال نے ۳۸۹ ہجری (۹۹۹ ش) میں شکست دے کر لوہور پر قبضہ کر لیا اور اس طرح جیپال ۹۹۹ ش کے بعد راوی پر واقع لاہور کا، جو اس وقت لوہور کہا جاتا تھا، حکمران بن گیا۔ اس بیان سے پہلی بار یہ معلوم ہوتا ہے کہ جج (ح۔ج) خاندان ہندو شاہیوں سے علیحدہ ایک جداگانہ ریاست پر نویں صدی عیسوی میں حاکم تھا اور لاہور بہ کنار راوی اس کا پائے تخت تھا۔ یہ تو ممکن ہے کہ یہ ریاست ہندو شاہیوں کی باج گزار ہو اور ۹۹۹ ش میں اس کو براہِ راست اپنی حکومت میں جیپال نے شامل کر لیا ہو، مگر فخرِ مدبر کے اس بیان کی جو اس نے جج (ح۔ج) خاندان کے بارے میں تحریر کیا ہے کوئی وجہ نظر انداز کرنے کی یا اس کو رد کرنے کی نہیں معلوم ہوتی اور ہمیں اس کو باور کرنا چاہیے۔

۲۔ لہار یا لہایار ایک قلعہ بند قصبہ گوالیار کے نزدیک۔
۳۔ لاہوڑی بندر دریائے سندھ کے ڈاس میں۔ اسے اب بدین کہتے ہیں اور یہ حیدرآباد کے نزدیک ہے۔[1]
۴۔ لوہارو۔ راجپوتانہ کی ایک ریاست تھی جو اب راجستھان میں ہے۔
۵۔ لاہر۔ یہ بلوچستان میں ہے جس کا عرض البلد ۲۹، طول البلد ۶۷ ہے۔
۶۔ ایک شہر موسوم لوہارہ۔ رائے پور ڈسٹرکٹ، صوبہ سی پی (بھارت) میں ہے۔
وغیرہ وغیرہ۔

تقریباً ایک ہی نام کے بہت سے شہر، جو برّصغیر کے مختلف گوشوں میں دور دراز فاصلوں پر واقع ہیں، کسی ایک شخص کے آباد کیے ہوئے نہیں ہو سکتے۔ حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ لوہ کی اولاد یعنی چندربنسی راجپوت جہاں جہاں گئے اور مختلف زمانوں میں جو شہر

---

[1] میرے خیالِ ناقص میں یہ "لوہری" ہے اور اب اسے روہڑی کہتے ہیں، جو سکھر کے قریب ہے۔ (حکیم محمد سعید)

آباد کیے اپنے جد کے نام پر ان کا نام لاہور یا لوہ آور رکھا اور منجملہ اور شہروں کے ہمارا لاہور بھی ان میں سے ایک ہے۔
اب دوسرے معنی یعنی 'لوہے کے قلعے' کی طرف لوٹیے۔ آریہ لوگ جو نسلاً تاتاری تھے اور وسطِ ایشیا کے علاقے جھیل بیکال سے آئے تھے، اِس برِّصغیر میں وارد ہونے کے بعد اپنے فضائی دیوتا اندر سے یہ دُعا مانگتے تھے کہ اے اندر ان داسوں کے مضبوط اور لوہے والے یعنی لوہے جیسے مضبوط قلعوں کو برباد کر دے۔ یہ دعائیں رگ وید میں موجود ہیں۔ داس کے معنی کالے کے ہیں اور چوں کہ اس علاقے کے قدیم باشندے کالے رنگ کے تھے، اس وجہ سے آرین لوگ انھیں کالے یعنی داس کہتے تھے۔ غالبًا یہ وہی لوگ تھے جنھیں وادیٔ سندھ کی تہذیب کے لوگ کہا جاتا ہے اور جنھوں نے ہڑپہ اور موہنجودڑو جیسے شہر آباد کیے تھے۔ اِس خیال سے کہ ممکن ہے کہ لاہور کی بنیاد وادیٔ سندھ کی تہذیب کے زمانے میں پڑی ہو۔ محکمۂ آثارِ قدیمہ نے مئی اور جون ۱۹۵۹ء میں لاہور کے قلعے میں کھدائی کی۔ کھدائی تقریبًا چالیس فیٹ گہرائی تک کی گئی جس میں کم از کم چار بڑے طبق اور چھے رہائشی تہیں برآمد ہوئی ہیں۔ یہ چھے طبقات اوپر سے نیچے کی طرف اس طرح پائے گئے: برطانوی۔ سکھ، مغل، قبل از مغل۔ تیسرے طبق کے عین نیچے سات فیٹ موٹے ملبے کی تہ ملی جس میں گری ہوئی کچی اینٹیں پڑی تھیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اِس موقع پر بہت بڑی تباہی ہوئی اور اغلبًا یہ وہ موقع ہے، جب محمود نے لاہور کے کچے قلعے کو فتح کیا۔ اِسی تیسرے طبقے میں دو مٹکوں کے درمیان فرش پر پڑا ہوا محمود کا ایک طلائی سکہ ملا (ف ۲) جو غزنی کا ضرب شدہ ہے اور ۴۱۶ ہجری مطابق ۱۰۲۵ء کا ہے اور عباسی خلیفہ القادر باللہ کے عہد کا ہے۔ یہ سکہ سبزہ زار کی سطح سے انتیس فیٹ گہرائی پر ستر ویں چھوٹی تہ میں مِلا اور یہ بھی یاد رہے کہ ہمیں چالیس فیٹ گہرائی تک تہذیبی اثرات ملے جس کے بعد خندق کی تنگی کی وجہ سے کھدائی جاری نہ رہ سکی۔
اسی قسم کی کھدائی دھیان سنگھ (ف ۳) کی حویلی میں بھی اسی زمانے میں کی گئی اور وہاں قلعے کی کھدائی کے مقابلے میں زیادہ کامیابی ہوئی۔ یہاں بیس فیٹ گہرائی کے نیچے مٹی کی دو مورتیاں ملیں (ف ۴)۔ ایک عورت کی اور ایک مرد کی۔ عورت کی ناک چونچ نما ہے اور مرد کلاہ نما سیدھین طرز کی ٹوپی پہنے ہوئے ہے۔ مٹی کا ایک منّتی تالاب کا نمونہ بھی ملا جسے ہندو رسوم میں نیا ما یکرُبراتا کہتے ہیں۔ نوشادی شدہ عورتیں جب ان کے شوہر باہر جاتے تھے تو ان کی سلامتی کے لیے موت کے دیوتا یاما پر چڑھاوے چڑھاتی

تھیں۔ اسی قسم کے منتی تالاب ٹیکسلا میں سرکپ کی کھدائی میں دوسری صدی عیسوی کے طبقات میں ملے ہیں۔ وادیٔ سندھ کی تہذیب کے البتہ کوئی آثار برآمد نہیں ہوئے، اس کے لیے مزید گہری کھدائی کی ضرورت ہے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ لاہور میں ایسی ثقافتی اشیا برآمد ہوئیں، جن کو مماثلت کی بنا پر دوسری صدی عیسوی کی تاریخ دی جا سکتی ہے، تاہم یہ امر مزید تحقیقات چاہتا ہے۔

مندرجہ بالا کھدائی سے یہ انکشاف ہوا کہ ۱۰۲۱ اش سے قبل لاہور کا قلعہ آباد تھا اور یہ کہ قلعے میں گزشتہ ایک ہزار سال میں آبادی کی سطح پچیس فیٹ اونچی ہو گی۔ اوپر میں کہہ چکا ہوں کہ کھدائی چالیس فیٹ گہرائی تک کی گئی تھی اور انسانی اثرات اس گہرائی تک ملتے رہے۔ اب اگر باقی پندرہ فیٹ گہرائی کا بھی خیال کیا جائے تو ہم عیسوی عہد کی ابتدائی صدیوں میں جا پہنچتے ہیں، جیسا کہ دھیان سنگھ کی حویلی میں نتائج برآمد ہوئے۔

اگر لاہور کی جائے وقوع پر غور کیا جائے تو یہ معلوم ہو گا کہ شہر اور قلعہ دو بڑے ٹیلوں پر آباد ہیں اور راوی قلعے کی شمالی دیوار کے پاس سے بہتا ہوا شہر کے مغرب سے گزرتا تھا۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے پرانے زمانے کی آبادکاری کا دستور تھا۔ ایک ٹیلے پر شہر اور دوسرے پر قلعہ۔ اور یہی وجہ تھی کہ کھدائی کے لیے دو مقام یعنی قلعہ اور شہر کا انتخاب کیا گیا۔

اب لاہور کے آغاز کے متعلق ہندو تصانیف کا جائزہ لیجیے۔ دیشوا بھاگا میں جو ۱۴۲۳ اش میں راجہ جے سنگھ سیوائے نے پرانوں سے مرتب کرائی تھی، ایک ایسی جنگ کا ذکر ہے، جو بھان مل راجہ لاہور اور بھیم سین کے درمیان دوارپار یعنی تانبے کے زمانے میں ہوئی تھی۔ تانبے کا زمانہ اس ملک میں تقریباً ایک ہزار سال قبل مسیح میں ختم ہوتا ہے۔ جیمز ٹاڈ نے

Annals & Antiquities of Rajast had Vol. I

"وقائع راجستھان"، کے صفحہ ۷۶ پر یہ تحریر کیا ہے کہ راجپوتوں کے دس مختلف نسب نامے اس امر پر ایک رائے ہیں کہ میواڑ کا چندربنسی راجپوت کنکسین کی اولاد میں سے ہے اور کنکسین اوّل لوہ کوٹ یعنی (لاہور) میں رہتا تھا اور اس کا بانی تھا اور یہ کہ ۲۰۱ سمت مطابق ۱۴۵ اش میں کنکسین ہندوستان کے شمالی حصے کو چھوڑ کر سیوا راشٹرا میں ترکِ وطن کر گیا۔ یہ وہی دوسری صدی عیسوی ہے، جس عہد کی ثقافتی اشیا دھیان سنگھ کی حویلی میں ملی ہیں اور جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ گویا کھدائی کے نتائج روایت کے مطابق ہیں۔ تاہم ان معلومات کو ابھی فیصلہ کن نہیں کہا جا سکتا

اور اس میں مزید کھدائی اور تحقیقات کی ضرورت ہے۔
اب لاہور کے تاریخی دَور کی طرف آئیے جو ۱۰۲۱ء سے شروع ہوتا ہے، جب محمود نے اس شہر کو فتح کیا۔ ابوریحان محمد بن احمد البیرونی اپنی کتاب "تاریخ الہند" میں جو ۱۰۳۳-۱۰۳۰ء کے دوران تصنیف کی گئی تھی۔ لاہور کے متعلق جس کو وہ 'لوہاور' لکھتا ہے، یوں رقمطراز ہے:

"گو شمال مغرب کے آگے چلتے ہوئے ادت تناہور نو فرسخ پر، ججانیر چھے فرسخ پر، مندھوکور جو لوہاور کا دارالسلطنت ہے اور دریائے ارادا (یعنی راوی) کے مشرق میں واقع آٹھ فرسخ پر (فرسخ تقریباً $3\frac{8}{11}$ میل کا ہوتا ہے)۔"

یہ لاہور کا پہلا یقینی حوالہ ہے جس میں لاہور کو ایک صوبہ یا علاقہ بتایا گیا ہے اور مندھوکور کو اس کا پائے تخت۔ حدیقۃ الاقالیم کے مصنف مرتضیٰ حسین نے یہ لکھا ہے کہ محمود کے حملے سے قبل لاہور برباد ہو چکا تھا اور دارالسلطنت سیالکوٹ یا ساولپور تبدیل کر دیا گیا تھا۔ مورخین کا خیال ہے کہ اسی وجہ سے محمود کے مورخین نے لاہور کو صوبہ یا علاقہ لکھا ہے اور اس علاقے کے دارالسلطنت کو مندھوکور، مندوکوٹ یا مندھ لکور۔
ابوالفضل بن حسین بیہقی اپنی کتاب تاریخ بیہقی میں جس کی تکمیل ۵۹-۱۰۵۸ء میں ہوئی۔ مسعود پسر محمود کا حال لکھتے ہوئے لاہور کا مع اس کے قلعہ من[illegible] ذکر کرتا ہے۔ البیرونی اس وقت کے لاہور کا عین شاہد ہے اور غالباً بیہقی بھی۔ اور جب یہ دونوں مندھوکور کا ذکر کرتے ہیں تو بعض حالیہ مورخوں بہ شمول ایڈورڈ تھامس کا یہ کہنا کہ مندھوکور یا مندلکور محمودپور کی بگڑی ہوئی شکل ہے، قابلِ تسلیم نہیں۔ مسٹر تھورٹن مصنف کتاب "لاہور" مصنفہ ۱۸۷۶ء مندھوکور کو مانکوٹ نزد سیالکوٹ سے شناخت کرتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ مانکوٹ ہی آخری مقامی حکومت کا دارالسلطنت تھا۔ مانکوٹ نام کی کوئی جگہ سیالکوٹ کے پاس نہیں اور اس لیے مسٹر تھورٹن کی یہ رائے صحیح نہیں معلوم ہوتی۔
خوش قسمتی سے البیرونی نے اس علاقے کے کچھ شہروں کے عرض البلد لیے ہیں اور اس میں ملتان، سیالکوٹ، جہلم اور مندھوکور شامل ہیں۔ موازنہ کے لیے ان شہروں کے البیرونی کے لیے ہوئے اور موجودہ سائنسی دَور کے عرض البلد درج ذیل ہیں۔ ان سے معلوم ہوگا کہ البیرونی کا عمل کس قدر صحیح تھا۔ اوپر والے اعداد البیرونی کے اور نیچے والے حالیہ ہیں:
ملتان $\frac{29-40}{30-12}$ ، سیالکوٹ $\frac{32-58}{32-31}$ ، جہلم $\frac{33-20}{32-35}$ ان اعداد کے مطالعے سے

ظاہر ہوگا کہ البیرونی کے عرض البلد اور موجودہ عرض البلد میں تقریباً نصف ڈگری کا فرق ہے۔ کبھی زیادہ کبھی کم۔

مندھوکور کا عرض البلد البیرونی ۵۰-۳۱ بتاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں موجودہ لاہور کا ۳۴-۳۱ یعنی ۱۶ منٹ کا فرق ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ مندھوکور لاہور کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوسکتا یا اس عرض البلد میں کوئی اور قریبی مقام بیہقی کے بیان سے ہمیں یہ بھی معلوم ہو کہ مندھوکور قلعہ تھا۔ اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ مندھوکور قلعہ تھا اور دارالحکومت تھا۔ جس کا عرض البلد تقریباً وہ تھا جو موجودہ لاہور کا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ مندھوکور لاہور کے قلعے ہی کا نام تھا۔

البیرونی نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس نے قلعہ لاہور یا لہوٗر کا عرض البلد بھی لیا تھا، جو وہ ۱۰-۳۴ بتاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ لوہور سے کشمیر کے دارالسلطنت کا فاصلہ ۵۶ میل ہے۔ آدھا راستہ کوہستانی اور دوسرا آدھا ہموار ہے۔ اوپر لکھا جا چکا ہے کہ لاہور کا عرض البلد ۳۴-۳۱ اور البیرونی کے عمل میں زیادہ سے زیادہ آدھی ڈگری کا فرق ملتا ہے، اس لیے قلعہ لاہور یا لہور ہمارے لاہور کا قلعہ نہیں ہوسکتا۔ یہ لاہور کشمیر کے دارالسلطنت سے ۵۶ میل ہے۔ یہ فاصلہ اگر ہوائی بھی ہو تب بھی ۸۰ میل ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جب البیرونی قلعہ لوہور یا لہور کا قلعہ کہتا ہے تو اس کا مطلب اس لہور سے ہوتا ہے جو ہنڈ یا ویہند کے قریب ہے اور جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ اس لہور سے جسے پٹھان آج لوار تلفظ کرتے ہیں۔ کشمیر کا آدھا راستہ کوہستانی اور آدھا مقابلتاً ہموار ہے۔ اس سلسلے میں میرا ایک مقالہ پاکستان ٹائمز کی اشاعتِ خاص اگست ۱۹۵۸ء میں چھپ چکا ہے اور اس سے قبل میری بڑی کتاب "A GUIDE TO THE MONUMENTS OF LAHORE" (رہنمائے آثارِ لاہور) میں قطعی طور پر اس امر پر خصوصیت سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

سید محمد لطیف نے اپنی کتاب تاریخ پنجاب (HISTORY OF THE PANJAB) صفحہ ۸۴-۸۵ بحوالہ ایڈورڈ تھامس مصنف "کرانیکلز آف دی پٹھان کنگز آف دھلے" صفحہ ۴۸، محمود کے ایک نقرئی سکے کا ذکر کیا ہے۔ اس سکے کو اگرچہ باوجود کوشش کے میں لاہور کے عجائب گھر میں نہ دیکھ سکا۔ کہا جاتا ہے کہ برطانیہ کے عجائب گھر میں ہے۔ اس پر جو کتبے کی عبارت بتائی گئی ہے اس سے سکے کے وجود کا قوی امکان معلوم ہوتا ہے۔ [۱]

---

[۱] اس سکہ کا ایک گلی ٹھپہ اب برٹش میوزیم سے حاصل کر لیا گیا ہے۔ ولی اللہ

عبارت یہ ہے

پشت پر - کوفی خط تحریر میں

القادر باللہ

لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ

یمین الدولہ و امین الملک محمود

بسم اللہ ضرب ھذا الدرھم بہ محمود پور سہنہ اثمان عشرۃ وار بعمائتہ {سنہ ثمان عشرۃ و اربعمائتہ}

(اللہ کے نام سے یہ درہم محمود پور میں ضرب کیا گیا - ۴۱۸ ہجری میں)

اوپر - ہندی میں

ابیک تامک محمد اوتار نری تپی محمود

(وہ اندیکھا ایک ہے محمد اوتار - محمود بادشاہ)

حاشیے پر ہندی میں (باقر - لاہور - صفحہ ۱۶) ؛ ایم ٹنکم محمود پور گھٹٹ تاچکیر اسموت ۴۱۸ (یہ ٹنکہ محمود پور میں ضرب ہوا - عربی سموت ۴۱۸ میں)

اس سکّے کے پیشِ نظر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مندھوکور فتح ہونے کے بعد اس کا نام محمود پور رکھ دیا گیا تھا - مندھیا والہ یا مندری والوہ جو لاہور لائل پور سڑک پر تقریباً بارہ میل پر ایک پُرانے پندرہ فیٹ اونچے ڈھیر پر واقع ہے - (ف ۵)

روایت یہ ہے کہ یہاں ایک پرانا قلعہ تھا - یہاں سے ۲" × ۱۰" × ۱۰" کی پختہ اینٹیں برآمد ہوتی ہیں - چھوٹی اینٹ کا ایک پختہ پرانا کنواں بھی ہے اور پختہ قبریں بھی - اگرچہ نام میں مماثلت ہے، مگر اس کا تمام رقبہ ۹ ایکڑ کے قریب ہے، اِس لیے یہ پائے تخت نہیں ہو سکتا - (لاہور کے قلعے کا رقبہ تقریباً ۳۲ ایکڑ ہے)۔

البیرونی سے قبل دُو عرب مورخین اور جغرافیہ دانوں نے بھی لاہور کا ذکر کیا ہے - ان میں سے سر فہرست احمد بن یحیٰی البلاذری جو بغداد کے باشندے تھے اور ۸۹۲ء میں انتقال فرمایا - اپنی کتاب فتوح البلدان میں ایک قصبہ الاھوار کا ذکر کرتے ہیں - اگر ال کے ا کو علیحدہ کر دیا جائے تو قصبے کا نام لاہوار رہ جاتا ہے - البلاذری کے بعد جغرافیہ کی ایک کتاب "حدود العالم" میں لاہور کا ذکر ہے - اس کتاب کے مصنف کے نام کا پتہ نہیں، تاہم کتاب ۸۲ - ۹۸۱ میں تصنیف کی گئی تھی - اسی کتاب میں لکھا ہے کہ لاہور ایک شہر ہے، جس کے بہت سے حصّے ہیں - یہ ملتان کے ماتحت ہے - یہاں چلغوزے، بادام اور اخروٹ کے بہت درخت ہیں - تمام باشندے بت پرست ہیں اور مسلمان کوئی نہیں -

بظاہر تو ایسا نہیں معلوم ہوتا ہو کہ اب سے ایک ہزار سال پہلے لاہور کی آب وہوا ایسی ہو کہ یہاں اخروٹ، چلغوزہ اور بادام کے بہت درخت اُگتے ہوں - معلوم ایسا ہوتا ہے کہ مصنّف اس لوہور یا لہور کا ذکر کر رہے ہیں، جو ہنڈ کے قریب ہے - مغربی پاکستان میں عربی کوفی خط میں صرف دُو کتبے ملے ہیں - جس میں سے ایک تو وادیٔ ٹوچی میں ملا ہے اور جس کی تاریخ ۲۴۳ ہجری

(۸۵۷ء) ہے اور اس میں ایک مکان کی تکمیل کا ذکر ہے جس کے مالک کوئی صاحب عمر ہیں۔ دُو زبانوں میں ہے۔ ایک ناگری ہے، دوسری عربی۔ دوسرا ہنڈ کے مقام پر ملا ہے۔ اِس میں ایک کوئیں کے بنانے کا ذکر ہے جو ایک صاحب ابو جعفر الجرجانی نے بنایا تھا۔ تاریخ ۸۲۴ ہجری (۱۰۸۹ء) ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ عربوں کا شمال مغرب کی طرف جو پھیلاؤ تھا وہ براستہ وادی ٹوچی بنوں سے ہنڈ کی طرف تھا اور غالباً یہ دو عرب مورخین جس لاہور کا ذکر کرتے ہیں یہ وہی لاہور ہے جو ہنڈ کے پاس تھا۔ حضرت شیخ احمد زنجانی نے اپنی کتاب تحفتہ الواصلین، جو ۴۳۵ ہجری (۱۰۴۳ء) میں لکھی گئی اسی لاہور کا ذکر کیا ہے۔ کنہیا لعل مصنف تاریخ لاہور (۱۸۸۴ء) نے اس کتاب کا حوالہ دیا ہے، اگرچہ یہ کتاب دیکھنے میں نہیں آئی۔ وہ لکھتے ہیں:

یہ شہر (یعنی لاہور) ابتدا میں راجہ پریکھیت نے آباد کیا تھا، جو پانڈوؤں کی اولاد میں سے تھا۔ اس زمانے میں قحط کی وجہ سے یہ غیر آباد ہو گیا اور صدیوں تک غیر آباد رہا۔ راجہ بکرماجیت نے اس کو پھر سے آباد کرنے کا حکم دیا، مگر ابھی تھوڑا ہی کام ہوا تھا کہ بکرماجیت مر گیا اور سمند پال جوگی اس کا جانشین ہوا۔ یہ قصبہ آباد ہو گیا اور اس کا نام سمند پال نگری ہوا۔ اس کے بعد جب راجہ دیپ چند دہلی کا بادشاہ ہوا تو اس نے اپنے بھتیجے لوہر چند کو پنجاب کا علاقہ دے دیا۔ اس نے لاہور کو پنجاب کا دارالسلطنت بنا لیا اور لوہرپور اس کا نام رکھ دیا۔ اس بیان سے بجز اس کے [illegible] ثابت نہیں ہوتا کہ لاہور ایک قدیم شہر ہے۔ حضرت شیخ زنجانی کا مقبرہ (رح) چاہ میراں میں واقع ہے اور اس کے نزدیک ہی شہزادہ پرویز جہانگیر کے لڑکے کا حالیہ مقبرہ ہے۔

آپ نے دیکھا کہ لاہور نامی قصبے کا ذکر ہندوؤں کے قدیم زمانے سے لے کر آج تک چلا آتا ہے۔ ہندوؤں کے زمانے لوہ کوٹ اور لوہ پور نام ملتا ہے، جس کا اوپر بیان ہو چکا ہے اور ۹ سے زیادہ مورخوں نے ۸۹۲ سے لے کر ۱۶۹۶ تک اس کو تقریباً ۱۴ مختلف تلفظوں میں لکھا ہے، جس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:-

نام مصنف و نام کتاب	تاریخ تصنیف	تاریخ وفات مصنف	تلفظ لفظ لاہور
۱۔ احمد بن یحییٰ بن جابر البلاذری بغدادی		۲۷۹ ہجری / ۸۹۲ عیسوی	الاھوار
۲۔ حدود العالم	۳۷۲ ہجری / ۹۸۲ عیسوی		لہور
۳۔ ابوریحان محمد بن احمد البیرونی "تاریخ الہند"		۱۰۳۰-۳۳ عیسوی	لوہاور لہور

نام مصنف و نام کتاب	تاریخ تصنیف	تاریخ وفات مصنف	تلفظ لفظ لاہور
۴- ابوسعد عبدالحی بن الضحاک بن محمد گردیزی "زین الاخبار"	۴۴۰ ہجری / ۱۰۴۸ عیسوی		لوھور، لاھوٗر
۵- سید علی ہجویری (داتا گنج بخشؒ) "کشف المحجوب"		۴۶۵ ہجری / ۱۰۷۳ عیسوی	لھانور
۶- ابوالفضل محمد بن حسین تاریخ بیہقی	۴۵۰-۵۱ ہجری / ۱۰۵۸-۵۹ عیسوی		لھور
۷- دیوان مسعود بن سعد سلمان غزنوی		۵۱۵ ہجری / ۱۱۲۱ عیسوی	لوھوٗر- لھاور، لھاوور، لاوھوٗر، لووھوٗر، لوھاور- لاھور
۸- امیر خسرو قران السعدین	۱۲۸۹ء		لاوھور- لاھنور
۹- جمال حسین انجو- فرہنگ جہانگیری		۱۰۱۷ ہجری / ۱۶۰۸ عیسوی	لاھور- لاوھور، لانھور- لوھاور، لوھور- لہاور، لہاوار
۱۰- سبحان رائے بھنڈاری خلاصۃ التواریخ	۱۹۵-۹۶ عیسوی		لاھور- لہور، لہاور-

نور بوزن کلا نور دکھنی زبان میں نگر کو کہتے ہیں اور یہ نُورا ور نگر کا متبادل ہے۔ لاہور کا یہ نام سید علی ہجویری (۱۰۷۲ء) امیر خسروؒ (۱۲۸۴ء) جمال الدین انجو (۱۶۰۸ء) نے لیا ہے اور اس طرح یہ ایک بہت قدیم نام ہے۔

اِن ناموں کے علاوہ لاہور کا ایک نام مبارک آباد بھی ہے۔ اس واقع کی تفصیل یوں ہے کہ ۱۳۹۸ء میں جب تیمور کی فوجوں نے لاہور کو برباد کر دیا تو ۱۴۲۱ء مطابق ۸۲۵ ہجری میں سلطان مبارک ثانی سید لاہور نے اس کی مرمت کے احکام صادر کیے۔ تاریخ مبارک شاہی میں اس کا احوال ہے اور اس میں لکھا ہے کہ لاہور میں سوائے اُلّوؤں کی آواز کے اور کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ تعمیر کے بعد اس شہر کا نام مبارک باد رکھ دیا۔

راہور کا نام بھی لاہور کے لیے ملتا ہے۔ یہ غالباً اِس وجہ سے تھا کہ یہ شاہراہِ اعظم پر ایک اہم مقام سمجھا جاتا تھا۔

مندرجہ بالا کوائف کے پیشِ نظر لاہور کے آغاز کے متعلق جو نتائج برآمد کیے جا سکتے ہیں، وہ

یہ ہیں :

(۱) یہ روایت کہ لاہور بہ کنارِ راوی کو راجہ رام چندر جی کے لڑکے لَو نے آباد کیا تھا، صحیح معلوم نہیں ہوتی، کیوں کہ اس کا کوئی عملی یا ثقافتی ثبوت نہیں ملتا۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ لو کے جانشینوں یعنی چندر بنسی راجپوتوں نے اس برصغیر کے مختلف مقامات پر اپنے جدِّ امجد لَو کے نام پر مختلف وقتوں میں شہر آباد کیے تھے اور ان شہروں میں سے ایک یہ لاہور بھی ہے جو دریائے راوی کے کنارے واقع ہے۔

(۲) چندر بنسی راجپوتوں نے اس لاہور کو کب آباد کیا تھا، فخر مدبّر مصنّف آداب الحرب کی اس واحد روایت کو کہ "جج (ج ج) خاندان کے حکمران اور بانی جج (ح ج) یا پچ (پ ہ چ) نے نویں صدی کے اواخر یا دسویں صدی کے اوائل میں آباد کیا تھا نہ باور کرنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ لاہور کے مقام پر اس سے قبل کوئی آبادی نہ تھی۔

(۳) لاہور میں محکمۂ آثارِ قدیمہ نے جو کھدائی کی اس کے نتیجے کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ تقریباً دوسری صدی میں اسی جگہ پر جہاں لاہور واقع ہے اور جس میں قلعہ بھی شامل ہے، آبادی تھی اور یہ چندر بنسی راجپوتوں کے خاندانی شجروں اور دلیشوا بھاگا مرتبہ ۱۸۴۳ عیسوی سے مطابقت رکھتا ہے۔ تاہم اس سلسلے میں مزید تحقیقات ضروری ہے۔

یہ تو تھا لاہور کی تاریخ کے متعلق۔

اب لاہور کے آثارِ قدیمہ کا بھی کچھ احوال سن لیجیے :

غزنوی دَور:

۱۰۲۱ء سے ۱۱۸۶ء تک یعنی ۱۶۵ سال غزنوی خاندان کی لاہور پر حکومت رہی اور ۱۶ بادشاہ اس عرصے میں گزرے۔ لاہور ابتدا میں تو غزنیوں کا صوبائی دارالسلطنت رہا، مگر مسعود سوئم نے (۱۰۹۹-۱۱۱۴ء) میں لاہور کو غزنوی حکومت کا مرکزی دارالحکومت بنا دیا۔ ظاہر ہے اس ڈیڑھ صَدی سے زائد عرصے میں بہت سی شاہی اور دیگر عمارات تعمیر ہوئی ہوں گی مگر افسوس یہ سب صفحۂ ہستی سے مٹ گئیں۔ اِس دَور کی یادگار صرف ایاز کی قبر ہے۔ (ف ۷) یہ شاہ عالم بازار کے آخری سرے پر ہے اور اب مرمت شدہ ہے۔ ایاز، امیر ایاز، ایاز خاص اور ایاز اتابک ایک ہی شخص کے مختلف دَور کے نام ہیں۔ اپنی زندگی کے آخری دَور میں یہ ابوالمجدود فرزند مسعود اوّل کا اتابک یعنی اتالیق تھا اور ۱۰۴۱ء میں اپنے آقا کی اچانک موت سے خاطر برداشتہ ہو کر انتقال کر گیا۔ پس غزنوی دَور کی ہمارے پاس یہ ہی امانت ہے۔ غوری سلاطین دہلی کا دَور ۱۱۸۶ء سے ۱۵۲۴ء تک یعنی ۳۳۸ سال رہا جس میں سوریوں کو چھوڑ کر ۳۷

حکمران ہوئے۔ کیا کچھ اس تمام دَور میں لاہور میں ہوا ہوگا اور کیسی کیسی عمارات تعمیر ہوئی ہونگی مگر غزنوی دَور کی طرح اِس دور کی عمارات کے بھی نشان باقی نہیں۔

دیگر قطبُ الدّین ایبک کی قبر اور لودھی زمانے کی ایک مسجد یعنی نیوی مسجد اس دَور کے دو نشان ہیں۔ قطبُ ایبک نے ۱۲۰۶ء میں انتقال فرمایا اور اس کی قبر (ف ۸) انار کلی بازار کی ایک گلی میں ایک ہندو کے مکان کے نیچے تھی۔ آزادی کے حصول کے فوراً بعد یہ اور اس کے پاس کا مکان محکمۂ آثارِ قدیمہ نے خرید لیا اور جو مکان عین قبر کے اوپر تھا۔ اسے گرا کر رقبہ صاف کر دیا، مگر ملحقہ مکان پر مقدمہ بازی شروع ہوگئی اور اب گزشتہ ماہ اس کا فیصلہ ہوا ہے۔ محکمہ اس کی قیمت ادا کر کے اس کو بھی گرانا چاہتا ہے تاکہ ایک موزوں یادگار اس مردِ مجاہد کے مدفن پر بنائی جا سکے۔ موجودہ قبر زمانہ حال کی ہے۔

عبدالقادر البدایونی اپنی کتاب منتخبُ التواریخ میں سولھویں صدی کے آخر میں لکھتے ہیں کہ قطبُ الدّین ایبک کی قبر مرجع خلائق ہے۔ لفظ قبر استعمال ہوا ہے، مقبرہ نہیں۔

نور احمد چشتی مرحوم نے اپنی کتاب تحقیقاتِ چشتی مطبوعہ ۱۸۶۷ء میں لکھا ہے کہ قطبُ الدّین ایبک کا مقبرہ شان دار تھا اور سنگِ مرمر کا بنا ہوا تھا، جو سکھوں کے عہد میں گرا دیا گیا۔ لیکن یہ بات مشکوک ہے، چونکہ شاہجہاں (۱۶۵۸-۲۸ ۱۶ء) سے قبل سنگِ مرمر کی عمارتوں کا عام رواج نہ ہوا مگر اس کے خلاف ایک یہ بھی روایت ہے (آثرِ لاہور۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی فرید آبادی۔ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور ۱۹۵۶ صفحہ ۴۶) کہ محمود نے غزنی میں ایک بڑی مسجد بنوائی تھی جس کا نام عروس الفلک رکھا تھا اور اس کے بنانے کے لیے ہندستان کی دُور دراز کانوں سے سنگِ مرمر کھدوا کر منگوایا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تعمیر میں سنگِ مرمر کا استعمال محمُود کے زمانے میں شروع ہو چکا تھا، مگر یہ ماننا پڑے گا کہ اس کا استعمال عام نہیں تھا۔

قبر کے ملحق اس غرض سے کھدائی کی گئی کہ اگر کبھی یہاں مقبرہ تھا تو ممکن ہے بنیادوں کے کچھ نشان باقی ہوں۔ کھدائی سے یہ معلوم ہوا کہ تقریباً ۵½ فیٹ سطح سے نیچے مٹی بالکل اچھیڑ ہے (ف ۱) اور کسی قسم کی کوئی چیز بجز انگریزی دور کے ایک پیسے کے وہاں کوئی چیز نہیں ملی۔ انگریزی دَور کا جو پیسہ وہاں سے ملا وہ ایک ریاستی پیسہ ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ چشتی نے مقبرہ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے صحیح نہیں ہے اور یہ کہ بدایونی نے جو قبر کا لفظ اِستعمال کیا ہے، وہ درست ہے یعنی ابتدا میں قبر تھی، کوئی مقبرہ نہیں تھا۔

نیوی مسجد (ف ۱۰ حالیہ)

نیوی یہ اِس لیے کہلاتی ہے کہ گلی کی موجودہ سطح سے یہ تقریباً ۱۲ فیٹ نیچی ہے۔ لاہوری اور

شاہ عالمی دروازوں کے درمیانی محلہ ڈوگراں میں واقع ہے۔ اس کے اسی قدر نیچے واقع ہونے کی وجہ خیال کی جاتی ہے کہ قدیم زمانے میں لاہور کی آبادی کی یہی سطح تھی، یہ غلط ہے۔ لاہور کی آبادی مختلف جگہوں پر مختلف سطحوں پر اب بھی موجود ہے۔ مسجد کے پانی کا اخراج دو کنوؤں میں ہوتا ہے، جس کو غرقی کہتے ہیں۔ اگر پرانی سطح وہی تھی جو اس وقت مسجد کے فرش کی ہے تو پھر غرقیوں کی ضرورت نہ تھی۔ عام سطح پر پانی نکالا جا سکتا تھا۔ غرقیوں کی موجودگی اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ یہ جگہ ابتدا ہی سے نیچی تھی۔ یہ مسجد لودھیوں کے زمانے میں ذوالفقار خاں نے بنائی تھی۔ یہ ایک چھوٹی سی مسجد ہے۔ لکھوری اینٹوں سے بنی ہوئی ہے۔ بھاری مگر نیچی ڈاٹوں پر تعمیر ہوئی ہے۔ اس کے تین گنبد ہیں جو چھت سے بلا گردنے کے اٹھے ہوئے ہیں۔ گنبد سے مشرق میں موجودہ منڈیر حالیہ ہے۔ فنِ تعمیر پٹھانی ہے۔ کتبہ کوئی نہیں ہے۔

پٹھانوں کے بعد مغلوں کا دور شروع ہوا۔ لاہور پہلی مرتبہ ۱۵۲۴ء میں بابر کے قبضے میں آیا مگر باقاعدہ حکومت ۱۵۲۶ء میں قائم ہوئی۔ بابر کی وفات ۱۵۳۰ء میں ہوئی اور تقسیم میں پنجاب اس کے بڑے لڑکے مرزا کامران کے حصے میں آیا۔ ۱۵۳۰ء سے ۱۵۴۰ء تک کامران ہی براہِ راست یہاں کا حاکم رہا اور لاہور اس کا دار السلطنت۔ اس دوران میں کامران نے اس عمارت اور باغ کو تعمیر کیا، جو کامران کی بارہ دری کے نام سے مشہور ہے (ف ۱۱) تعمیری لحاظ سے یہ بہت اہمیت رکھتی ہے۔ ابتدا میں یہ ۱۰۰۰ فیٹ مربع باغ کے وسط میں تھی جس میں نہریں، خیابان اور حوض تھے۔ خود بارہ دری ایک بڑے حوض کے درمیان تھی جس کا انکشاف ۱۹۵۹ء کے بڑے سیلاب میں ہوا جو اس بارہ دری کے ایک بڑے حصے کو بھی بہا لے گیا (ف ۱۲)۔

فنِ تعمیر کے لحاظ سے اس عمارت کی اہمیت یوں ہے کہ سب سے پہلی عمارت تھی جو حوض میں واقع تھی جس کے چاروں طرف ایک وسیع باغ تھا۔ اس عمارت کے خاکے پر بعد میں جہانگیر کا مقبرہ اور نور جہاں کا مقبرہ تعمیر ہوا۔ اس نمونے پر جہانگیر نے ہرن مینار کی بارہ دری بنوائی اور بعد میں نادرہ بیگم کا مقبرہ بھی حوض کے درمیان اسی کے تخیل پر بنا۔ بارہ دری کا نقشہ کچھ ایسا تھا کہ اس میں یکے بعد دیگرے دو برآمدے تھے اور بیچ میں ایک کمرہ۔ بالکل یہی نقشہ نور جہاں کے مقبرے کا ہے۔ جہانگیر کے مقبرے میں یہ تبدیلی ہے کہ اندرونی برآمدے کو کوٹھریوں میں بدل دیا ہے۔ اس عمارت میں بہت سے تاریخی واقعات بھی پیش آئے۔ اسی بارہ دری میں باغی شہزادہ خسرو اپنے باپ جہانگیر کے سامنے ۱۶۰۶ء میں ایک قیدی کی حیثیت سے پیش ہوا تھا۔ اس کا تفصیلی تذکرہ تزکِ جہانگیری میں موجود ہے۔ غرضیکہ یہ عمارت آنے والی بارہ دریوں اور آنے والے مغل باغوں کی پیش رو تھی۔ افسوس! ظالم راوی نے اس کو ہڑپ کر لیا اور جو حصہ باقی ہے

وہ بھی چند دنوں کا مہمان معلوم ہوتا ہے۔
۱۹۵۹ء کے سیلاب کے بعد فلڈ کمشنر نے لاہور کو بچانے کے لیے اس کے غرب میں ایک نہر کھدوادی۔ باوجود اس کے کہ محکمۂ آثارِ قدیمہ نے بہت کچھ اپنی رائے کا اس کے خلاف اظہار کیا۔ اب یہ چھوٹی سی نہر ایک دریا سا بن چکی ہے اور غریب بارہ دری کے ہر دو طرف دریا ہے۔
۱۵۴۰ء کے بعد کامران نے یہ حصّہ شیر شاہ سوری کے حوالے کر دیا۔ سوری دَور بہت مختصر تھا۔ اس دور کی کوئی شاہی عمارت لاہور میں نہیں ہے۔ البتہ اِس دَور کے اِختتام پر یا اس کے آخر میں لاہور میں ایک عمارت بنائی گئی جو تعمیری لحاظ سے بہت اہمیّت رکھتی ہے۔
یہ موسیٰ آہنگر کا مقبرہ ہے (ف ۱۳) جو میکلوڈ روڈ پر واقع ہے۔ مقبرے پر کوئی کتبہ نہیں ہے جس سے تعمیر کی تاریخ کا پتہ چل سکے مگر اکبر کے مورّخوں نے اس کا ذکر کیا ہے اور تعمیری لحاظ سے اس کا تعین ۱۵۴۰ء سے ۱۵۵۰ء کے درمیان کیا جاتا ہے۔ مقبرہ خاکے میں مربع ہے اور اس کا گنبد کاشی کاری کی اینٹوں کا ہے۔ اس لحاظ سے یہ لاہور کی سب سے پہلی عمارت ہے جس میں کاشی کی اینٹیں اِستعمال کی گئیں۔ گنبد پٹھانی طرز کا ہی یعنی شاندار بیٹھا ہوا۔ مقبرے کے اندر منبت کاری کی ہوئی ہے (ف ۱۴) جس کی بنیاد اقلیدسی شکلوں پر ہے قرآنی آیات کندہ ہیں۔ خط کوفی اور نسخ کے درمیانی طرز ہے۔ نقاشی بھی ہے، مگر اس کا بیشتر حصّہ بعد کا ہے (ف) مقبرہ گھڑی ہوئی اینٹوں سے بنا ہوا ہے اور اس لحاظ سے بھی یہ لاہور کی پہلی عمارت ہے۔
اس عہد کی ایک اور عمارت ہے جس کا حال سیّد محمد لطیف نے اپنی "تاریخ پنجاب میں" حجرہ میر مہدی" کے نام سے کیا ہے (ف ۱۶)۔ یہ ایک چھوٹی سی محراب ہے جس کا کل رقبہ ۵۸×۶۴ فیٹ ہے اور کوٹ خواجہ سعید چاہ میراں میں واقع ہے (ف ۱۷) اس کی خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں:
(۱) خوبصورت منبت کاری جس کی بنیاد ہشت پہلو اقلیدسی شکلوں پر ہے یا ستارہ نما برجستہ پھولوں پر (ف ۱۸)
(۲) کتبوں کا طرزِ تحریر جو نسخ اور نستعلیق خطوط کے مابین ہے۔
(۳) لوٹی فارم یعنی کنول نما پھول جس کے مرکز میں کلمہ لکھا ہوا ہے۔
مدوّر پھول منبت کاری برجستہ ہیں (ف ۱۹) کچی ڈاٹیں (SQUINCHES)
اِس محراب کو بعض لوگوں نے عید گاہ بھی لکھا ہے۔ بہر حال تحقیقات کے بعد یہ معلوم ہوا کہ عید گاہ نہیں ہے بلکہ جنازہ گاہ ہے۔ اس پر میرا ایک مضمون ۳ اور ۱۰ فروری ۱۹۵۷ء کے

پاکستان ٹائمز میں شائع ہو چکا ہے۔
میرے خیال میں یہ عمارت حضرت موسیٰ آہنگر کے مقبرے سے قریبی زمانے میں بنی ہے، بلکہ اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد جہاں موسیٰ آہنگر کے مقبرے میں کتبوں کا طرز کوفی اور نسخ کے مابین ہے۔ وہاں اس محراب کا طرزِ تحریر نسخ اور نستعلیق کے درمیان ہے۔ اِس لیے میرے خیال میں یہ عمارت حضرت موسیٰ آہنگر کے مقبرے کے بعد کی تعمیر ہے۔
آپ نے دیکھا کہ ۱۰۲۱ء سے لے کر ۱۵۰۵ء تک تقریباً ۴۲۹ سال کے زمانے کے لاہور میں کُل چھے آثار ابھی تک باقی ہیں، جو نہ ہونے کے برابر ہیں یعنی ایاز اور ایبک کی قبریں نیوی مسجد، کامران کی بارہ دری، آہنگر کا مقبرہ اور جنازہ گاہ کوٹ خواجہ سعید۔ اُس دور کی عمارتیں کس طرح صفحۂ ہستی سے مٹ گئیں۔ یہ ایک دوسرا موضوع ہے اور اِسی طرح لاہور میں مغلوں کا فنِ تعمیر بھی۔ یہ دونوں موضوع ایک اور مضمون کے طالب ہیں۔

شامِ ہمدرد۔ لاہور
۳ر دسمبر ۱۹۶۴ شمسی

کتابت : مرزا محمد اشفاق احمد چغتائی خوش نویس